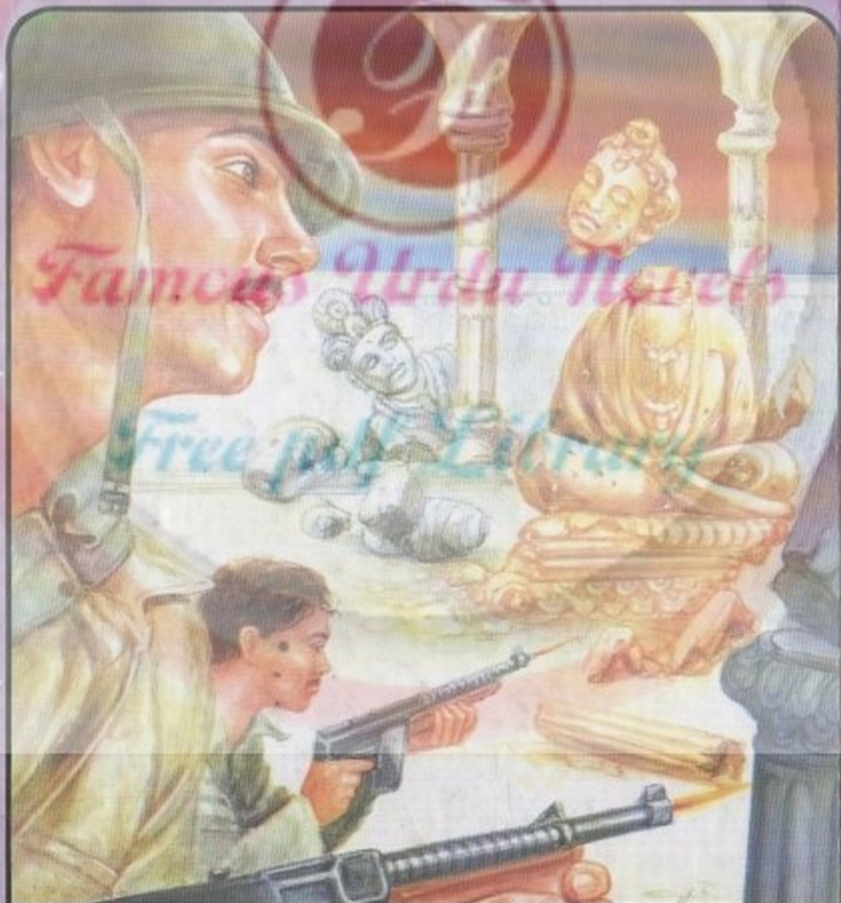
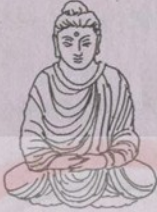


سومنا کے بُت شکن



۷۸
اے حمید





ایڈیٹر فوجی نے مجھے خاردار تاروں کے پاس گھاس میں رینگتا دیکھ لیا تھا۔
خدا جانے اس نے مجھے رات کے اندھیرے میں کیسے دیکھ لیا تھا۔ جب میں نے
اپنے پیچھے فوجی بوٹوں کی دھمک سن کر پلٹ کر دیکھا تو میرا جسم خوف سے سرودہ گیا۔
بھارتی فوجی کا بھاری بوٹ والا پاؤں مجھے کچلنے کے لیے مجھ پر پڑنے ہی والا تھا۔ میں
ترپ کر ایک طرف ہو گیا۔ بھارتی فوجی جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور جبکہ کر مجھے گھاس
میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس دوران میں اس کے پیچھے آچکا تھا۔ اس کے عقب میں
آتے ہی میں اچھل کر اس پر چڑھ گیا اور اس کی گردن پر ڈس دیا۔ کوئی ذی روح
میرے زہر کا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے سے زیادہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایڈیٹر فوجی
وہیں ایک طرف کو گر گیا۔ اس کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی تھی۔ یہ آواز مجھ سے
چند قدم پیچھے پوزیشن میں بیٹھے کمانڈر خالد اور کمانڈر ہارون نے بھی ضرور سنی ہوگی مگر
وہ اپنی پوزیشنوں پر بیٹھے رہے۔ ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔
یہ بات میرے علم میں تھی کہ میں کمپ میں دو بھارتی سنتری رات کی پھول ڈیوٹی پر
تھے۔ میں نے اور کمانڈر خالد نے ان دونوں کو اندھیرے میں خاردار تاروں کے پاس
درختوں کی طرف جلتے دیکھ لیا تھا۔ میں آگے دیکھ بھال اور ریکی کے لیے جانے کی



Famous Urdu Novels

Free pdf Library

پر موجود تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور آپ کو علم ہی ہوگا ہمارا مشن کشمیری حریت پرست لیڈر وائس کو اس بھارتی فوجی کیمپ سے نکل کر اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ یہ بھارتی فوجی کیمپ اپنے ہولناک مظالم کی وجہ سے بڑا بدنام ٹارچر سیل تھا جس مقبوضہ جموں کشمیر سے کشمیری حریت پرست مجاہدوں، کانگڑو اور لیڈروں کو گرفتار کر کے انٹرویویشن کے لیے لایا جاتا تھا اور ایسی ایسی وحشتوں اور غیر انسانی لڑتیں دی جاتی تھیں کہ کوئی بھی کشمیری مجاہد یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ یہ ہولناک ٹارچر سیل ضلع بوشنگ آباد کے ایک تنہا جنگل میں انڈین آرمی نے بنایا ہوا تھا جس پونا ہارس کی دو کنبیاں تعینات تھیں۔ اس کیمپ کے ٹارچر سیل میں ایسے کشمیری حریت پرستوں کو لایا جاتا تھا جن کے بارے میں مقبوضہ کشمیر کی انڈین آرمی کو یقین ہوتا تھا کہ ان سے بے حد مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ کشمیری حریت پرست لیڈر غلام حسین وائس کو بھی اسی لیے یہاں لایا گیا تھا۔ کشمیری لیڈر کا یہاں سے زندہ واپس جانا ناممکن تھا۔ ہمارا کانگڑو مشن اسے یہاں سے نکالنا اور ہو سکے تو اس بھارتی ٹارچر سیل کو تباہ کرنا تھا۔ پیچھے درختوں میں ہمارے تین کانگڑو ایک طرف اور دو کانگڑو دوسری طرف لائیٹ مشین گنوں کے ساتھ پوزیشنوں میں تھے۔ ان کے درمیان کانگڑو خالد اور کانگڑو ہارون مشین گنوں کے ساتھ الٹ تھے۔ میں یہ معلوم کرنے آگے جا رہا تھا کہ کشمیری لیڈر کو جس ٹارچر سیل میں رکھا گیا ہے وہ کمال ہے۔ اس کی پوزیشن کیا ہے اور وہاں کس طرف سے کانگڑو اٹیک کیا جاسکتا ہے۔ میں اس لیے بھیجا گیا تھا کہ میں سناپ کے روپ میں تھا۔ اگر انسانی شکل میں ہوتا تو شاید میری جگہ کانگڑو خالد خود رکھی پر آج مجھے دیکھ بھل کی ڈیوٹی پر بھیجے ہوئے یہ خطرہ بھی مول لیا گیا تھا کہ میں کسی بھی وقت سناپ سے انسانی شکل میں واپس آسکتا تھا جیسا کہ آپ کچھ کتاب میں پڑھ چکے ہیں۔ جب سے مجھے دشمن میں دفن کیے جانے کے بعد ایک عجیب و غریب سناپ نے کانا تھا۔ میری سناپ کے روپ میں رہنے کی مدت میں حیرت انگیز اضافہ ہو چکا تھا۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ دوسرے تیسرے

بجائے وہیں گھاس میں بیٹھا رہا۔ مجھے دوسرے بھارتی سنتری کا انتظار تھا۔ اسے اسی طرف سے ضرور آنا تھا۔ یہ دونوں رات کی پھول ڈیوٹی پر تھے۔
اسے میں پیچھے درختوں کی طرف سے جمل اندھیرا تھا کسی کی آواز آئی۔
”کام اہل کمال ہے بے تو۔“

درختوں کے اندھیرے میں سے دوسرا بھارتی سنتری نکل کر اس طرف آیا جمل اس کے ساتھی کی لاش پڑی تھی۔ میں اسے اتنا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر کیمپ گیٹ کے گاڑ باز کو آواز دے سکے۔ اس کا مطلب ہمارے مشن کی جتنی ہی نہیں تھا بلکہ ہم میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکتا تھا۔ دوسرا سنتری ذرا آگے آیا تو میں اس کے وائس جانب ہو گیا۔ وہ ابھی لاش تک نہیں پہنچا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ ایک دم جھک گیا ہے۔ شاید اسے اپنے ساتھی کی لاش اندھیرے میں نظر آگئی تھی۔ مجھنے سے وہ میرے لیے بڑا آسان ٹارگٹ بن گیا تھا اور اس کی گردن مجھے صاف نظر آنے لگی تھی۔ میں تیزی سے اچھل کر اس کی گردن میں چبڑا اور فوراً گردن میں ڈس کر زہر اس کی شہ رگ میں داخل کر دیا۔

اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلتا جا رہا ہے۔ وہ بغیر آواز نکالے وہیں گر پڑا۔ میں تیزی سے ریٹکٹ ہوا پیچھے کانگڑو خالد کی پوزیشن پر گریڈ کانگڑو خالد اور کانگڑو ہارون بیٹ کے بل لینے شین گنیں سیدھی کیے ہوئے تھے۔ میں نے وہی انسانی آواز میں کانگڑو خالد کو سارا مایہزبان کیا۔ وہ بولا۔
”آگے جاؤ کرم داد آگے جاؤ“ معلوم کرو کشمیری لیڈر کا ٹارچر سیل کمال ہے۔
”کو۔“

میں وہیں سے واپس ہو گیا۔ میں جتنی تیز ریٹکٹ سکتا تھا، ریٹکٹ ہوا دونوں بھارتی فوجیوں کی لاشوں کے درمیان سے گزرتا ہوا کیمپ کی خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ آگے مجھے خاردار تاروں والی دیوار کی اندر کی جانب فوجی بیرکیں دکھائی دیں۔ یہ دو چھوٹی بیرکیں تھیں۔ ان کے باہر بلب روشن تھے اور ایک ایک فوجی گاڑ پرے

روز مجھے جھکا سا لگتا تھا اور میں سانپ کی شکل میں ہوتا تھا تو اپنی انسانی شکل میں اور اگر انسان کے روپ میں ہوتا تو سانپ کے روپ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا جس میں میں جلا تھا۔ میری بیوی جیلہ بھی خت پریشان تھی جو بھوپال میں مکائنڈو خالد کی کزن کے گھر میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی اور میرے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھ پر یہ عذاب ایک سپیرے کے ظلم کی وجہ سے نازل ہوا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ مجھے اس عذاب سے کب اور کیسے نجات ملے گی۔ اس مشن کے بعد میرا پروگرام نکلتے جا کر ان مکتی باپنی والوں کو ٹھکانے لگانا تھا جنہوں نے سانحہ مشرق پاکستان کے وقت سینکڑوں غیر بنگالی مسلمانوں کو ازیتیں دے دے کر قتل کیا تھا اور ان کی عورتوں کو اغوا کر کے مغربی بنگال لے جا کر فروخت کر دیا تھا۔ ان میں میری بیوی جیلہ بھی شامل تھی۔ جیلہ کو تو میں نے برآمد کر لیا تھا لیکن دوسری بد نصیب غیر بنگالی عورتوں کو کافروں کی قید سے رہائی دلانا ابھی باقی تھا۔ ان کو برآمد کر کے انہیں اپنے ساتھ پاکستان لے جانا میرے مشن کا آخری لیکشن تھا۔ لیکن ابھی ہمارے سامنے صرف ایک ہی مشن تھا کہ کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں کو انڈین آرمی کے ٹارچر سیل سے رہائی دلا کر وائیں کشمیر بھیج دیا جائے۔ اسی مشن پر ہم لوگ اپنی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہوشک آہلو کے جنگل کے آرمی ٹارچر سیل میں آئے تھے۔

خاردار تاروں والی پانچ چھ فٹ اونچی دیوار کی دوسری جانب آنے سامنے والی دونوں بیرکوں کے باہر دو بھارتی فوجی گاڑی ڈیوٹی پر کڑے تھے۔ بیرکوں کے باہر بلب روشن تھے۔ ایک جانب کونے میں دو فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ ان دونوں بیرکوں میں ٹارچر سیل کھلے ہیں۔ رات گزر جا رہی تھی۔ ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے اپنا مشن مکمل کر کے کشمیری لیڈر کو ساتھ لے کر سیل سے بھوپال کی طرف نکل جانا تھا۔ جو فوجی سنٹری پٹرول ڈیوٹی پر ہوتے ہیں انہیں کوئی بھی مکائنڈو پارٹی کبھی ہلاک نہیں کرتی کیونکہ انہیں ایک مقررہ وقت کے بعد اپنی پوسٹ پر واپس رپورٹ کرنی ہوتی ہے اور ان کی جگہ دوسری پٹرول پارٹی کو ڈیوٹی سنبھالنی ہوتی ہے۔ میں نے

دونوں حسشی سنٹریوں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ میں نے انتہائی مجبوری کی حالت میں ایسا کیا تھا۔ اس انڈین پٹرول پارٹی کو زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے بعد اپنی پوسٹ پر جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ ہمارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہی تھا۔ اس عرصے میں ہمیں ٹارچر سیل کا بھی کوچ لگانا تھا اور وہاں سے کشمیری لیڈر کو بھی نکالنا تھا۔ اس حقیقت کا احساس میرے علاوہ مکائنڈو خالد اور مکائنڈو ہارون کو بھی تھا۔

میں وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے دل میں خدا کو یاد کیا اور رینگتا ہوا خاردار تاروں میں سے دوسری طرف نکل گیا اور جو فوجی بیرک میرے سامنے تھی اس کی عقبی دیوار کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اندھیرے میں دیوار کو اوپر تک دیکھا۔ سانپ کے روپ میں ہونے کی وجہ سے میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ دیوار میں کسی جگہ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دیوار کے اوپر جا کر بیرک کی چھت کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو روشندان بنے ہوئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس بیرک میں دو کمرے ہیں۔ میں دیوار پر رینگتا ہوا ایک روشندان کے پاس آگیا۔ روشندان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اندر کوئی بلب وغیرہ روشن نہیں تھا۔ روشندان پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور یہ روشندان اتنا چھوٹا تھا کہ کسی آدمی کے اس میں سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے گردن سلاخوں میں ڈال کر اندر دیکھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا کہ چھوٹی سی بیرک تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چار پانچ چار پائیاں بھی تھیں جن پر فوجی ٹھہر دایاں لگائے سو رہے تھے۔ وہاں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں دیوار پر رینگتا ہوا دوسرے روشن دان کے پاس آگیا۔ یہاں بھی روشندان میں موٹی سلاخیں لگی تھیں اور اندھیرا تھا۔ میں نے گردن سلاخوں میں سے نکال کر دیکھا۔ یہاں بھی چار پائیاں پر انڈین فوجی سو رہے تھے۔ میں دیوار سے نیچے اتر آیا۔ اب مجھے سامنے والی بیرکوں کی طرف جانا تھا۔

میں اندھیرے میں سے رینگتا ہوا دوسری بیرکوں کی عقبی دیوار کے پاس آگیا۔ اس دیوار کے اوپر بھی دو روشندان تھے۔ پہلے روشندان کے پاس جا کر دوسری طرف

کی طرف بڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں جلدی سے دیوار کی طرف دوڑا۔ دروازہ کھل گیا۔ ہیرک کے دروازے کے اوپر جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی اندر آنے لگی۔ چھ سات فٹی اندر داخل ہو گئے۔ میں تیزی سے رینگتا ہوا دیوار پر چڑھ کر روشندان کی سلاخوں میں آکر چھپ گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ ایک فٹی نے بجلی کا بیٹن دیا، کمرہ روشن ہو گیا۔ ایک فٹی آگے آگے تھا۔ وہ کپٹن یا بجر ہو گا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس نے فائل کھول کر کچھ پڑھا اور فرش پر اونڈھے پڑے کشمیری لیڈر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”کیا یہ ہوش میں ہے؟“

دو فٹی جلدی سے آگے بڑھے۔ انہوں نے کشمیری لیڈر کو بازوؤں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ کشمیری لیڈر کا سر ڈول رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر بھی خون جما ہوا تھا۔ لگتا ہے کہ اسے وہیشیانہ لڑتے کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ فٹی افسر نے پوچھا۔

”تمہارا نام غلام حسین وائیں ہے؟“

کشمیری لیڈر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ یہ اوجھڑ عمر لیڈر تھا۔ روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس کے سر اور داڑھی کے بال اکثر سفید ہو رہے تھے۔ جسم پر سوائے ایک بوسیدہ سی قمیض، شلوار کے اور کچھ نہیں تھا۔ بھارتی فٹی افسر نے دوسری بار کثرت آواز میں اپنا سوال دہرایا تو ایک فٹی نے کشمیری لیڈر کا سر سختی سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”بجر صاحب تم سے پوچھ رہے ہیں، جواب دو۔“

کشمیری لیڈر نے آہستہ سے کہا۔

”میں ہی غلام حسین ہوں۔“

بھارتی فٹی افسر نے فائل بند کرتے ہوئے اپنے ساتھی فٹی سے کہا۔

”اس کو نیچے لے چلو۔“

دونوں فٹی کشمیری لیڈر کو تھپتھپاتے ہوئے ہیرک سے باہر لے گئے۔ فٹی افسر پہلے

جھانک کر دیکھا یہاں بھی فٹی سو رہے تھے۔ دوسرے روشندان کی طرف چلا آیا۔ دوسرے روشن دان کی سلاخوں میں سے گردن نکال کر دیکھا تو مجھے اندھیرے میں ایک آدمی زمین پر اونڈھا پڑا نظر آیا۔ وہ اس حالت میں پڑا تھا جیسے اسے زد و کوب کرنے کے بعد وہاں پھنک دیا گیا ہو۔ مجھے شک ہوا کہ ہو سکتا ہے یہی ہمارا کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں ہو۔ میں دیوار پر رینگ کر ہیرک کے اندر چلا گیا۔ ہیرک میں کوئی فٹی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ فرش پر رینگتے ہوئے اونڈھے پڑے آدمی کے پاس آ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کالی شری داڑھی تھی۔ ایک آنکھ کے پاس خون جما ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کشمیری لیڈر کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ یہی ہمارا بھلے کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں ہے لیکن اس کے باوجود میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اگر وہ سو رہا ہے تو اسے جگاؤں اور انسانی آواز میں اس سے پوچھوں کہ اس کا نام کیا ہے۔ لیکن یہ خدشہ بھی تھا کہ کشمیری لیڈر پر ایک سانپ کو انسانی آواز میں بولنے دیکھ کر اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ ہر حال مجھے ہر حالت میں یہ تصدیق ضرور کرنی تھی میں نے آہستہ سے آواز دے کر کہا۔

”وائیں صاحب! وائیں صاحب!“

وہ آدمی اسی طرح پڑا رہا۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ شاید یہ شخص بے ہوش ہے لیکن جب میں نے اس کے گلے کے پاس جا کر اسے آواز دی تو اس نے نحیف آواز میں کہا۔

”پلے جاؤ۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ جتنا چاہو کرنا ہے کرو۔“

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”آپ کا نام غلام حسین وائیں ہے؟“

تب اس شخص نے سر اٹھایا اور اندھیرے میں دائیں بائیں دیکھا۔

”تم کون ہو؟“

اتنے میں باہر کسی فٹی ٹرک کے کھڑے ہونے اور پھر فٹی بوٹوں کے دروازے

بھارتی میجر نے کہا۔

”غلام حسین! اگر اب بھی تم اپنے ساتھیوں کے ٹھکانے بنا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“

کشمیری لیڈر نے کہا۔

”کبھی نہیں بتاؤں گا۔“

میجر نے غصیلی آواز میں کہا۔

”ایک بار پھر تمہیں موقع دیا جاتا ہے، سوچ لو۔“

کشمیری لیڈر نے کہا۔

”سوچنا تم درندوں کو چاہیے جنہوں نے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ یاد

رکھو تمہارا یوم حسب آں پہنچا ہے۔“

انڈین میجر سنول سے انصاف اور اس نے اٹنے لگے ہوئے کشمیری لیڈر پر مزید تشدد

شروع کر دیا۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے کشمیری لیڈر اپنے ایمان پر قائم تھا لیکن درو کی

شدت سے وہ اہستہ اہستہ کراہنے لگا۔ اس وقت میرا بی چلا کہ آگے بڑھ کر اس

بھارتی فوجی درندے کو موت کے گھاٹ اتار دوں لیکن وہاں پانچ اور بھی فوجی تھے۔

میرے زندہ بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ میرے اس ایکشن سے کشمیری لیڈر کا

فرار بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ آدھا گھنٹہ گزرے ہی والا ہے

اور پٹول ڈیوٹی کے سنتری واپس اپنی پوسٹ پر نہ پہنچے تو دوسری پارٹی ضرور ان کی

تلاش میں نکلے گی اور پھر ممکن ہے کہ اس سارے علاقے کو فوجی حراست میں لے

لیں۔ انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہاں کشمیری کانٹو بچنے چکے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے

یہاں سے جلدی واپس اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر انہیں ساری صورت حال سے باخبر

کرنا تھا۔ کشمیری لیڈر کو اس قدر تارچہ کیا گیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ انڈین میجر نے حکم

دیا۔

”اسے چھت سے اتار کر کوئے میں ڈال دو۔ صبح دوبارہ انیشو کیش ہوگی۔“

یہ باہر نکل چکا تھا۔ بیرک کی جی جلیقی رہنے دی گئی۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں تیز تیز
ریٹکتا ہوا بیرک کی چھت پر آ گیا۔ چھت کی دوسری طرف جا کر مندر پر سے نیچے
جھانک کر دیکھا۔ دو فوجیوں نے کشمیری لیڈر کو باہر زمین پر رکھے ایک مشین گن پر ڈالا۔
مشین گن اٹھایا اور دوسری بیرک کی طرف چل پڑے۔ باقی فوجی بھی اپنے آفسر کے ساتھ
اسی طرف چل پڑے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ لوگ کشمیری لیڈر کو کہاں لے جا
رہے ہیں۔ میں کوئے کی طرف چھت سے نیچے اتر آیا اور ہٹ کر اندر سے
میں اس طرف چلنے لگا۔ دوسری فوجی کشمیری لیڈر کو لے کر گئے تھے۔ وہ اسے سامنے والی
بیرک میں لے گئے۔ میں ان کے پیچھے بیرک میں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہاں روشنی
تھی اور میں نظر آ سکتا تھا۔ میں نے بڑی جیڑی سے کام لیا اور دیوار پر سے ہو کر بیرک
کے روشندان میں آ گیا۔ اندر سردال کر دیکھا اس دوران فوجی بیرک میں آ چکے تھے۔
مشین گن زمین پر ڈال کر دو فوجیوں نے کشمیری لیڈر کو پکڑ کر اٹھایا۔ اس بیرک کے اندر
ایک اور چھوٹا دروازہ تھا۔ وہ اسے چلائے ہوئے اس دروازے میں سے دوسری طرف
لے گئے۔ دوسری طرف کوئی تہ خانہ ہوگا۔ کیونکہ وہ میڑھیاں اتر کر گئے تھے۔ بھارتی
میجر بھی دوسرے فوجیوں کے ساتھ تہ خانے میں اتر گیا۔ تہ خانے کا دروازہ بند ہو گیا
جیسے ہی دروازہ بند ہوا میں روشندان کے اندر چلا گیا اور دیوار پر سے نیچے اتر کر تہ
خانے کے دروازے کے پاس آیا۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ فوجی گارڈ بیرک
کے باہر تھی۔

اندر کوئی گارڈ نہیں تھی۔ میں دروازے کے درمیان سے نکل کر میڑھیاں اترنے

لگا۔ میڑھیوں میں تہ خانے کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ پانچ چھ میڑھیاں تھیں۔

میں آخری میڑھی میں ایک طرف چھپ کر دیکھنے لگا۔ تہ خانہ ایک حوالت کی طرح

تھا۔ دیوار پر بلب روشن تھا۔ کشمیری لیڈر کو اسی کی قبض اتار کر چھت کے ساتھ اٹا

ٹکیا جا رہا تھا۔ بھارتی میجر سنول پر بیٹھا تھا۔ کشمیری لیڈر کو اٹا ٹکا کر ایک انڈین سنتری

اس کی گردن میں کپڑا ڈال کر مروڑنے لگا۔

تھا ہم لوگ یہاں آکر بیٹھ گئے۔ سارے اسٹے اور ہتھیاروں کی پھر سے پرتل کی گئی۔
کناٹو خالد نے اپنے ایک مجاہد سے کہا
”تم رات کو گاڑ ڈیوٹی پر رہو گے۔“

وہ مجاہد اسی وقت باہر نکل گیا۔ دوسرے کناٹو ساتھی غار کے دہانے کے پاس جا کر
لیٹ گئے۔ میں خالد کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ کناٹو ہارون بھی وہاں موجود تھا۔
کناٹو خالد نے ہارون سے کہا۔

”ہمیں کل کا پورا دن یہاں گزارنا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں صبح اپنا آدمی بھیج
کر بھول سے کچھ اور اسلحہ منگوا لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ہمیں کیپ کی پوری پلٹن
سے مقابلہ کرنا پڑ جائے۔“

کناٹو ہارون بولا۔

”کناٹو ارشد کو منہ اندر سے روانہ کر دیں گے۔“

اس کے بعد کناٹو خالد مجھ سے کیپ کی ہیرکوں کے محل وقوع اور دوسری ہیرک
کے اس تہ خانے کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے لگا جہاں انڈین آرمی نے
کشمیری لیڈر کو قید کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ وہیں اوجھڑ پڑ کر سو گئے۔ میں کوئے
میں بیٹھا جاگتا رہا۔ رات گزر گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی جب غار کے دہانے سے اندر
آنے لگی تو کناٹو خالد نے مجاہد ارشد کو اٹھایا اور اسے کچھ مزید اسلحہ اور کچھ کھانے کا
سلان لانے کے لیے بھجوا دیا۔ ہارون نے روانہ کر دیا۔ ہماری جیب جنگل کے شروع میں پرانے
تلاب کے پاس جمائوں میں موجود تھی۔ مجاہد ارشد کو اسی جیب کے ذریعے واپس

بھجوا دیا تھا۔ اسے حمید نے خراب عقیدہ سے اٹھایا۔

کشمیری لیڈر کو چھت سے اتارا جانے لگا۔ میں تیزی سے تہ خانے کی بیڑمیاں
چڑھ کر ہیرک میں آیا اور وہاں سے دیوار پر ریمک کر روشن دان سے ہوتا ہوا ہیرک کی
دوسری طرف نکل گیا۔ رات کے اندر میرے میں رہنگا اور خادار تاروں کے نیچے سے
گزر کر اس جگہ پہنچا جہاں کناٹو خالد اور کناٹو ہارون جمائوں کے پیچھے پوزیشن لیے
بیٹھے تھے۔ میں نے جاتے ہی کناٹو خالد کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ وہ کہنے لگا۔
”ہمیں اب یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ دوسری انڈین فوجی پارٹی اپنے ساتھیوں کو
تلاش کرتی اور ضرور آئے گی۔“

کناٹو ہارون بولا۔

”یہ معلوم ہونے کے بعد کہ پٹول پارٹی کے جوان مارے گئے ہیں، کیپ کے
سارے فوجی الٹ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ ہم ان کا مقابلہ کر
سکیں۔“

”اوکے۔“ کناٹو خالد نے کہا۔ ”واپس چلو۔“

ہمارے دونوں پہلوؤں پر جو کناٹو لائٹ مشینیں تھیں لے پیٹھے انہیں بھی سنبھل
دے دیا گیا۔ ہم اندر سے میں تیز چلتے وہاں سے نکل آئے۔ کناٹو خالد اور کناٹو
ہارون اس جنگلی علاقے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کسی زمانے میں انہوں نے وہاں ایک
ندی کے پاس اپنا خیمہ پکڑا ہوا تھا۔ کناٹو خالد نے ہارون سے کہا۔
”ہارون! ہم اپنے پرانے پکڑاؤٹ آؤٹ میں جائیں گے۔“

”اوکے کناٹو را۔“

دوسرے مجاہد ساتھی بھی ہمارے ساتھ آکر مل گئے تھے۔ کناٹو خالد نے مجھے کہا۔
کرم دلو! ہمیں آپریشن کل تک ملتوی کرنا پڑے گا یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ
ہمیں کشمیری لیڈر کا سراغ مل گیا ہے۔ ہم کل رات انہیں کریں گے۔“

ان لوگوں کا پرانا پکڑاؤٹ آؤٹ وہاں سے کوئی ایک میل دور ایک برساتی ندی کے
پاس جمائوں اور درختوں میں گھرے ہوئے چھوٹے سے ٹیلے کی ایک قدرتی غار میں

کئی ایک کتابوں میں یا علی مدد و شرف
الفناط ملتے ہیں اور اسی جگہ پر ایک کتابوں
میں واضح لکھ رہا ہے۔ یہ سب
ماہر اور قلم نویس ہیں۔

دشمن کے قابو آسکتا ہوں۔

کمانڈر خالد نے پوچھا۔

”کرم دادا تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں کتنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تو میں مخصوص جانور کی آواز نکل کر آپ کو سٹل دے دوں گا۔ یہ سٹل سننے کے بعد آپ اپنی پوزیشن چھوڑ کر فوراً اپنے اسی ہائیڈ آؤٹ میں واپس آجائیں گے۔ کیونکہ میں اگر پکڑا بھی گیا تو ہر ممکن طریقے سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا اور اسی ہائیڈ آؤٹ میں آ جاؤں گا۔“

کمانڈر ہارون نے کہا۔

ہم کب تک تمہارا انتظار کر سکتے ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تم ٹیمپ سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکو۔“

میں نے کہا۔

”ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انسانی شکل میں پکڑے جانے کے گھنبرے دو گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ چھ سات گھنٹوں کے بعد مجھ پر دوبارہ دورہ پڑ جائے اور میں انسان سے واپس سانپ کے روپ میں آ جاؤں۔ اس حالت میں میں بڑی تیزی سے اور بڑی آسانی سے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا اور ہم تیسرے انیک کا پروگرام تیار کر سکیں گے۔ کیونکہ کشمیری لیڈر کو ہمیں ہر حالت میں میل سے نکل کر ساتھ لے جانا ہے خواہ ہمیں پورے انڈین ٹیمپ سے ہی کیوں نہ مقابلہ کرنا پڑ جائے۔“

کمانڈر خالد کہنے لگا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو کرم دادا! ہم ایسا ہی کریں گے۔ اگر ہمیں تمہارا ایرمینی سٹل مل گیا تو ہم اس وقت اپنی پوزیشن چھوڑ کر یہاں ہائیڈ آؤٹ میں آ کر چھپ جائیں گے۔“

کمانڈر ہارون بولا۔



دو گھنٹے بعد مجھ پر کچھ نائن اور اچار لے کر آگیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک تھیلے میں شین گنوں اور لائٹ مشین گنوں کا میگزین اور ہینڈ گرنیڈ بھی لایا تھا۔ ہم سب نے مل کر نائن کھائے اور رات کے کمانڈر انیک کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

کمانڈر خالد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”کمانڈر کرم دادا! کل رات کی طرح آج رات بھی تم دیکھ بھل کے لیے پہلے جاؤ گے اور ہمیں واپس آ کر صورت حال کی رپورٹ کو گے۔ تمہاری رپورٹ کی روشنی میں شب خون مارنے کا طریقہ کار طے کیا جائے گا۔“

میں نے خالد سے کہا۔

”کمانڈر! ابھی تک تو آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ میں سانپ کی شکل میں ہی ہوں

اور اس شکل میں ہونے کی وجہ سے میں بڑی آسانی سے ٹارگٹ کی سراغ رسانی کرنے نکل جاؤں گا لیکن اگر خدا نہ کرے ایسا ہو گیا کہ ٹارگٹ پر پہنچ کر اچانک مجھے جھکا لگا اور میں نے سانپ سے انسان کی شکل اختیار کرنی تو صورت حال سنگین بھی ہو سکتی ہے اور میں پکڑا بھی جاسکتا ہوں کیونکہ سانپ کی شکل سے جب میں نے اپنی انسانی شکل اختیار کی تو میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہوگا کوئی ہتھیار نہیں ہوگا میں بڑی آسانی سے

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم انڈین فوجی کیمپ کے قریب پہنچ گئے۔ کمانڈو خالد نے اپنے ساتھیوں کو کیمپ کے داخلہ گیٹ کی جانب دونوں طرف لائٹ مشین گنیں دے کر پوزیشنیں سنبھالنے کا آرڈر دے دیا۔ وہ لوگ اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ کمانڈو ہارون اور خالد درختوں کے نیچے جھانپڑیوں میں کل والی پوزیشنیں لے کر بیٹھ گئے۔ میں کمانڈو خالد کی بجٹ کے کنارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا۔

”کرم دلو! اب تمہارا کام شروع ہوتا ہے ہم اسی جگہ تمہارا انتظار کریں گے۔ معلوم کر کے آؤ کہ کشمیری لیڈر کیمپ کے تہ خانے میں ہی ہے یا اسے وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔“

”اوکے کمانڈو!“

میں چھلانگ لگا کر اس کی بجٹ کے کنارے اترا اور اندھیرے میں کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار کی طرف چل پڑا۔ میں کل والے راستے پر ہی چل رہا تھا۔ خاردار باڑھ کے پاس آکر میں رک گیا۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں کل میں نے دو فوجیوں کو ہلاک کیا تھا۔ وہاں لاشیں نہیں تھیں۔ کیمپ میں مجھے کوئی غیر معمولی فوجی سرگرمی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ دونوں فوجیوں کے بارے میں ان لوگوں نے یہی سمجھا ہے کہ انہیں کسی سناپ نے ڈس دیا تھا۔ یہ بات ان بھارتی فوجیوں کی گلی سڑی لاشوں سے بھی ظاہر ہو گئی ہوگی۔

میں مطمئن ہو کر خاردار باڑھ کے نیچے سے گزر گیا۔ میں نے ہیرکوں کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ دونوں ہیرکوں کے باہر ایک ایک گاڑو موجود تھا۔ حالات بڑے نارمل تھے۔ اگر کوئی امرضی دلی بات ہوتی تو یہاں سیکورٹی کے انتظامات بڑے سخت کر دیے گئے ہوتے۔ اب میں پہلی ہیرک کو چھوڑ کر دوسری ہیرک کی طرف بڑھنے لگا۔ کیونکہ تہ خانہ دوسری ہیرک کے کمرے میں ہی تھا۔ مجھے اسی ہیرک کے تہ خانے میں جانا تھا اور معلوم کرنا تھا کہ کیا کشمیری لیڈر ابھی تک اسی تہ خانے میں ہی ہے۔ میں بڑی

”لیکن ہم زیادہ دیر تک تمہارا انتظار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ ہم پوری طرح تیار ہو کر اسلحہ سمیت یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہم تمہیں زیادہ سے زیادہ دو دن دیکھیں گے اگر اس دوران تم نہ آئے تو ہم اپنے طور پر کمانڈو ایکشن کر کے کشمیری لیڈر کو یہاں سے نکل لے جانے کی کوشش کریں گے۔ اس کیمپ میں پچاس سے زیادہ انڈین فوجی نہیں ہوں گے۔ اگر ہمیں ان کا مقابلہ کرنا پڑا تو ہم سب تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی کافی ہے اور انڈین فوج کو یہاں کسی طرف سے ملک بھی اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتی۔ ہم انہیں ختم کر سکتے ہیں۔“

کمانڈو ہارون نے غلط بات نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کے پاس کافی اسلحہ ہو گیا تھا اور اندھیرے میں چھپ کر وہ کیمپ کے پچاس ساتھ فوجیوں کو ختم کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ سارے کمانڈوز تھے اور انہوں نے انڈین آرمی کے ایک مسلمان سابق کمانڈو سے باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے اگر میں وہاں چھس گیا اور آپ لوگوں کو میرا سٹیل مل گیا تو آپ صرف ایک دن میرا انتظار کریں۔ اس کے بعد اپنے طور پر پلان بنا کر کمانڈو ایکٹ کر دیں۔ ہیرکوں کی پوزیشن میں نے آپ لوگوں کو سمجھا دی ہے۔ کیمپ میں صرف دو ہیرکیں ہی ہیں۔ اگر ہنگامی حالات میں کیمپ کمانڈو نے جیسے ملک کے لیے وائزلیس بھی دیا تو ملک اتنی جلدی اس جگہ میں نہیں پہنچے گی۔ اتنی دیر میں ہم لوگ اپنا مشن مکمل کر کے یہاں سے فرار ہو سکیں گے۔“

سارا دن اسی منصوبہ بندی میں گزر گیا۔

رات ہو گئی تو ہم نے اپنے مشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو ہم لوگ ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ ہم اسی طرح بکھر کر چل رہے تھے۔ راستہ ہمیں معلوم تھا۔ میں اندھیرے میں لوہی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ان کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ کیونکہ میں سناپ کے روپ میں تھا اور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ سناپ اندھیرے میں بخوبی دیکھ سکتا ہے۔

ایک فوجی فوراً آگے بڑھتا تھا خانے کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ تینوں فوجی باہر کھڑے رہے۔ ان کے افسر نے جیب سے سگریٹ نکل کر سلگایا اور بولا۔
 ”ادھر کل رات کو سانپ نے انک کیا تھا تم لوگ ٹانٹ پنڈول پر دیکھ بھل کر جلیا کرو۔“

میں لکڑی کے ڈبے کے پیچھے چھپا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان فوجیوں کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس وقت ایک ایسی بات ہوئی کہ جس نے میرا خون خشک کر دیا۔ مجھے اپنے سانپ والے جسم کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگ گیا میں گھبرا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا مجھے علم تھا کہ میری ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ابھی میں پہلے والے ہلکے جھٹکے سے سنبھل نہیں سکا تھا کہ مجھے دوسرا جھٹکا لگا یہ دوسرا جھٹکا زیادہ زوردار تھا۔
 میں نے بے اختیار دل میں کہا۔ ”یا اللہ خیر!“

لیکن مجھ پر وہ دورہ پڑ چکا تھا جو میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت مجھ پر پڑے۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ ہی میرا جسم سانپ سے انسان میں تبدیل ہو گیا۔ سانپ کی حیثیت سے میں لکڑی کے ڈبے کے پیچھے سارے کا سارا چھپا ہوا تھا لیکن آدمی کی شکل میں آتے ہی میں سب کو نظر آنے لگا۔ ایک فوجی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے ایک دم شین مگن کندھے سے اتار کر میری طرف سیدھی کر لی اور بولا۔
 ”ہائ!“

سب مجھے دیکھنے لگے۔ ان کے صوبدار بھارتی فوجی نے سگریٹ پھینک دیا۔ سب نے شین مگوں کا رخ میری طرف کر دیا۔ صوبدار نے کہا۔
 ”کوئے یہ کہل سے آگیا۔ کون ہو تم؟“

میں انہیں کیا کہتا کہ میں کون ہوں اور وہاں کیسے آگیا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر بڑی معصومیت سے کہا۔
 ”جناب میرا نام دریا م داس ہے۔ میں صفائی کا کام کرتا ہوں۔ صفائی کرتے کرتے یہاں سو گیا تھا۔“

اسٹانی سے دوسری بیرک کی دیوار پر چڑھ کر روشندان میں سے اندر چلا گیا۔ یہ بیرک خالی تھی۔ تہ خانے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے کے اوپر نیچے ہر جگہ دیکھا مگر مجھے کہیں کوئی ایسا سوراخ یا درز نہ ملی جس میں سے نکل کر میں تہ خانے میں داخل ہو سکتا تھا۔ دروازے کو باہر سے تالا نہیں لگا تھا۔ صرف کنڈی لگی تھی۔ مگر میں اس کنڈی کو بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ اگر میں اپنی اسٹانی شکل میں ہوتا تو میرے لیے کنڈی کھولنی بہت آسان تھی۔ میں نے کنڈی سے لپٹ کر ایک دو پار زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش بھی کی لیکن کنڈی اتنی سخت لگی ہوئی تھی کہ میں اسے ذرا سا بھی نہ ہلا سکا۔

بیرک میں صرف ایک بچہ جل رہی تھی۔ بیرک کا اپنا دروازہ بھی بند تھا جس کے باہر گاڑ پھرو دے رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ معلوم کرنا بھی ضروری تھا کہ کشمیری لیڈر تہ خانے میں ہی ہے۔ کہیں اسے کسی دوسری جگہ تو نہیں منتقل کر دیا گیا۔ اگر وہ تہ خانے میں نہیں ہے تو پھر ہمارا سارا کامیڈ آپریشن بیکار ہو جائے۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھی پیچھے میری واپس کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے واپس جا کر انہیں صحیح معلومات فراہم کرنی تھی اور میری رپورٹ کی روشنی میں انہوں نے کامیڈو انک کرنا تھا۔ باہر فوجیوں کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ لگتا تھا تین چار فوجی ہیں۔ آواز بیرک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں جلدی سے کوئے میں لکڑی کے ایک ڈبے کے پیچھے چھپ گیا۔ بیرک کا دروازہ کھلا اور چار انڈین فوجی شین مگن کاندھوں سے لٹکائے اندر داخل ہوئے۔

میں انہیں غور سے دیکھنے لگا۔

ان میں ایک فوجی صوبدار یا حوالدار ہو گا وہ آگے آگے تھا۔ اس نے تہ خانے کے دروازے کے پاس آکر حکم دینے کے انداز میں کہا۔
 ”ٹائیک ریا رام! نیچے جا کر قیدی کی پوزیشن چیک کرو اور آکر رپورٹ کرو۔ ڈبل۔“

بھارتی صوبیدار سے کہا۔

”سرا! میں بے قصور ہوں۔ مجھے کچھ نہ کہیں۔“

یہ فقرہ میں نے چیخ کی آواز کے ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ میری چیخ کی آواز پر اسے کوئی شک نہ پڑے کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے کے لیے سکتل دیا ہے، حقیقت میں میں نے اپنے ساتھیوں کو سکتل ہی دیا تھا کہ میں پھنس گیا ہوں تم اپنی اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر روپوش ہو جاؤ۔

صوبیدار نے مجھے ٹھٹھا مار کر گلی دی اور کہا۔

”ابھی ملام پڑ جاتا ہے کہ تم کون ہے۔ لے چلو اسے اندر۔“

مجھے دوسری بیک میں دھکیل دیا گیا۔ میں فرش پر چارپائیوں کے پاس گرا جن پر فوجی سو رہے تھے۔ دو تین فوجی اٹھ بیٹھے۔

”کیا ہوا ہے سر؟“ ایک بھارتی فوجی نے پوچھا۔

صوبیدار نے کہا۔

”لوئے لوہر ہم نے کشمیر کا ایک اور کانڈو پکڑا ہے۔ یہ اپنے کانڈو ساتھی کو فرار

کرائے آیا تھا۔“

دو تین فوجی وہیں مجھے زد و کوب کرنے لگے۔ صوبیدار چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے

کہا۔

”کیا نام بتایا تھا تم نے؟“

میں نے کہا۔

”وریام داس سرا!“

اس نے ایک فوجی کو حکم دیا کہ میری پتلون کھول کر دیکھا جائے۔ یہ ایک ایسا ثبوت تھا جس کی میں تردید کر ہی نہیں سکتا تھا۔ انہیں فوراً معلوم ہو گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے فوراً بعد میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے۔ میں تو ناگمانی معیت میں پھنس گیا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میرے سکتل کے سننے

بھارتی صوبیدار نے میرے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا۔

”تم کو ہم نے پہلے لوہر نہیں دیکھا، سچ بولو تم کون ہو؟“

پھر اس نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا۔

”اس کو باندھ کر لے چلو۔“

اس دوران تہ خانے سے واپس آکر فوجی نے بتایا قیدی ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ

فوجی میری طرف حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

”سرا! یہ سولین کون ہے سر؟“

صوبیدار بولا۔

”کوئی دشمن کا جاسوس لگتا ہے۔ ابھی معلوم پڑ جاتا ہے کہ اس کو کس نے بھیجا

تھا۔ یہ ضرور کشمیری کانڈو کو ٹکالنے آیا ہے۔ لے چلو اسے۔“

بھارتی فوجی مجھے گھینٹے ہوئے بیک سے باہر لے آئے۔ میرے ساتھ بہت بڑی

شریچہڑی ہو گئی تھی۔ باہر آتے ہی گاڑوں نے بھی اپنی مشین گنیں سیدھی کر لیں۔

صوبیدار نے دونوں گاڑیوں کو گلی دے کر کہا۔

”تم کو کس لیے یہاں ڈیوٹی پر رکھا ہوا ہے؟ دشمن کا جاسوس قیدی کو ٹکالنے اندر

آ گیا اور تمہیں معلوم ہی نہیں پڑا؟ ہم کیمپ کانڈو کو تمہاری رپورٹ کرے گا۔“

فوجی مجھے گھینٹے ہوئے دوسری پارک کی طرف لے جا رہے تھے۔ مجھے یہ تو معلوم

ہو گیا تھا کہ کشمیری لیڈر تہ خانے میں ہی ہے مگر اب اس رپورٹ کا کوئی فائدہ نہیں

تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو جا کر یہ معلوم فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ میری گرفتاری کے

بعد یہ امر طے شدہ تھا کہ کیمپ کے گرد فوجی چیکنگ شروع کر دیں گے۔ اس طرح

میرے ساتھیوں کے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ چنانچہ بھارتی صوبیدار نے آرڈر بھی دے

دیا کہ کیمپ کے جنگل کی تلاشی لو۔ دشمن کے آدمی ضرور کسی جگہ چھپے ہوئے ہوں

گے۔ یہ اکیلا نہیں آیا ہو گا۔

یہ سنتے ہی میں نے اپنے حلق سے چیخ کے انداز میں ایک آواز نکالی اور ساتھ ہی

باہر فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ صوبیدار جلدی سے کرسی چھوڑ کر دروازے کی طرف گیل۔ ایک درمیانے قد کا فوجی فیل وردی میں اندر آگیا۔ اس کے کندھے پر لگے نین پھول تھے۔ وہ کینٹن ریک کا فوجی تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ رنگ گرا سا نولا تھا۔ ہاتھ میں بید تھا۔ وہ بید کو اپنی طرف سے بجاتے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے صوبیدار سے پوچھا۔

”صوبیدار! یہ کچھ بولا؟“

صوبیدار نے کہا ”سرا! ابھی تک یہ نہیں بکا۔“

بھارتی کینٹن نے صوبیدار کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”تم کیسا صوبیدار ہے۔ دشمن کا کانڈو پکڑا اور اس سے ابھی تک معلوم نہیں کر سکا کہ اس کا ساتھی اوہر کمال کمال پر ہے؟“

صوبیدار نے ان شین ہو کر کہا۔

”سرا! یہ بڑا پاکار بد حالش ہے ہم اس پر قریب ڈگری استعمال میں لائے گا۔ پھر اس کا باپ بھی تباہ کر دے گا۔“

بھارتی کینٹن مجھے گھور رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بالکل سامنے فرش پر اس طرح سٹ کر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ بھارتی کینٹن نے بید سے میرا چہرہ اوپر کیا اور بولا۔

”دیکھو ہم تم کو مار چہ نہیں کرے گا۔ تم ہم کو صاف صاف اپنے ساتھی کانڈو کا ہینڈ آؤٹ تباہ دو۔ ہم تم کو آزاد کر دے گا۔ ہم تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تمہارے ساتھیوں کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔“

میں نے کہا ”سرا! میں کانڈو وغیرہ کچھ نہیں ہوں۔ میں چور ہوں، میں چوری کرنے آیا تھا۔“

بھارتی کینٹن نے اتنی زور سے میرے کندھے پر بید مارا کہ میرا کندھا اور ساتھ ہی دماغ بھی سن ہو گیا۔ میں درد سے بلبلاتا تھا۔ بھارتی کینٹن مجھے گالیاں دیتے لگا۔

میں میرے ساتھی کانڈو وہاں سے نکل چکے ہوں گے۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد اوہر اوہر سے فوجیوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ بھارتی فوجی میرے ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے۔

بھارتی صوبیدار نے میرے منہ پر چھ سات تھپڑ مارے اور گالیاں دیتے ہوئے بولا۔

”ہم کو معلوم ہے تم کشتیری کانڈو ہے۔ تم ہم کو بتائے گا کہ تمہارا دوسرا ساتھی اوہر کمال چھپا ہوا ہے۔ نہیں تو ہم تمہاری بوٹی بوٹی کر دے گا۔“

ایک دم چھ سات تھپڑ دینے کے بعد میری آنکھوں کے آگے تاریے ٹاپتے لگے۔ ایک طرف سے ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ ایک دوسرے فوجی نے مجھے ٹھنڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اپنا پچاؤ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا برا حال ہو گیا۔ بھارتی صوبیدار نے حکم دیا۔

”اس کو کارڈر گاڑ دینا! ابھی اوہر یہ سب کچھ بتا دے گا۔“

کیپ کی چھوٹی سے کوارڈر گاڑ دینا جس کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا مجھے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ بھارتی صوبیدار سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اب اس نے مجھ سے انٹرویو لکیشن شروع کر دی۔ وہ مجھ سے یہی پوچھ رہا تھا کہ میرے دوسرے کانڈو کشتیری ساتھی جنگل میں کمال چھپے ہوئے ہیں اور ہماری تعداد کتنی ہے۔ یہ وہ راز تھا جو میں انہیں کسی قیمت پر نہیں بتا سکتا تھا۔ میں یہی کہتا رہا کہ میں کشتیری کانڈو نہیں ہوں۔ میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ میں بھوپال کے ایک قریبی گاؤں میں رہتا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کر کے گزارہ کرتا ہوں۔ آج رات بھی میں کیپ میں چوری کرنے کی نیت سے آیا تھا کہ پکڑا گیا۔ صوبیدار نے گلی دے کر کہا۔

”تم جھوٹ بکتا ہے کوئی چور کبھی کسی فوجی کیپ میں چوری کرنے نہیں آتا۔ ابھی کیپ کانڈو کو ہم نے انعام کر دیا ہے وہ بڑا ظالم ہے تمہاری بوٹی بوٹی کر دے گا۔ پھر تمہارا باپ بھی تباہ کر دے گا کہ تمہارے ساتھی کانڈو جنگل میں کدھر کدھر چھپا ہوا ہے۔“

ہینے گیل اس کے ساتھ جو فوجی سپاہی آیا تھا اس نے اپنی صندوقی سترچ پر رکھ دی اور اسے کھول کر کچھ ٹولنے لگا۔

بھارتی کمیشن اب مجھ سے مخاطب ہوا۔

”ابھی تمہارے پاس ٹائم ہے۔ ابھی تم ہم کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دو۔“

میں نے بڑی اٹھاری کے ساتھ کہا۔

”میرا کوئی ساتھی نہیں ہے جنہاں میں اکیلا ہی رات کو چوریاں کرتا ہوں۔“

بھارتی کمیشن نے سترچ پر میرے پاس کڑے فوجی کو اشارہ کیا۔ فوجی سپاہی اس دوران صندوقی میں سے ایک لوہے کا بوا زنبور نکال چکا تھا۔ وہ زنبور ہاتھ میں لیے میرے چہرے کے پاس آیا اور سرہانے کی جانب جو فوجی کھڑا تھا اس سے کہا۔

”اس کا منہ کھولو جوان۔“

فوجی نے فوراً آگے بڑھ کر میرے جڑے کھول دیے۔ میں نے منہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن فوجی کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں اپنے جڑوں کو بالکل نہ ہلا سکا۔ میرے منہ میں دوسرے فوجی نے زنبور ڈال کر ایک دم سے میری ایک ڈاڑھ کو زنبور کے شعلے میں جکڑا اور پھر اتنی زور سے جھکا دیا کہ میری جج جھک گئی۔ ایسا شدید درد ہوا جیسے کسی نے میرے سر میں لوہے کی سلاخ ٹھونک دی ہو۔ مجھے اپنے ہونٹوں سے خون بہتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ خدا جانتے میری پوری ڈاڑھ اکڑی تھی یا آدھی ٹوٹ گئی تھی لیکن درد کا یہ عالم تھا کہ میں ذوق کیے جانے والے اونٹ کی طرح بلبلاتا رہا تھا۔ مجھے بھارتی کمیشن کی گرفت آواز ملتی دی۔

”ہم ایک ایک کر کے تمہارے سب دانت اکھاڑ دے گا“ نہیں تو اپنے ساتھیوں کا

ٹھکانہ بنا دو۔“

اس وقت جس فوجی نے میرے جڑے کھولے ہوئے تھے اس نے ہاتھ اٹھا لیے۔ میرا منہ جیسے خون سے بھر گیا تھا۔ میں سوائے درد کی شدت سے کراہنے کے اور کچھ نہ

”تم اس طرح نہیں بتائے گا۔ ہم کو تمہیں بھلا آتا ہے۔“

وہ کرسی سے اٹھا اور صوبیدار کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس کو سیل نمبر ۲ میں لے چلو۔ ہم بھی وردی بدل کر اوجھ آتا ہے۔“

وہ چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوارٹر گاڑو سے نکل کر کیپ کے چار فوجی کھینچے اور

کھینچے ہوئے کیپ کی ایک جانب درختوں کی طرف لے آئے جہاں ایک اونچا بڑا تھا۔ یہ بالکل دیباہی تھا جس طرح کے اسلحہ بارود رکھنے کے واسطے ڈمپ بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ شے کے باہر کوئی سٹری وغیرہ نہیں تھا۔ لوہے کا ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر مجھے اندر دیکھل دیا گیا۔ تین ایڈین فوجی میرے ساتھ تھے۔ میں نے اپنے آپ کو اندر چلے میں پایا۔ اگر میں سہلپ کے روپ میں ہوتا تو اندر میرے میں دیکھ سکتا تھا مگر میں انسانی شکل میں تھا۔ اندر میرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک فوجی نے مین دیا کہ جی روشن کر دی۔ یہ ایک ٹھیک سی کوشنری تھی جس کی ایک دیوار کے ساتھ لوہے کے کنڈوں میں زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ایک سترچ پڑا تھا جس کی دونوں جانب چوڑے کے پٹے بندھے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ کھول کر مجھے اٹھا کر سترچ پر ڈال دیا گیا اور میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں جڑے کے پٹوں کے ساتھ کس کر پائندہ دیے گئے۔ میرے ساتھ جو وحشیانہ سلوک ہونے والا تھا میں اس سے واقف تھا۔ دل میں اس وقت ایک ہی دعا بار بار ٹانگ رہا تھا کہ اے خدا! میرے جہل پر رحم فرما اور مجھے انسان سے دوبارہ سہلپ بخلو۔ میرے بچاؤ کی وہاں صرف ایک صورت تھی کہ میں انسان سے سہلپ کی شکل اختیار کر جاؤں۔ اس کے بعد میں وہاں سے جان بچا کر فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی بچاؤ کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن خدا نے میری دعا قبول نہ کی اور میں اپنی اصلی انسانی حالت میں ہی سترچ پر پڑا رہا۔

اتنے میں بھارتی کمیشن بھی آگیا۔ وہ شب خرابی کے سوئین کپڑوں میں تھا۔ یہ

اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک فوجی سپاہی تھا جس کے ہاتھ میں

ایک چھوٹی سی صندوقی تھی۔ بھارتی کمیشن کے لیے فوراً ایک کرسی آگئی۔ وہ کرسی پر

بول سکا۔ بھارتی کپٹن نے اپنا فخر دہرایا۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں تو غریب چور ہوں۔۔۔۔۔“

”چلو۔ ایکشن کرو۔“

بھارتی کپٹن نے حکم دیا میرے سر پر کھڑے فوجی نے فوراً ”میرا جیڑا پکڑ کر کھول دیا۔ دوسرے فوجی نے فوراً“ زنجیر میرے منہ میں ڈال کر دوسری قطار میں ایک ڈاڑھ کو کھینچے میں پکڑا اور زبردست جھٹکا دے کر میری دوسری ڈاڑھ کو نکل دیا یا توڑ دیا۔ میرے حلق سے ڈکرانے کی آواز نکلی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے آپ کسی بھینس کی آدھی گردن کاٹ کر اسے چھوڑ دیں۔ درد کا دوسرا شدید جھٹکا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس غشی کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ درد کی لہروں کی شدت کم ہونے لگی۔ میں نے بھارتی کپٹن کی کرنٹ آواز سنی۔

”اس کو بے ہوش مت ہونے دینا۔“

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میرا منہ اکڑا ہوا تھا۔ میں اسی سڑیچ پر پڑا تھا۔ سارا بدن درد سے پتھر کا ہو گیا تھا۔ منہ سے خون لکل لکل کر ہونٹوں پر بہا ہوا تھا۔ میرے دونوں گل سوجے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے منہ کے اندر زبان پھیر کر دیکھا۔ میری دونوں طرف کی ڈاڑھیں اکھڑی نہیں تھیں آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھیں اور اتنی درد کر رہی تھیں کہ وہاں زبان نہیں لگائی جاتی تھی۔ کوٹھڑی خلی تھی میرے ہاتھ پاؤں سڑیچ پر اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ ایک فوجی اندر آگیا۔ اس نے روٹی سے میرا منہ صاف کر کے دوائی لگا دی۔ پھر میرے حلق میں غلی ڈال کر مجھے کچھ پلایا۔ جب غلی باہر نکلی تو مجھے ٹبک کا ذائقہ محسوس ہوا شاید یہ گلی سڑی سبزیوں کا سوپ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے راز معلوم کرنے سے پہلے مجھے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ دوسرے کو بھی مجھے وہی سوپ غلی کے ذریعے پلایا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھولے گئے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ سڑیچ سے اتر کر ٹہلنے لگا تو بے حد کمزوری محسوس ہوئی۔ سڑیچ پر جا کر

لیٹ گیا۔ سارا دن گزر گیا۔ شام کو بھی کوئی نہ آیا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے ذرا سا باہر کو دھکیلا۔ مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ یہ لوگ اتنے احمق نہیں تھے کہ دروازہ کھلا چھوڑ دیتے۔ رات کو بھی کوئی نہ آیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا فوجی کمپاؤنڈر آکر مجھے دوائی لگا جاتا تھا اور سوپ پلا جاتا تھا۔ دوسرے دن رات کو درد بھی کم ہو گیا۔ سوجن بھی تھوڑی اتر گئی تھی۔ تیسرے دن مجھے کافی آفاقہ محسوس رہا تھا لیکن اسی روز دوبارہ آفت نازل ہو گئی۔ وہی بھارتی کپٹن پھر نمودار ہوا۔

اس دفعہ اس کے ساتھ ایک اور فوجی تھا جس کے ہاتھ میں تھیلیا تھا۔ تھیلیا اس نے میرے سڑیچ کے پاس رکھ دیا۔ بھارتی کپٹن میرے قریب آکر بولا۔

”کیوں! تم کو کچھ عقل آیا؟ اب بھی وقت ہے، اگر اپنے ساتھی کشمیریوں کا ٹھکانہ بتا دو تو تمہاری جان بچ جائے گی۔“

میں نے اپنی طرف سے بڑی دشمنی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”جناب والا! میں بھارت میں بھارت نہیں کہہ رہا۔ آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

کوئی کشمیری ساتھی ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا مگر میں کشمیری نہیں ہوں۔ میں ضلع نکودر کا غریب مسلمان ہوں، ہسپتال کے علاقے میں آکر بس گیا۔ کام نہ چلا تو چوریاں کرنی شروع کر دیں۔ ایک چور نے بتایا کہ اس فوجی کیمپ میں ایک صندوق توٹوں سے بھرا ہوا ہے، بس اس کے لالچ میں میں آگیا۔“

بھارتی کپٹن میرا بیان سن کر مسکراتا رہا۔ پھر اس کا چہرہ غصے سے اور زیادہ کالا ہو گیا۔ اس نے تھیلے والے فوجی کو اشارہ کیا اور خود پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھیلے والے فوجی نے سب سے پہلے میرے ہاتھ پیر سڑیچ پر باندھ دیے۔ پھر اپنے تھیلے میں سے بجلی کے تاروں کا گچھا نکالا۔ میرے ٹخنوں اور کلائیوں کے ساتھ چار کلپ باندھے۔ سب تاریں ایک تار کے ساتھ جوڑیں اور اس کا سوچ ہاتھ میں لے کر دیوار والے بجلی کے پلگ کے ساتھ لگا کر بھارتی کپٹن کی طرف دیکھا جیسے حکم کا پتھر ہو۔

ہوں حاصل کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہاں سے کبھی کوئی کشمیری مجاہد زندہ واپس نہ چلا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے ایک بار خدا سے اپنی زندگی کی دعا مانگی اور کہا کہ اے میرے خدا مجھے ان ظالموں کی لذت ناک موت سے بچالے۔

میں نے نیم گرم پانی سے اپنے جسم کو پاک صاف کیا۔ وہی پرانی قیض اور پرانی چٹون پٹنی اور فوجی مجھے واپس کوٹھڑی میں لے آیا۔ مجھے کھانے کو تھوڑے سے چاول اور شوربہ دیا گیا۔ میں سڑیچر پر لیٹ گیا۔ مجھے اپنی بیوی جیلہ کا خیال آگیا۔ خدا جانے اب اس سے کب ملنا ہوگا۔ اس سے مل بھی سکوں گا یا نہیں۔ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف دو دن جنگل والے خفیہ ہیڈ کوارٹر میں میرا انتظار کریں گے اس کے بعد یا تو ہسپتال واپس چلے جائیں گے اور یا اپنے طور پر کوئی منصوبہ بندی کر کے کیپ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ کشمیری لیڈر کو رہا کر لیا جاسکے۔ جہاں تک میرا خیال تھا کمانڈو خالد شاید ایسا نہ کرے کیونکہ فوجی کیپ پر براہ راست حملہ کرنے سے ایک تو کامیابی کے امکانات بہت کم تھے دوسرے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کیپ کمانڈر کشمیری لیڈر کو فوراً ہلاک نہ کر دے۔

معلوم نہیں یہ میرے نیم گرم پانے سے نسلے کا اثر تھا یا دوسرے کا وقت پورا ہو گیا تھا میرے جسم پر پیلے تو لکڑی طاری ہو گئی اس کے بعد پینے آنے لگا۔ میں سمجھا کہ مجھے بخار ہو گیا ہے مگر میرا جسم گرم نہیں تھا۔ میں سڑیچر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے چھوٹے چھوٹے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ اب آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میں بہت خوش ہوا کیونکہ میں سناپ کی شکل اختیار کرنے والا تھا اور صرف سناپ کی شکل میں آ کر ہی میں ان درندوں کی قید سے نہ صرف آزاد ہو سکتا تھا بلکہ ان سے اپنے اوپر کیے گئے وحشیانہ تشدد کا انتقام بھی لے سکتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں بڑی بے تلی سے خود کو سناپ میں تبدیل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے غیر شعوری طور پر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر جیسا کہ ہوا کرتا تھا مجھے میرے جسم کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ میں

بھارتی پریکٹیشن نے مجھ سے کہا۔

”میں تمہیں ایک چانس اور دے رہا ہوں۔ تیار تمہارے دوسرے ساتھی جنگل میں کھل چپے ہوئے ہیں؟“

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ مجھے بجلی کے جھٹکے دینے والے ہیں۔ میں اندر سے ڈر گیا تھا۔ شاید یہ بجلی کے جھٹکے مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیں۔ فوجی نے بھارتی پریکٹیشن کا اشارہ پاتے ہی ہٹن دیا۔ مجھے بجلی کا شدید جھٹکا لگا اور میں سڑیچر سے ایک فٹ اوپر کا اچھل کر گر پڑا۔ بجلی کا ٹپ آنف کر دیا گیا تھا۔ میرا جسم اس طرح سنسنہ رہا تھا جیسے میرے سارے جسم میں جوتھیں رینگ رہی ہوں۔ دماغ میں گھنٹیاں سی بچتے تھی تھیں، آنکھوں میں تارے ناچ رہے تھے اور جسم میں جیسے بالکل جان نہیں رہی تھی۔ بھارتی پریکٹیشن نے ایک بار کہا۔

”اب بھی تیار دو گے تو تمہاری جان بچ جائے گی۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ کراہتا رہا۔ دوسری بار مجھے پھر بجلی کا جھٹکا دیا گیا۔ یہ جھٹکا ایک سیکنڈ تک بھی کم وقفے کا ہوتا تھا، مگر اتنے وقفے میں ہی میرے جسم سے جیسے میری روح نکل جاتی تھی۔ تیری جھٹکے پر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو میں اسی طرح سڑیچر پر پڑا تھا اور جسم روٹی کی طرح دھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ساری رات اسی طرح پڑا رہا۔ شاید صبح ہونے والی تھی کہ مجھے سڑیچر سے کھول کر ایک ہاتھ روم میں لے جایا گیا۔ جہاں میرے لیے ایک ٹب میں نیم گرم پانی تھا۔ بھارتی فوجی جو مجھے وہاں تک لایا تھا، بولا۔

”ابھی طرح اپنے مسلمانوں والے طریقے سے نہادھو لو۔ یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔“

وہ چلا گیا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ سب کچھ مجھے ڈرانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہوش آلود کا یہ فوجی مارچ سیل اس معاملے میں بہت بدنام تھے کہ یہاں کشمیری مجاہدوں کو صرف اسی لیے لایا جاتا ہے کہ ان سے جتنی معلومات حاصل ہو سکتی

بول

دیا

کو

میر

گرد

مجھ

ہو

پتھر

سو

دونو

درو

سڑی

صاف

نکلی

سے

ٹالی

گھو

بھارتی فوجی نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ کمرے میں تو کوئی انسان نہیں ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ مجھے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ میں کوئے میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے اپنے سامنے ایک سانپ کو بچن پھیلانے آتے دیکھا تو تھر تھرا کانپنے لگا۔ مگر فوراً ہی اس نے آگے بڑھ کر مجھے ٹھڈا مار کر ہلاک کرنا چاہا تو میں اس کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔ اس نے گھبرا کر اپنی ٹانگ پر ہاتھ مار کر مجھے ہٹانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ڈس دیا اور اچھل کر پرے ہو گیا۔ بھارتی فوجی کے جسم میں میرے زہر کا داخل ہونا ہی شرط تھا۔ جیسے ہی اس کے خون نے میرے زہر کا ذائقہ چکھا وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

یہ کوٹھڑی جہاں مجھے سڑیچر پر پانڈہ کر وشوانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا دونوں فوجی بیرکوں سے ذرا ہٹ کر عقب میں تھی۔ میں نے دروازے میں سے سر باہر نکالا تو دیکھا کہ باہر صبح کا دھندلا دھندلا اجالا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ کشمیری لیڈر تمہ خاں میں ہی ہے۔ کیپ کی زمین پر جگہ جگہ گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ میں بڑی آسانی سے چھپ کر رہ گیا تھا۔ میں اس بیرک کی طرف بڑھا جس کے اندر تمہ خاں والا ٹارچر سیل تھا۔ ایک چھوٹے سانپ کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بہت بھاری بھاکڑ کٹنی ہو۔ کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ دن کے وقت بیرک کے باہر کوئی فوجی گاڑ نہیں تھا۔ دو تین انڈین فوجی جوان ادھر ادھر نظر آئے۔ کچن کی طرف سے بھی کچھ فوجی جوانوں کے قہقہے لگانے کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ وقت ایسا تھا کہ کیپ کے تقریباً سبھی فوجی ناشہ کرنے میں مشغول تھے۔ اس کے باوجود میں نے بیرک کے دروازے میں سے اندر جانے کا خطرہ مول نہ لیا۔ میں بچھلی دیوار پر چڑھ کر روشندان کی سلاخوں میں سے بیرک میں اتر گیا۔ بیرک خالی تھی۔ پھر وہی مسئلہ درپیش ہونے والا تھا کہ تمہ خاں کا دروازہ اگر بند ہوا تو میں اندر کیسے جاؤں گا۔ دروازہ واقعی بند تھا۔ میں ایک طرف چھپ کر اپنے انسانی دماغ سے سوچنے لگا کہ تمہ خاں میں کیسے اتر جاؤں۔ ایک تو وہ صبح کا وقت تھا دوسرے اتفاق ایسا ہوا کہ

نے اپنا بازو اوپر اٹھایا تو مجھے اس کا بوجھ بہت ہی ہلکا لگا۔ اس کے بعد ایک گرم رو میرے جسم میں سے گزر گئی اور دوسرے لمحے میں سانپ کی شکل میں سڑیچر پر پڑا تھا۔ سانپ کی شکل میں آتے ہی میں سڑیچر سے اتر گیا۔

سیل میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہاں مجھے دو کام کرنے تھے۔ پہلا کام تو یہ تھا کہ مجھے ان بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرنا تھا جنہوں نے مجھے شدید زخموں دی تھیں۔ دوسرا اہم کام اپنے کشمیری لیڈر کو وہاں سے نکل کر لے جانا تھا۔ میں نے کیپ کا انڈین پیرکیشن کی شکل تو دیکھ رکھی تھی مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا۔ اس کو گھڑی میں میرا زیادہ دیر رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کوئی فوجی اندر آ جاتا تو وہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور ہلاک کر سکتا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا کہ سیل سے تو باہر نکلوں۔ باہر جا کر کہیں چھپ جاؤں گا۔ پھر کیپ کا انڈین بھارتی پیرکیشن کو تلاش کر کے سب سے پہلے اسے ڈسوں گا۔ جیسے ہی میں دروازے کی طرف بڑھا باہر سے ایک فوجی دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ یہ وہی فوجی تھا جس نے مجھے بجلی کے جھٹکے دئے تھے۔ وہ ہندو تھا، اسے بھارتی پیرکیشن نے اس کے ہندو نام سے ایک بار پکارا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ کہیں سیل کوئی مسلمان نہ ہو، کیونکہ انڈین آرمی میں تھوڑے بہت سہی مگر مسلمان فوجی بھی ہوتے ہیں اور میں اپنے کسی مسلمان بھائی کو ڈسنا نہیں چاہتا تھا خواہ اس کے ہاتھوں مجھے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچی ہو۔ میں جلدی سے کوئے میں چھپ گیا۔

ایک تو میں چھوٹا سا سانپ تھا دوسرا میرا رنگ بھورا تھا۔ میں تھوڑے سے اندھیرے میں بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ بھارتی فوجی نے سڑیچر کو دیکھا وہاں میں نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

”یہ سلا کدھر چلا گیا ہے۔“

میں نے انسانی آواز میں کہا۔

”میں تمہارا باپ سڑیچر کے پاس ہوں۔“

میں اس وقت ایک بھارتی فوجی ٹین کے کک میں شاید چائے یا گلی سڑی ہیزوں کا سوپ لے کر بیرک میں داخل ہوا۔ اس نے تہ خانے والے دروازے کی چٹنی کھولی اور نیچے اتر گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے نیچے اتر گیا۔ میڑھیوں میں اندھیرا تھا۔ آخری میڑھیوں پر تہ خانے میں جلتے ہوئے چھوٹے سے بلب کی کمزور روشنی پڑ رہی تھی۔

میں میڑھیوں سے ہٹ کر کونے میں چھپ گیا۔

میں نے کشمیری لیڈر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ فرش پر بازو پر سر رکھ کر سنا ہوا پڑا تھا۔ بھارتی فوجی نے اس کے پاؤں پر ٹھڈا مار کر کہا۔
”چلو اٹھو، چا پی لو۔“

ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے روٹی نکال کر اس کے آگے رکھ دی اور چلا گیا۔ کشمیری لیڈر کچھ دیر دیے ہی ناقص اکٹھی کیے لینا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر کمرہ پڑھا اور اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ بھیر کر اللہ تعالیٰ سے جملہ کشمیری فتح کی دعا مانگی اور سوکھی روٹی کھانے اور چائے پینے لگا۔ کم بخت بھارتی فوجی جاتے ہوئے ایک بار پھر باہر سے دروازے کو چٹنی لگا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں کونے کے اندر چھپ کر بیٹھا کشمیری لیڈر کو بڑی بے بسی کے ساتھ سوکھی روٹی کھاتے اور بار بار یا اللہ کا ورد کرتے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس پر اپنا آپ ظاہر کر دوں؟ ایک سانپ کو انسانی آواز میں بات کرتے دیکھ کر اس پر کیا اثر ہوگا؟ یہی سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ لیکن اس سے بات کرنی اور اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتانا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ میں نے اس بدلی ہوئی صورت حال کے مطابق ذہن میں یہ پروگرام بنایا تھا کہ اگر ہو سکے تو کشمیری لیڈر کو میں خود میل سے نکل کر لے جاتا ہوں۔ ہماری کمانڈو پارٹی کو حملہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ دیے بھی ہماری کمانڈو پارٹی ٹارگٹ سے بہت دور جا چکی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہمیں دیر لگ جائے اور اس دوران کشمیری لیڈر کو شہید کر دیا جائے۔

اس اعتبار سے کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں سے بات کرنی ضروری تھی۔ میں

نے آہستہ سے کہا۔

”السلام علیکم!“

سوکھی روٹی توڑتے ہوئے کشمیری لیڈر کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ اس نے حیران سا ہو کر جس طرف سے آواز آئی تھی اس طرف دیکھ کر اسے نظرنہ آیا۔ میں نے کہا۔

”وائیں صاحب! میں کوئی غیبی روح نہیں ہوں۔ میں بھی آپ کی طرح انسان ہوں اور جملہ کشمیر کا ایک اونی سپاہی ہوں۔ اگر آپ مجھے یقین دلادیں کہ آپ مجھے دیکھ کر سراسیمہ نہیں ہوں گے تو میں اپنا آپ تم پر ظاہر کر دوں گا۔“

کشمیری لیڈر کے لیے یہ ایک غیبی آواز تھی۔ کیونکہ میں اسے سانپ کے روپ میں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ابھی تک حیرانی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

”وائیں صاحب! میں اپنی کمانڈو پارٹی کے ساتھ آپ کو بھارتی درندوں کی قید سے نجات دلانے آیا ہوں۔“

کشمیری لیڈر ذرا سنبھل سا گیا۔ اس نے پوچھا۔
”بھائی تم کون ہو؟ کیا تم کوئی فرشتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں فرشتہ نہیں ہوں۔“

”تو پھر تم دکھائی کیوں نہیں دیتے؟“

کشمیری لیڈر کی آواز میں فحاشیت اور کمزوری تھی۔ اس مجاہد کو بھارتی درندوں نے ازیتیں دے دے کر شیم جان کر دیا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ میں آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں۔ الحمد للہ مسلمان ہوں، جملہ کشمیر کا کمانڈو ہوں اور صرف آپ کو تلاش کرتا ہوں۔ لیکن میرے ساتھ ایک عجیب بات ہو گئی ہے۔ ایک ناخوشگوار حادثے کے بعد میں جلاوگر

میں نے کشمیری لیڈر کو مختصر الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ ہماری کانڈو پارٹی کا پلان کیا ہے۔ جب اس نے وہاں سے میرے ساتھ اکیلے فرار ہونے کی مشکلات کا ذکر کیا تو میں نے کہا۔

”سنپ کی حیثیت سے مجھے کچھ ایسی سولتیں حاصل ہیں جو ہماری کانڈو پارٹی کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو یہاں سے نکل کر لے جاؤں گا۔ صرف ہمیں رات کا اندھیرا ہو جانے کا انتظار کرنا ہوگا۔ تم مجھے یہ بتا دو کہ کیا رات کے وقت یہاں کوئی سنتری تمہارے لیے کچھ لے کر آتا ہے؟“

اس نے کہا۔
”ہاں ایک سنتری سوکھی روٹی اور چائے کا گال لے کر آتا ہے۔“

”تم نے یہ بتا کر میرا کام آسان کر دیا ہے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی دروازے کے باہر لگی چٹنی نہیں کھول سکتا۔ یہ کام رات کو آنے والا سنتری کرے گا اور وہی وقت ہمارے فرار کا ہوگا۔“

کشمیری لیڈر کو ابھی تک میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے میرے پلان کی کامیابی پر شک ہے۔ میں نے کہا۔

”سنتری باہر سے دروازے کو چٹنی لگا گیا ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ دروازے میں کوئی درز یا سوراخ نہیں ہے کہ جہاں سے میں باہر نکل سکوں۔ ویسے بھی مجھے اکیلا یہاں سے نہیں نکلتا۔ تمہیں ساتھ لے کر جانا ہے اور اس کے لیے دروازے کی چٹنی کا باہر سے کھانا ضروری ہے اور یہ کام رات کو باہر سے آنا والا سنتری ہی کر سکتا ہے۔ ہمیں رات پڑنے کا انتظار کرنا ہوگا۔“

کشمیری لیڈر آہستہ آہستہ سوکھی روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے نین کا کک خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا اور ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا، اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اور وہیں لیٹے ہوئے بولا۔

پیسروں کے ظلم اور ان کے منتروں کے اثر سے انسان سے سنپ بنا دیا گیا ہوں۔“
کشمیری لیڈر کے چہرے پر حیرت اور تعجب کے آثار نمایاں ہوں رہے تھے۔ وہ آہستہ سے بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آیا تم کیا کہہ رہے ہو؟“
میں نے دھیمی آواز میں مختصر طور پر کشمیری لیڈر کو اپنی داستان بیان کی اور کہا۔
”اب میں آپ پر اپنا آپ ظاہر کر رہا ہوں۔“

اور میں اندھیرے کونے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ کشمیری لیڈر نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سوکھی روٹی وہیں رکھ دی اور ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے کہا۔
”ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں میرا نام کرم داہ ہے اور جہاں کشمیر کا محلہ ہوں۔“

تھوڑی سی گفتگو کے بعد کشمیری لیڈر نے مجھے سنپ کے روپ میں ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ ہم بڑی آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔
”میں آپ کو یہاں سے نکل کر لے جانا چاہتا ہوں۔ جنگل میں ہمارا ایک خفیہ ٹھکانہ ہے۔ آپ کو وہاں چھپا کر میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دیتے جاؤں گا اور پھر ہم رات کے اندھیرے میں آپ کو بھوپال لے جائیں گے۔“

کشمیری لیڈر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا کہ میں انسان ہوں اور عارضی طور پر سنپ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہوں؟“

کشمیری لیڈر نے کہا۔
”قرآن جہاں میں خدا کی قدرت کے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یہ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بھائی! مجھے یقین نہیں آ رہا لیکن یقین کر لیتی پڑ رہا ہے۔ لیکن مجھے یہاں سے نکل کر لے جانا اتنا آسان نہیں ہے۔“

”کنزوری کی وجہ سے میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔“

میں نے کہا۔

”تم بے شک آرام کرو۔ میں کونے میں چھپ جاتا ہوں۔“

”اور میں ٹارچر سیل کے کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔“



اوپر ہیرک میں فوجیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

کشمیری لیڈر تو اسی طرح فرش پر پڑا رہا مگر میں ہوشیار ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں سڑیچر والے ٹارچر سیل میں ایک بھارتی سپاہی کو ڈس آیا ہوں اور ان لوگوں کو اس کی لاش کا علم ہو گیا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ وہ سانپ کو مارنے کے لیے اسے اصرار تلاش کر رہے ہوں کیونکہ بھارتی سپاہی کی لاش سے صاف ظاہر ہو رہا ہوگا کہ اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ پچھلی سے پچھلی رات کو بمی میں نے دو سپاہیوں کو ڈس کر ہلاک کیا تھا اور ان کی لاشیں بھی کیمپ کے فوجیوں کو مل چکی تھیں۔ چنانچہ وہ اب یہ چاہتے ہوں گے کہ سانپ کہیں اسی جگہ ہیرکوں میں کہیں چھپا ہوا ہے، اسے فوراً ہلاک کر دیا جائے تاکہ وہ کسی اور سپاہی کو نہ کاٹ لے۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ دو سپاہی دروازہ کھول کر بیڑھیاں اترنے لگے۔ میں تیزی سے دیوار پر چڑھ کر چھت کی کڑیوں میں ایک جگہ چھپ گیا۔ فوجی سپاہیوں نے اندر آکر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا ایک فوجی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں گھاس کاٹنے والا لمبا چھرا تھا۔ کشمیری لیڈر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی نے کہا۔

”میل کوئی سانپ تو نہیں آیا؟“

کشمیری لیڈر نے کہا۔

Famous Urdu Novels

Free pdf Library

اپنے آپ کو فرار کے لیے تیار کر لو۔"

کشمیری لیڈر پھر بھی کچھ نہ بولا اور میری طرف ہٹتا رہا۔ میں دیوار پر سے ریگ کر چھت میں جا کر چھپ گیا۔ کشمیری لیڈر اس طرح ٹانگیں سمیٹ کر فرش پر لیٹ گیا۔

دن گزرتا چلا گیا۔ تمہ خانے میں ہونے کی وجہ سے باہر کی آوازیں بہت کم سنائی دیتی تھیں۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر دن کتنا گزر گیا ہے۔ جس منٹری نے کشمیری لیڈر کے لیے سوکھی روٹی اور پانی یا گلی سڑی ہیزیوں کا سوپ لے کر آنا تھا بس اسی کی آمد سے ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ باہر رات ہو گئی ہے۔ کیونکہ کشمیری لیڈر نے کہا تھا کہ اب منٹری رات کو ہی آئے گا۔ مجھے یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر خدا نہ کرے میں چھت میں چھپے ہوئے اچانک انسانی شکل میں آگیا تو دھڑام سے نیچے فرش پر گر پڑوں گا اور ہو سکتا ہے میری ٹانگ ٹوٹ جائے۔ پھر خیال آیا کہ میں یک لخت کبھی بھی انسان سے سانپ اور سانپ سے انسان کے روپ میں نہیں آیا۔ پہلے مجھے ہلکے ہلکے جھٹکے ضرور لگتے ہیں۔ چنانچہ اگر مجھے اس قسم کے جھٹکے لگتے محسوس ہوئے تو میں فوراً چھت سے اتر جاؤں گا لیکن خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ جب تک میں کشمیری لیڈر کو یہاں سے نکل کر نہیں لے جاتا سانپ ہی بنا رہوں۔

نہ دوپہر کا کچھ پتہ چلا نہ یہ پتہ چلا کہ باہر شام ہو گئی ہے یا رات پڑ گئی ہے۔ وقت کئی گزر گیا تھا۔ تمہ خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں چونکا ہو گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ میڑھیوں پر قدموں کی آواز آئی۔ یہ دو بھارتی سپاہی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں نین کا مک اور اس کے اوپر سوکھی روٹی رکھی ہوئی تھی۔ دوسرے نے شین گن اٹھائی ہوئی تھی۔ شین گن والا فوجی میڑھیوں کے پاس ہی رک گیا۔ دوسرے فوجی نے مک اور روٹی کشمیری لیڈر کے ہاتھوں میں دی اور کہا۔

"کیمپ کمانڈر صاحب نے کہا ہے آج روٹی چائے کھا لو، صبح تمہیں شوٹ کر دیا جائے گا۔"

"میں نے تو نہیں دیکھا۔"

دوسرا فوجی سپاہی بولا۔

"سانپ آتا تو اس کو دس کر مار نہ ڈالتا۔ چلو باہر بھاڑیوں میں چل کر دیکھتے ہیں۔"

پہلا فوجی کہنے لگا۔

"دیکھ لیتے ہیں، کہیں ادھر ادھر چھپا ہوا نہ ہو۔"

وہ سانپ سے ڈر بھی رہے تھے۔ بڑی احتیاط سے کوشش میں انہوں نے دائیں بائیں دیکھا اور جلدی سے میڑھیوں کی طرف آ گئے۔

"یہاں نہیں ہے۔ بھاڑیوں میں ہی ہو گا۔"

جب وہ باہر نکل گئے اور انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹنی لگا دی تو کشمیری لیڈر نے اس کو نے کی طرف دیکھا جہاں میں اس کے سامنے جا کر چھپ گیا تھا۔ میں چھت پر سے اتر کر نیچے آگیا اور اسے دھیمی آواز میں ساری روئیداد سنا دی کہ کس طرح میں نے تھوڑی دیر پہلے اس اندین فوجی کو بیرگ میں دس کر موت کی نیند سلا دیا تھا جس نے مجھے بجلی کے جھٹکے دیے تھے۔ کشمیری لیڈر میری طرف دیکھتا رہا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک سانپ انسان کی آواز میں کسی سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

"میں اوپر چھت میں جا کر چھپ گیا تھا۔ میں نے ان سپاہیوں کی آوازیں سن لی تھیں۔"

میں نے کشمیری لیڈر کو بتا دیا تھا کہ میں کس بھی وقت سانپ سے اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آ سکتا ہوں۔ اسے میری اس بات پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سارا ماجرا ہوتے نہ دیکھ لے۔ میں نے کہا۔

"میں چھت میں جا کر ہی چھپ جاتا ہوں رات ہو جائے گی تو نیچے آ جاؤں گا۔ تم

یہ کہہ کر وہ میڈیوں کی طرف بڑھا اور شین گمن بردار سپاہی سے کہنے لگا۔
 ”جب تک قیدی راشن کھاتا ہے اس کو گارڈ کرو۔ یہ نین کا ڈبہ توڑ کر خودکشی نہ کر لے۔ مجھے کمانڈر صاحب کو جاکر رپورٹ کرنی ہے۔“

وہ چلا گیا۔ شین گمن والا فوجی میڈیوں سے ہٹ کر کشمیری لیڈر کے سر پر آکر کھڑا ہو گیا۔ کشمیری لیڈر سر جھکائے فرش پر بیٹھا آہستہ آہستہ روٹی چبلے کی کوشش کر رہا تھا۔ پلا سپاہی جو باہر گیا تھا اس نے تہ خانے کا دروازہ ضرور بند کر دیا تھا مگر چٹنی نہیں لگائی تھی کیونکہ مجھے چٹنی لگانے کی آواز نہیں آئی تھی۔ ضرور باہر رات ہو گئی ہوگی۔ اب مجھے اپنا کمانڈو آپریشن شروع کرنا تھا۔ وقت زیادہ نہیں تھا۔ میں نے چمت کی کڑیوں میں سے انڈین فوجی کو دیکھا۔ پہلے تو وہ کشمیری لیڈر کے ارد گرد ٹھٹھا رہا۔ پھر اس کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اسے غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

میں چاہتا تھا کہ وہ پوزیشن میں آجائے۔ میں چمت کی کڑیوں میں دیکھ کر اس کے عقب میں دیوار کے پاس آ گیا۔ پھر بڑے آرام سے رینگتا ہوا دیوار سے اتر کر فرش پر آ گیا۔ میں نے ٹارگٹ پر حملے کا سارا نقشہ ذہن میں بنالیا ہو تھا۔ میں بھارتی سپاہی کی طرف اس کے عقب میں آگے بڑھا۔ وہ اسی طرح شین گمن ہاتھ میں لیے کھڑا کشمیری لیڈر کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”کیوں دوسروں کی خاطر اپنی جان گنوا تے ہو۔ صبح تمہیں گولی مار دی جائے گی۔ کیپ کمانڈر کو اپنے ساتھیوں کے نام بتے تا دو، نہیں تو مجھے ہی بتا دو، تمہاری جان بچ جائے گی۔“

کشمیری لیڈر نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ روٹی چبا کر نگنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ چائے پینے لگا۔ اس دوران میں فرش پر رینگتا ہوا بھارتی سپاہی کے فوجی بوٹوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں اسے چٹون کے اندر جاکر پینڈلی پر ڈنسا چاہتا تھا۔ میں اس کے بوٹوں پر چڑھ گیا۔ کشمیری لیڈر مجھے برابر دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ فوجی سپاہی کے بوٹ اتنے بھاری تھے کہ اسے سناپ کے چڑھنے اور رینگنے کا بالکل احساس نہ

ہوا۔ اس کی چٹون کا پانچویں میرے اوپر تھا۔ آدھی پینڈلی خاکی رنگ کی موٹی جرابوں میں چھپی ہوئی تھی۔ یہ اوننی جرابیں تھیں اور میرے دانت ان میں سے گزر کر فوجی کی پینڈلی میں کھب سکتے تھے۔

میں نے ایک لمحہ بھی اب ضائع نہ کیا اور بجلی ایسی تیزی سے اس کی پینڈلی پر ڈس دیا۔ ڈس ابھی اتنی شدت سے کہ ضرورت سے زیادہ زہر اس کے خون میں شامل کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے زہر کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ آدمی کا سارا بدن سن ہو جاتا تھا اور وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گر پڑتا تھا اور اس کے ٹانگ اور منہ سے خون جاری ہو جاتا تھا اور اس کے بعد جسم پھٹنے لگتا تھا۔ اس انڈین فوجی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ قیمت ہوئی کہ وہ کشمیری لیڈر کے اوپر نہیں گرا بلکہ پہلو کی طرف گرا۔

میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

”غلام حسین! شین گمن اشغال میں تمہارے کندھے پر آ رہا ہوں۔“

کشمیری لیڈر جلدی سے اٹھا اس نے فرش پر گرے ہوئے بھارتی فوجی کی شین گمن اٹالی۔ میں فوجی کی چٹون سے باہر آ گیا تھا۔ میں اچھل کر کشمیری لیڈر کے کندھے سے چٹ گیا وہ ذرا گھبراہٹ میں نے کہا۔

”گھبراؤ نہیں اور جلدی سے اوپر چلو۔ فکر نہ کرو۔ میں سناپ ہونے کی وجہ سے

اندھیرے میں دیکھ سکتا ہوں۔ تمہیں جلد چلنے کو کہوں اور کوئی چلنا۔“

کشمیری لیڈر کوئی انٹائی نہیں تھا۔ باقاعدہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور مقبوضہ کشمیر کے محاذ پر انڈین آرمی کے ساتھ لڑ چکا تھا۔ رہائی کا سنہری موقع دیکھ کر اس میں تھوڑی بہت طاقت بھی آگئی تھی۔ آہستہ سے بولا۔

”ایسا ہی کروں گا۔ فکر کی بات نہیں۔“

وہ شین گمن ہاتھوں میں پکڑے تہ خانے کی میڈھیال چڑھ کر دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”دروازے کو ذرا سا باہر کو دھکیلو۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کہا۔

”میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ تم اسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤ۔“

وہ وہیں بیڑیوں میں بیٹھ گیا۔ میں اس کے کندھے سے اترا اور ذرا سے کھلے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ باہر رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر دونوں بیرکوں کی بتیاں روشن تھیں۔ کوارٹر گاڑو اور لنگر خانے کی طرف بھی روشنی ہو رہی تھی۔ کسی فوجی گاڑی کا انجن ایک دم سٹارٹ ہوا اور پھر اپنے آپ رک گیا۔ دور سے کسی بھارتی فوجی کے کسی کو بلانے کی آواز آئی۔ میں نے واپس آ کر کشمیری لیڈر کو ساتھ لیا اور اسے بیرک میں سے نکل کر دیوار کے عقب میں لے آیا۔ باہر کوئی سنتری نہیں تھا۔ شاید وہی سنتری گاڑو ڈیوٹی پر تھا جس کو میں نے تہہ خانے میں ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس کو تہہ خانے کے باہر گاڑو ڈیوٹی پر واپس آنا تھا۔ بیرکوں کے پیچھے جو درخت اور جھاڑیاں تھیں وہیں اندھیرا تھا۔ میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

”ان دونوں میں سامنے کی طرف چلنا شروع کرو۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ شین گن پوزیشن میں کیے تجربہ کار سپاہیوں کی طرح جھک جھک کر قدم قدم چل رہا تھا۔ میں اسے اسی طرح چلتا ہوا خاردار تاروں والی دیوار کے پاس لے آیا۔ ظاہر ہے اس کے پاس تار کاٹنے والا کوئی اوزار نہیں تھا اور میں اسے خاردار باڑھ میں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ میرا ٹارگٹ فوجی کیمپ کا گیٹ تھا۔ صرف اس گیٹ میں سے میں اسے باہر نکل سکتا تھا۔ وہاں سے باہر نکلنے کی دوسری کوئی جگہ نہیں تھی، کوئی راستہ نہیں تھا اور اس فوجی کیمپ کے گیٹ سے ایک خطرناک زیر حراست کشمیری مجاہد کا نکل جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہر قدم پر اس کی موت کا خطرہ تھا۔ یہ میں دیکھ چکا تھا اور ہمیں ربکی کے دوران معلوم ہو چکا تھا کہ اس فوجی کیمپ میں رات کو صرف ایک سنتری پہرہ دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی باقاعدہ فوجی کیمپ نہیں تھا۔ یہ ایک بھارتی فوجی

ٹارچر سیل تھا جس کی حفاظت اور لٹری اٹلی جینس کی طرف سے اینڈوگیشن اور ٹارچر کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے پونا ہارس کی ایک انڈین پلاٹون تعینات کی ہوئی تھی۔ چنانچہ گیٹ پر سخت سیکورٹی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ گیٹ پر کوئی گاڑو روم بھی نہیں تھا۔ چھوٹا سا ایک کھوکھا ایک طرف بنا ہوا تھا جہاں گاڑو سنتری بارش کے وقت آ جاتا تھا لیکن کوارٹر گاڑو وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا اور اگر مجھ سے ذرا سی بے احتیاطی ہو جاتی تو سنتری گاڑو فائر کے سارے کیمپ کو الٹ کر سکتا تھا اور ہمیں گہرے میں لیا جاسکتا تھا۔ شین گن کا بیگزین زیادہ دیر تک کشمیری لیڈر کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ سارے حقائق میرے ذہن میں تھے اور مجھے ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھنا تھا۔ میں کشمیری لیڈر کے کندھے سے چننا ہوا تھا اور سر اٹھا کر سامنے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا چونکہ مجھے اندھیرے میں ایک ایک چیز ایک ایک درخت صاف نظر آ رہا تھا اس لیے میں کشمیری لیڈر کو بڑی اچھی طرح گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم خاردار تاروں کے بالکل ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کشمیری لیڈر جھک کر چل رہا تھا۔ کیمپ کے گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

”میل جھاڑیوں میں بیٹھ جاؤ۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ کچھ بھی ہو جائے فائر مت کرنا۔“

Free pdf Library

میں خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ ریٹنگ گیٹ کے پاس آ گیا۔ مجھے کوئی اتنی جلدی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑو ڈیوٹی پر جو سنتری تھا وہ بند گیٹ کے آگے ٹھل رہا تھا۔ یہ گیٹ زمین سے تین چار فٹ اونچا تھا اور ہانوں کو آڑھے ترچے لگا کر بنایا گیا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ دروازہ نہیں تھا۔ محض رکاوٹ کے طور پر لگایا گیا تھا۔ چاروں طرف میں نے نگاہیں دوڑائیں۔ صرف کوارٹر گاڑو کے پاس دو فوجی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے وہاں سے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بیرکوں کی طرف چل دیے۔ اب میری ساری توجہ گیٹ کے سنتری کی طرف تھی۔ میں اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ میرا ٹارگٹ تھا جس پر مجھے حملہ کرنا تھا۔ وہ کسی جگہ رکتا نہیں تھا۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا جسم اتنی شدت سے کیوں لرزا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے ایک طرف کو گھوم گیا۔ میں نے اس کی گردن سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ زمین پر گر پڑا اور زمین پر ہی لرزنے لگا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ میں تیزی سے اس کے منہ کے پاس گیا۔ اس کا سانس بند ہو چکا تھا۔

اس کلام سے فارغ ہوتے ہی میں جلدی جلدی اس جھاڑی کے پاس گیا جہاں کشمیری لیڈر شین گمن لے بیٹھا اندھیرے میں گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کو میں نظر نہیں آیا۔ میں نے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

”سنتری مرچکا ہے۔ آ جاؤ۔“

وہ اٹھنے لگا تو میں نے اسے سختی سے کہا۔

”غلام حسین جھک کر چلو۔ کوارنر گاڑو کا سنتری دیکھ لے گا۔ گیٹ پر سے اسی طرح کود جانا۔ چلو۔“

میں اچھل کر اس کے کندھے سے چپٹ گیا۔ کشمیری لیڈر نے گاڑو سنتری کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا جھک کر چلا گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”بیٹھے کا وقت نہیں ہے غلام حسین۔ گیٹ پر سے کود جاؤ۔“

وہ اٹھا اور گیٹ کے اوپر سے باہر کی طرف کود گیا۔ میں نے کہا۔

”پائیں جانب اندھیرے میں بھاگ چلو۔“

وہ اسی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان اندھیرے میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کے کندھے سے پھٹا اندھیرے میں اس کی راہ نمائی کر رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ اب پائیں جانب مڑ جاؤ، اب دائیں جانب ہو جاؤ کیونکہ مجھے سارے راستے کا علم تھا۔ ہم درختوں میں سے نکل کر اونچے نیچے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں میں آ گئے۔ یہ ٹیلے نہیں تھے۔ وہاں سے زمین اونچی نیچی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

”غلام حسین تھکنا بالکل نہیں۔ تمہیں کم از کم آدھے گھنٹے تک دوڑتے چلے جانا

چار قدم چل کر گیٹ کے اس طرف آتا تھا پھر ٹھٹھا ہوا گیٹ کی دوسری طرف چلا جاتا تھا۔ شین گمن اس نے کندھے سے لٹکائی ہوئی تھی۔ مجھے صرف یہی ٹارگٹ مارنا تھا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کشمیری لیڈر کو اتنی جلدی ٹارچر سیل سے نکال کر لے آیا ہوں۔ تب خانے میں انڈین سپاہی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی خبر صبح ہی کسی کو ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی کو خیال آ جائے کہ فلاں جوان زیر حراست قیدی کا کھانا لے کر آ گیا تھا ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ اگر اب تک کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی تو دن نکلنے پر ہی لاش مل سکتی تھی۔ لاش کی مجھے زیادہ فکر اس لیے نہیں تھی کہ اسے بھی سناپ نے ہی کاٹا تھا اور اس لاش کو بھی سناپ کے کھاتے میں ہی پڑنا تھا۔

میں ریٹنا ہوا اندھیرے میں سے ہو کر گیٹ کے پیچھے آیا اور گیٹ پر جو آڑے ترچھے ہنس گئے تھے ان پر چڑھ گیا۔ میں ایسی پوزیشن میں بیٹھ گیا کہ جہاں سے میں قریب سے گزرتے ہوئے سنتری پر آسانی سے حملہ کر سکتا تھا۔ سنتری ٹھٹھا ہوا گیٹ کی ایک طرف گیا۔ وہاں ٹھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ خدا جانے وہ کیا کر رہا تھا بھی جھک کر زمین پر دیکھتا بھی وادی کی جیب کو بٹولا۔ میں دل میں اسے برا بھلا کہنے لگا کہ کم بخت اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے۔ آخر وہ واپس مڑا۔ آرام آرام سے ٹھٹھا جیسے ہی میرے قریب سے گزر کر ایک قدم آگے ہوا میں نے اس کی گردن پر چھلانگ لگا دی۔ مجھے صرف اتنا کمال دکھانا تھا کہ اس سے پہلے کہ سنتری کی آواز نکلے یا وہ ہاتھ اوپر کر کے مجھے گردن سے جھاڑے یا الگ کرنے کی کوشش کرے اس وقت تک میں اپنا کام کر لوں۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ مجھے اس ایکشن کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ بھارتی سنتری کی گردن سے چپٹا اور اس کی گردن پر ڈنسا یہ دونوں کام ایک ہی وقت میں ہو گئے۔ گٹے پر ڈسنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے اس کی آواز بند ہو گئی تھی۔ میں ابھی تک اس کی گردن سے ہی چپٹا ہوا تھا کہ اس کے جسم نے لرزنا شروع کر دیا۔ مجھے آج تک

آؤٹ چیک ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ اب دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بس ذرا تیز تیز چلو۔ سامنے جو درخت ہیں ان کے درمیان سے ہوتے ہوئے دائیں جانب مڑ جائے۔ آگے ایک چھوٹی ندی آئے گی۔“

وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ میں اپنی نظروں سے اسے راستہ دکھا رہا تھا۔ درختوں میں سے گزرنے کے بعد ندی آگئی۔ ہماری کمانڈو پارٹی اسی ندی کے چھوٹے سے پل سے گزر کر فوجی کیمپ کی طرف گئی تھی۔ اس ندی کو دیکھ کر میری بھی تسلی ہو گئی کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ ہم نے ندی پار کر لی اور سامنے والے جنگل میں داخل ہو گئے۔ کشمیری لیڈر نے کہا۔

”میل بڑا اندھیرا ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

میں نے کہا۔

”تمہاری طرف سے میں دیکھ رہا ہوں۔ قدم اٹھاؤ۔ سامنے جھاڑیاں ہی ہیں۔ ان

کے درمیان سے گزرتے جاؤ۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ جنگل واقعی بڑا خطرناک تھا۔ جھاریوں کے بعد درخت ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ گزرنے میں مشکل تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کہیں غلط راستے پر تو نہیں آگیا۔ لیکن ایک جگہ مجھے ستون کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی ایک کالی چٹان نظر پڑی۔ یہ چٹان ہماری کمانڈو پارٹی کو بھی ملی تھی اور ہم اس کے قریب سے گزرے تھے۔ میرا اٹھو بھال ہو گیا۔ اب مجھے یاد آگیا کہ ہمارا خفیہ ہائیڈ آؤٹ اس جنگل کے دوسرے کنارے پر تھا کچھ نیلے ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ ہم نے یہ گھنا جنگل قریباً آدھے گھنٹے میں طے کیا۔ یہ دھڑکا بھی مجھے لگا تھا کہ کسی طرف سے کوئی جنگی درندہ نہ نکل آئے۔ ان جنگلوں میں شیر اور چیتے کثرت سے پائے جاتے تھے لیکن خدا کا شکر رہا، راستے میں کوئی شیر چیتا نہ ملا اور ہم اپنے ہائیڈ آؤٹ کے پاس آگئے۔ دو نیلے بالکل ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ایک کی ڈھلان ختم ہوتی تھی تو دوسرے نیلے کی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی۔ ان کے پیچھے ایک جگہ کمانڈو خالد اور ان کے

ہے۔“

اس کا سانس پھول گیا تھا۔ بھارتی درندوں نے اسے اس قدر اڑھتیں دی تھیں، اتنا ٹارچر کیا تھا اور اتنے فاقے کرائے تھے کہ اس کے جسم کی آدمی طاقت ضائع ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ میں اللہ کا سپاہی ہوں، اللہ میری مدد کرے گا۔“

وہ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کیونکہ وہاں جھاڑیاں زیادہ گتیاں نہیں اور پگڈنڈیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یہ پگڈنڈیاں مجھے اندھیرے میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں اسے ان پر دوڑا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم فوجی کیمپ سے دور نکل جائیں۔ کیونکہ گاڑو سنتری کی لاش ملنے پر وہاں ہنگامی صورت حل پیدا ہو سکتی تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ ہانپنے لگا ہے تو میں نے اسے کہا۔

”غلام حسین! تھوڑی دیر رک جاؤ۔“

وہ وہیں بیٹھ گیا۔ شبنم گن اس نے زینن پر رکھ دی۔ میں نے کہا۔

”میں تمہیں صرف دو منٹ دیتا ہوں۔ اتنی دیر تم سانس لے لو۔ میں پیچھے جا کر

دیکھتا ہوں کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔“

میں اس کے کندھے سے اتر کر عقب میں نیلوں کی طرف نکل گیا۔ میں نے دو منٹ تک قریب کا علاقہ اچھی طرح سے دیکھ لیا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ کیمپ کی روشنیوں نیلے کی آؤٹ میں ہو گئی تھیں۔ میں جلدی جلدی کشمیری لیڈر کے پاس آگیا۔ اس کا سانس کچھ درست ہو گیا تھا۔ میں نے جلتے ہی کہا۔

”پیچھے سب ٹھیک ہے۔ اب چل پڑو۔“

میں اس کے کندھے پر آگیا۔ کشمیری لیڈر نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری کمانڈو پارٹی کا ہائیڈ آؤٹ کتنی دور ہے؟“

میں نے کہا۔

”زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں ہماری پارٹی کا شاید ہی کوئی آدمی ہو لیکن میں ہائیڈ

آئی کہ کشمیری لیڈر کے پاس لاری کا کرایہ نہیں تھا۔ اس کا حلیہ بھی مفرور قیدیوں والا تھا۔ میں سناپ کی شکل میں تھا۔ قصبے کے باہر ایک جگہ ایک لاری کھڑی تھی جس میں کچھ مسافر بیٹھے ہوئے تھے اور اوپر سملان لدا ہوا تھا۔ میں نے غلام حسین سے کہا۔

”دہلی چل کر کسی سے پوچھو کہ یہ لاری کہاں جا رہی ہے۔ بس تم صرف اتنا ہی پوچھنا۔ آگے کوئی بات نہ کرنا۔“

وہ لاری کے پاس آگیا۔ ایک ہندو لالہ جس نے ہندو لالوں کی طرح دھوتی باندھ رکھی تھی لاری کے آگے ڈرائیور کے پاس کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ کشمیری لیڈر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لالہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔

”بھوپال چلتے ہی گنگا دیوی سے کہنا کہ میری طرف سے بھگوان شو کے مندر میں پانچ سیر لٹو پجاریوں کو خود جا کر دے آئے اور لاری تیز مت چلاؤ۔ ابھی میں نے اس کی انشورنس نہیں کرائی۔ سمجھ گئے؟“

ڈرائیور نے بیڑی کا کس لگا کر کہا۔

”سمجھ گیا مالک۔“

”ہاں دو چار منٹ سوازیوں کو دیکھ لو۔ میں تو چل پڑا۔ زیادہ رات ہو جائے گی۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ لالہ اس لاری کا مالک ہے اور یہ لاری بھوپال جا رہی ہے۔ لالہ لاری سے ہٹ کر اڑے کی طرف جانے لگا تو کشمیری لیڈر سے پوچھا۔

”کیا بات ہے جی۔ بھوپال جانا ہے تو بیٹھ جاؤ لاری میں۔“

میں نے انسانی آواز میں لالہ سے کہا۔

”اوم نشو لا لالہ یہ آدمی میرا بھگت ہے۔ میں خوشی مہاراج کا سناپ ہوں۔“

اور یہ کہہ کر میں نے کشمیری لیڈر کے کندھے پر بیٹھے بیٹھے اپنا بچن پھیلا لیا۔ لالہ اس وقت لاری سے کوئی چھ سات قدم کے فاصلے پر ذرا اندھے میں تھا۔ لاری کا ڈرائیور لاری کی دوسری جانب کھڑا اپنے کلینر سے باتیں کر رہا تھا۔ لالہ نے ایک آدمی

ساتھیوں نے ایک خفیہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ میں وہاں ان کے ساتھ آچکا تھا۔ جب ہم خفیہ ٹھکانے میں داخل ہوئے تو وہ خلی پڑا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کشمیری لیڈر بیٹھ گیا۔

کہنے لگا۔

”میں تو کوئی نہیں ہے۔“

میں نے اسے بتایا کہ کمانڈو پارٹی میرا دو دن انتظار کرنے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں سے بھوپال روانہ ہو گئی ہوگی۔ وہ کہنے لگا۔

”بھوپال تو یہاں سے کلنی دور ہوگا۔“

میں نے کہا۔

”جتنی دور بھی نہیں ہے۔ آگے ایک قصبہ ہے جہاں سے لاریاں اور کیے بھوپال کی طرف جاتے ہیں۔ مگر ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔“

”تو پھر بھوپال کیسے پہنچیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

میں خود بخود سوچ رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر غور کیا اور پھر کہا۔

”غلام حسین! میرا خیال ہے ہمیں قصبے کی طرف ہی نکل جانا چاہیے۔ اگر ہم نے دیر کر دی اور فوجی کیپ میں تمہارے فرار کا کیپ کمانڈر کو علم ہو گیا تو پھر ہمارا بھوپال پہنچنا ناممکن ہوگا۔ کیپ کی پٹن اس علاقے کو گھیرے میں لے لے گی۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو پھر دیر نہ کرو کرم داد۔ ابھی نکل چلتے ہیں۔“

ہم نے بڑی تھکندی سے کام لیا تھا۔ ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ہم اسی وقت خفیہ ٹھکانے سے نکل کر قصبے کی سمت روانہ ہو گئے۔ جنگل ختم ہو گیا تھا اور اونچا نیچا میدان علاقہ اور کھیت شروع ہو گئے تھے۔ ہم میدانوں کو عبور کر کے کھیتوں میں سے گزرنے لگے۔ کچھ دیر رکنے کے بعد دور سے قصبے کی ٹہنیاتی روشتیاں دکھائی دینے لگیں۔ قصبے میں جا کر معلوم ہوا کہ ابھی رات کے گیارہ بجے بھی نہیں بجے۔ مشکل یہ پیش

”مکلی داس! یہ ہمارے مہمان ہیں، خاص مہمان ہیں۔ انہیں بڑے آرام سے اپنے ساتھ بٹھا کر بھوپال پہنچا دو۔“

ڈرائیور بولا۔

”مگر لالہ جی! فرنٹ سیٹ تو بک ہو چکی ہے۔“

لالہ جی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”جس کی سیٹ ہے اس کو پیسے واپس کر دو۔ میرے مہمان کو فرنٹ سیٹ پر بٹھاؤ۔“

ڈرائیور نے بہت اچھا لالہ جی کہہ کر کشمیری لیڈر سے کہا۔

”آ جاؤ جی۔۔۔۔۔“

میں اس دوران کشمیری لیڈر کی قیض کے اندر چھپ گیا تھا۔ کشمیری لیڈر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لالہ جی ہاتھ باندھے قریب آکر بولا۔

”مہاراج! مجھے کوئی سیوا چاہیے۔“

کشمیری لیڈر نے اپنی گھبراہٹ پر ہنسنے لگا۔

”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔“

ڈرائیور نے لاری سٹارٹ کر دی۔

جس وقت ہم بھوپال پہنچے رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لاری اڑے پر کشمیری لیڈر اتر گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

”جس طرف میں کوں اس طرف چلتے جانا۔“

یہ علاقہ میرا دیکھا بھلا تھا۔ رات کی تاریکی میری نگاہوں میں حائل نہیں ہو رہی تھی۔ میں اسے شہر سے باہر بارہ دری کے کھنڈر پر لے آیا۔ یہاں سے مکملہ خالد کی کہیں گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ جیسے ہی ہم کہیں گاہ کے پاس آئے دو آدمیوں نے اندھیرے سے نکل کر کشمیری لیڈر کو گھیر لیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟ کون ہو؟“

کے کندھے پر پھن دار سناپ کو دیکھا تو قہر قہر کانپنے لگا۔ میں نے کہا۔
”درو نہیں پالک! مجھے معلوم ہے تم بھی شوہی مہاراج کے بھگت ہو۔ مجھے شوہی نے تمہارے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ ہمارے اس بھگت کو اپنی لاری میں بھوپال پہنچا دو۔“

میرے لیے یہ اداکاری کئی کوئی مشکل نہیں تھی۔ میں ایسا بڑی آسانی سے کر سکتا تھا۔ میں سناپ کی شکل میں تھا۔ میں انسانوں کی آواز میں باتیں کر سکتا تھا اور یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندو شوہی مہاراج کو بھگوان کا ایک روپ مانتے ہیں اور شوہی مہاراج کے سر پر ہمیشہ ایک سناپ جٹاؤں میں پھن کھولے بیٹھا رہتا تھا۔

ہندو لالہ تو ہاتھ جوڑنے لگا۔ بولا۔

”مہاراج! میرے دھن بھاگ کہ میں شوہی مہاراج کے بھگتوں کی کوئی سیوا کروں۔“

میں نے کہا۔

”یہ بات کسی کو مت بتانا کہ تم نے شوہی مہاراج کے نام سے باتیں کی تھیں۔“

لالہ قہر قہر قہر آواز میں بولا۔

”مہاراج میں کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ پدھارے مہاراج!“

اس نے کشمیری لیڈر کے آگے ہاتھ باندھے کہہ کر کہا۔ میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔
”شوہی کے بھگت! ہم نے اپنا وطن پورا کر دیا۔ لالہ جی کی لاری میں بیٹھ کر بھوپال پہنچ جاؤ۔ چلو۔“

کشمیری لیڈر غلام حسین نے اس قسم کے مکالمے بھلا پہلے کہاں سنے ہوں گے۔ وہ ایک باعل مجاہد تھا اور دشمن سے جنگ کر رہا تھا۔ حیران ہو کر ہماری باتیں سنتا رہا۔ جب میں نے اسے لاری میں سوار ہونے کو کہا تو وہ جلدی سے لاری کی طرف چل پڑا۔ لالہ جی اس کے آگے آگے تھے۔ لالہ جی نے جاتے ہی ڈرائیور سے کہا۔

میں نے کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا خالد بھائی یہ میرے لیے مصیبت بھی ہے اور اس سے مصیبت دور بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب میں اس بار بار کی کیا پلٹ سے سخت تنگ آ چکا ہوں۔“

کمانڈو خالد بولا۔

”جس روز اللہ نے چاہا تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔“

میں نے اپنی بیوی جیلہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

”جیلہ بھائی تمہارے لیے بڑی پریکٹن تھی۔ لیکن میں نے اسے نہیں بتایا کہ تم فوجی ٹیپ میں رہ گئے ہو۔ میں نے یہی کہا کہ ایک ضروری کام سے تمہیں بھیجنا پڑ گیا ہے۔ اب تم بھی اسے یہی بتانا کہ تم بھیجے سے آئے ہو۔“

میں نے کہا۔

”کاش! میں آدمی کی شکل میں ہوتا اور کرم داد بن کر اس سے ملتا۔ سانپ بن کر ملنے سے جیلہ کو بھی دکھ ہوتا ہے۔“

کشمیری لیڈر غلام حسین میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”مجھے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میں ایک سانپ کو انسان کی آواز میں باتیں کرتے دیکھ رہا ہوں۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے کہ آپ دشمن کی قید سے رہا ہو کر ہمارے پاس آ گئے۔ جس طرح میں آپ کے سامنے بیٹھا آپ سے گفتگو کر رہا ہوں یقین کریں اسی طرح ہمارا مجاہد ساتھی کرم داد بھی آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔“

میں نے کشمیری لیڈر سے پوچھا۔

”اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

وہ بولا۔

میں نے اندھیرے میں ان لوگوں کو پہچان لیا۔ یہ ہماری کمانڈو پارٹی کے جوان تھے۔ ان میں کمانڈو ارشد بھی تھا۔ ان لوگوں نے مجھے سانپ کے روپ میں دیکھا ہوا تھا۔ میں جلدی سے کشمیری لیڈر کی قیض سے نکل کر اس کے کندھے پر آ گیا اور انسانی آواز میں کہا۔

”میں کرم داد ہوں! یہ کشمیری لیڈر غلام حسین ہے۔“

کمانڈو ارشد نے شین مگن نیچے کر لی اور کہا۔

”خدا کا شکر ہے تم لوگ غیریت سے بچ گئے۔ اندر آ جاؤ کمانڈو خالد جبرے میں ہے۔“

کمانڈو خالد جبرے میں سو رہا تھا۔ اسے ارشد نے جگا دیا اور کہا۔

”کرم داد! کشمیری لیڈر کو لے کر آ گیا ہے۔“

کمانڈو ارشد نے لائین کی حق اونچی کر دی۔ کمانڈو خالد آنکھیں ملتے ہوئے کشمیری لیڈر کو دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

”خالد بھائی! یہ ہمارا کشمیری لیڈر غلام حسین واسیں ہے۔“

کشمیری لیڈر سے بھی میں نے خالد کا تعارف کرایا۔ دونوں ایک دوسرے سے گلے لگ کر ملے۔

”کرم داد! تم نے کمال کر دکھایا کہ غلام حسین کو وہیں سے نکل کر لے آئے۔ ہم نے تمہارے مسئلے کی آواز سن لی تھی۔ سمجھ گئے تھے کہ تم کسی مشکل میں پھنس گئے ہو مگر ہم تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مجبوراً وہیں سے چل دیے۔ ہائیڈ آؤٹ میں آ کر ہم نے دو دن تک تمہارا انتظار کیا۔ جب تم نہ آئے تو واپس بھوپال آ گئے۔“

میں نے کمانڈو خالد کو اپنی ساری روئیدار سنائی تو وہ بولا۔

”اس دفعہ خدا نے تمہاری مدد کی تم عین وقت پر سانپ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔“

”میں جتنی جلدی ہو سکے واپس جانا چاہتا ہوں۔ کشمیر کے جہلو میں میرے ساتھیوں کو میری ضرورت ہے۔“
کمانڈو خالد کہنے لگا۔

”انشاء اللہ ہم آپ کو کل رات کو کشمیر کی طرف روانہ کر دیں گے۔ ہمارے دو کمانڈو آپ کی حفاظت کے لیے ساتھ جائیں گے۔“

اس وقت وہاں کھانا آگیا۔ کشمیری لیڈر کو ہم نے سیر ہو کر کھانا کھلایا، چائے پلائی وہ کہنے لگا۔

”ایک مدت کے بعد میں نے کھانا کھلایا ہے۔ انڈین آرمی نے مجھ پر ہر قسم کا تشدد کیا اگر کرم داد میری مدد کو نہ پہنچتا تو آج رات کے پچھلے پیر ان لوگوں نے مجھے شوٹ کر دیتا تھا۔“

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد کشمیری لیڈر کو ہم نے وہیں ایک طرف سلا دیا۔ کمانڈو خالد بھی سو گیا۔ میں کوٹے میں بیٹھا جاگتا رہا اور صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ دوسرے دن جب مجھ سے ملنے کے لیے آگئی۔ مجھے سناپ کے روپ میں دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی لیکن میری آواز سن کر اس کا چہرہ کھل گیا۔ کہنے لگی۔

”تم اکیلے بہت سی کیوں چلے گئے تھے؟ اگر راستے میں کوئی سپرہا تمہیں پکڑ لیتا تو میں کیا کرتی۔“

میں نے کہا۔

”میں اکیلا نہیں گیا تھا جبیلہ۔ اپنا ایک آدمی میرے ساتھ تھا۔“

جبیلہ دوپہر تک ہمارے پاس ہی رہی۔ پھر وہ کمانڈو خالد کی سسر کے ہاں چلی گئی۔ وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ پاکستان کب جانا ہوگا۔ میں نے اسے کہا کہ انشاء اللہ بہت جلد ہم پاکستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن میں جب تک جنگل کے کتنی باتیں والوں سے مسلمان خواتین کی بے حرمتی اور ان کے اغوا کا بدلہ نہیں لے لیتا میں پاکستان کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات میں نے جبیلہ کو نہیں بتائی تھی۔ کمانڈو خالد کو یہ

سب کچھ معلوم تھا۔

اسی روز رات کے اندھیرے میں کمانڈو خالد نے اپنے دو بڑے تجربہ کار اور تربیت یافتہ کمانڈوز کے ساتھ کشمیری لیڈر غلام حسین کو سری نگر کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔
”کرم داد بھائی! اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ میں کتنی باتیں سے بدلہ لیے بغیر پاکستان نہیں جاسکتا۔ میرا پلان یہ ہے کہ یہاں سے نکلتے جاؤں گا اور جہاں جہاں کتنی باتیں والے ہیں انہیں تلاش کر کے ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا اور اگر مجھے اغوا کی ہوئی کسی پاکستانی خاتون کا سراغ ملا تو میں اسے نکال کر اپنے ساتھ پاکستان لے جانے کی کوشش کروں گا۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

”تم کتنی باتیں والوں کو کہاں تلاش کرو گے۔ نکلے بڑا وسیع شہر ہے۔“

میں نے کہا۔
”اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے تین کتنی باتیں بد معاشوں کے ٹھکانے کا علم ہے۔ سب سے پہلے میں انہیں ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر دوسرے لوگوں کا سراغ نہ بھی ملا تو کم از کم ان بد معاشوں سے تو میں ضرورت بدلہ لوں گا جن کو میں دیکھ چکا ہوں اور جن کے ٹھکانے کا مجھے علم ہے۔“

”یہی بات ہے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

کمانڈو خالد کی اس بہادرانہ پیش کش پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

میں نے کہا۔

”تم میرے ساتھ ہو گے تو میرا کام آسان ہو جائے گا کیونکہ میں وہاں ہو بازار والے حاجی فرید صاحب کے ہاں نہیں ٹھہرنا چاہتا۔“
کمانڈو خالد کہنے لگا۔

”ہمیں کسی واقف کے ہاں ٹھہرنا بھی نہیں چاہیے۔ ہم ایک خطرناک اور خفیہ

باہر کا منظر بھی دیکھ سکو گے۔

اس نے مجھے اپنے کرتے کی بغل والی جیب میں چھپا لیا۔ میں چھوٹا سا بچہ تھا اس کی جیب میں آسانی سے آ گیا۔ دو کمائڈو مجاہد خالد کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ نشیون تک گئے۔ انہوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور چادروں کے اندر آٹوینک پستول چھپائے ہوئے تھے۔ ہمیں ریلوے نشیون پر پہنچا کر وہ واپس چلے گئے۔ بھوپال نشیون پر کلنی روٹن تھی۔ کلکتے جانے والی سواریاں پلیٹ فارم پر اپنے اپنے سالن کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ کمائڈو خالد بھی ایک محفوظ جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔ کلکتے جانے والی ٹرین لیٹ تھی۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد آئی۔ کلنی رش تھا۔ ہم ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔

ٹرین کلکتے کی طرف چل پڑی۔ یہ بھی کلنی لہسا سفر تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ دوسرے دن شام کے وقت ٹرین کلکتے کے ہاؤس جمنشن پر پہنچی۔ راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ کمائڈو خالد نے نشیون سے باہر آ کر ایک موٹر رکشا لیا اور اسے کسی جگہ چلنے کو کہل میں اس کی جیب میں ہی تھا۔ کبھی کبھی سر باہر نکل کر باہر کا منظر دیکھ لیتا تھا۔ موٹر رکشا کلکتے کے باروٹ بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ اس شہر سے میری تھوڑی بہت واقفیت ہو چکی تھی۔ مگر یہ اتنا بڑا شہر تھا کہ میں نے ابھی تک کسی سڑک کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے کمائڈو خالد کی جیب میں سے سر تھوڑا سا باہر نکالا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رکشا شرکی آبادی سے باہر آ گیا ہے۔ غارتوں کی روشنیاں دور ہو گئی تھیں۔ مجھے ہوا میں دریا کی خوشبو آئی۔ شاید رکشا دریا کے قریب سے گزر رہا تھا۔ پھر خالد نے ایک جگہ پہنچ کر رکشا روکوا لیا اور ڈرائیور کو کرایہ دینے کے بعد ایک طرف چل پڑا۔ میں نے پوچھا۔

”یہ کلکتے کا کون سا علاقہ ہے کمائڈر؟“

اس نے مجھے جیب سے نکال کر اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا۔ کہنے لگا۔

”یہ دریائے گنگی کا جنوبی علاقہ ہے۔“

اس نے مجھے اس علاقے کا نام بھی بتایا تھا جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ وہاں

مشن پر جا رہے ہیں۔ وہاں ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔ ہم اسی کے پاس ٹھہریں گے۔“

میں نے کہل۔

”تو پھر اسے تم آج ہی اطلاع کر دو۔ ہم کل یہاں سے چل پڑیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے مزید دیر کر دی تو ہو سکتا ہے کہ کتنی باہنی کے بد معاش کلکتے سے کسی دوسرے شہر چلے جائیں۔“

کمائڈو خالد بولا۔

”ٹھیک ہے ہم کل شام کو جانے والی گاڑی چکڑیں گے۔“

”میں جیل کو بتائے بغیر اس مشن پر جانا چاہتا ہوں۔“

کمائڈو خالد نے کہل۔ ”اوکے“ میں اسے کہہ دوں گا کہ ہم پاکستان جانے کے سلسلے

میں ایک آدمی سے ملنے امرتسر جا رہے ہیں۔“

ہم نے کلکتے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کمائڈو خالد نے بنگالیوں کا پستول ادھوتی کرتے پین لیا۔ موسم بھوپال میں بھی بدلنے لگا تھا۔ سردی کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ بنگال میں باقاعدہ گرمیوں کا موسم تھا۔ کمائڈو خالد نے جیلہ کو شام کے وقت پیغام بھجوایا کہ مجھے اور کرم دلو کو پاکستان جانے کی تیاریوں کے سلسلے میں ایک آدمی سے ملنے امرتسر جانا پڑ گیا ہے۔ دو ایک روزیں واپس آ جائیں گے۔ ظاہر ہے جیلہ سوائے مبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ بات میں خود اسے کہوں گا تو وہ مجھے کبھی جانے نہیں دے گی۔

شام کے ساڑھے چھ بجے میں اور کمائڈو خالد اپنی خفیہ کمین گھ سے نکل پڑے۔ بنگالی لباس میں وہ بالکل ہندو بنگالی لگ رہا تھا۔ ایک آٹوینک پستول اس نے اپنی ادھوتی کے اندر چھپا کر رکھ لیا تھا۔ میں اس کی بنیان کے اندر چھپنا چاہتا تھا لیکن کمائڈو خالد نے کہل۔

”بنیان کے اندر تم پر کسی نہ کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ میں تمہیں کرتے کی جیب میں چھپا لوں گا۔ اس طرح تمہیں ہوا بھی لگتی رہے گی اور تم جیب میں سے سر نکال کر

خلد بولا۔

”وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ تم دروازہ بند کر دو۔“

میزبان نے دروازہ بند کر دیا اور بڑی عجیب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کنکڑو! کہاں ہے تمہارا ساتھی؟“

کنکڑو خلد نے جیب سے مجھے نکال کر اپنی ہتھیلی پر بٹھایا اور بولا۔

”یہ ہے ہمارا ساتھی۔“

میزبان کا نام کنکڑو خلد نے مجھے بتا دیا تھا، وہ نام میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ

اس کا نام حیدر رکھ لیں۔ حیدر ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ سنپ تم نے کب سے پہلے شروع کر دیے ہیں؟“

کنکڑو خلد نے کہا۔

”یہ سنپ نہیں ہے۔ غور سے دیکھو۔“

حیدر میری طرف غور سے دیکھ کر بولا۔

”کیا بچوں ایسی باتیں کرتے ہو کنکڑو! یہ سنپ ہی تو ہے۔ خدا کے واسطے اسے

باہر پھینک آؤ۔ تمہیں دس لے گا۔“

کنکڑو خلد نے مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا اور کہنے لگا۔

”پہلے مجھے کھانا کھاؤ، چائے پلاؤ اور میرے دوست سنپ کے لیے دودھ لاؤ۔ پھر

اطمینان سے ساری باتیں ہوں گی۔“

حیدر حیرت سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں سب کچھ ابھی لے آتا ہوں مگر خدا کے لیے اس سنپ سے بچ کر رہنا۔“

میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ میں نے خلد سے کہا۔

”کنکڑو! کیا تم اسے میرے بارے میں بتا دینا چاہتے ہو؟“

”ہاں“ خلد بولا۔ ”اے تمہارے بارے میں سب کچھ بتائے بغیر ہم اپنے مشن

خلد کی خفیہ اسلامی تنظیم کا آدمی رہتا تھا۔ آگے ایک چھوٹی سی مضائقہ بستی آگئی۔

اس وقت تک رات ہو گئی تھی مگر یہ علاقہ کسی جنگل کا علاقہ نہیں تھا۔ لگاتار ایسے بڑے

شہر کا مضائقہ علاقہ تھا۔ ہم ایک پکی سڑک کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ یہ کوئی کلائی

تھی۔ کلائی کی روشنیں قریب ہو رہی تھیں۔ کنکڑو خلد ایک جگہ سڑک سے اتر کر

ٹاریل کے درختوں کے درمیان سے گزرنے والی پگڈنڈی پر ہو گیا۔ وہاں زیادہ اندھیرا

نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر بجلی کے کھمبوں پر بجلی کے بلب روشن تھے اور ان کی روشنیں

وہاں تک آ رہی تھیں۔ ہم کلائی میں داخل ہو گئے تھے۔ درمیانے درجے کی کلائی

تھی۔ پرانی پرانی عمارتیں تھیں۔ بازار میں دکانیں اور معمولی قسم کے سٹور بھی تھے۔

ایک جگہ پان کی دکان تھی وہاں سے ہنگہ گانے کی آواز آ رہی تھی۔ کنکڑو خلد ایک

تنگ بازار میں سڑ گیا اور پھر ایک پلازہ میں داخل ہو کر اس کی بیڑھیاں چڑھنے لگا۔

دوسری منزل میں ایک لمبی سی گیلری یا راہ داری تھی۔ ساتھ ساتھ کمرے تھے۔

خلد نے ایک دروازے کے پاس آ کر کھٹکی کا ٹن دیا۔ دوسری بار کھٹکی بجاتے

ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

”میں اپنا ایک بڑا ہولور بیلر رہتا ہے۔“

کلائی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے مجھے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ میں کچھ

کہنے لگا تھا کہ خلد نے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ کسی نے دروازہ کھول دیا۔ خلد کے

کرتے کی جیب میں سے سارا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک درمیانے قد کے مضبوط جسم

والے گورے پٹے آدمی نے دروازہ کھولا تھا۔ اس نے اپنے سامنے خلد کو دیکھا تو بولا۔

”اندر آ جاؤ۔ ساتھ کوئی اور تو نہیں ہے؟“

کنکڑو خلد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”ایک آدمی ہے۔“

میزبان وہیں رک گیا۔ بولا۔

”اسے بھی اندر بلاؤ۔ باہر مت کھڑا رہنے دو۔“

پوچھو۔

”کیا پوچھوں؟“ حیدر نے تعجب سے کہا۔

”یہی پوچھو کہ اے سناپ! تمہارا نام کیا ہے اور تم کون ہو؟“

حیدر زنج ہو کر بولا۔

”خدا کے لیے یہ فضول باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ گلگتے کیسے آتا ہوا؟ کیا کسی

خاص مشن پر آئے ہو؟“

کمانڈو خالد نے کہا۔ ”پہلے تم میرے سناپ سے اس کا نام پوچھو پھر تمہیں بتاؤں گا

کہ میں کس مشن پر آیا ہوں۔ یہ میری شرط ہے۔“

حیدر نے تنگ آ کر مجھ سے پوچھا۔

”بھائی سناپ تم سناپ ہی ہو۔ میں جانتا ہوں تم مجھے کچھ نہیں بتا سکو گے لیکن

میں اپنے دوست کی شرط پوری کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟“

میں نے دودھ پیتے ہوئے پیالی میں سے سر اٹھا کر حیدر کی طرف دیکھا اور کہا۔

”میرا نام کرم داد ہے۔ میں پاک آری کا سابق کمانڈو ہوں اور کمانڈو خالد کے

ساتھ ایک اہم ترین مشن پر گلگتے آیا ہوں۔“

ایک سناپ کو آدی کی آواز میں باتیں کرتے دیکھ کر میں بیان نہیں کر سکتا کہ

حیدر کی کیا حالت ہوئی تھی۔ آج بھی اس آدی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے

تو میری بے اختیار ہنسی لگ جاتی ہے۔ وہ اس بچے کی طرح حیران پریشان کھڑا تھا جس

کے ہاتھ سے چلو کے زور سے اچانک اس کا کھلونا غائب ہو گیا ہو۔ کمانڈو خالد نے ہنس

کر پوچھا۔

”اب بتاؤ یقین آیا کہ نہیں۔“

وہ کبھی میری طرف دیکھتا کبھی خالد کی طرف دیکھتا کہنے لگا۔

”کمانڈو! مجھے یقین آ گیا ہے لیکن یقین نہیں آ رہا کہ ایک سناپ انسان کی طرح

بھی بول سکتا ہے۔“

میں کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ حیدر ہمارا بڑا اہم ترین ساتھی مجاہد ہے۔ یہ گلگتے

میں ہماری خفیہ اسلامی تنظیم کا سرگرم مجاہد ہے۔ بھوپال کا پٹھان ہے۔ دس برس سے

گلگتے میں رہ رہا ہے۔ اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہے۔“

کچھ دیر بعد حیدر ہمارے لیے کھانے کا سامان لے کر آئید۔ ایک پیالی میں میرے

لیے دودھ بھی لے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

”یار خالد! پہلے اپنے اس لاڈلے سناپ کو دودھ پلا کر باہر کسی جگہ چھوڑ آؤ، پھر

بیٹھ کر اطمینان سے کھانا کھائیں گے۔ میں نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔“

کمانڈو خالد نے مجھے کلائی سے اتار کر پیٹنگ پر بٹھا دیا اور دودھ کی پیالی میرے آگے

رکھ کر کہا۔

”کرم داد! اب بھائی تھوڑا سا دودھ پی لو۔“

حیدر بولا۔

”اچھا تو تم نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہوا ہے۔“

خالد نے کہا۔

”میں نے نہیں رکھا۔ بھائی اس کا نام ہی کرم داد ہے۔ یہ پاک آری کا سابق

کمانڈو ہے اور ہماری تنظیم کا بڑا جیالا رضا کار ہے۔“

میں نے دیکھا کہ حیدر ایسی نظروں سے خالد کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے خالد کی

ذہنی صحت پر شبہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگا۔

”خالد! تم اپنے جوش و حواس میں تو ہو؟ یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ میں

دیکھ رہا ہوں، تم بھی دیکھ رہے ہو کہ یہ ایک سناپ ہے۔ پھر یہ پاک آری کا سابق

کمانڈو کہاں سے بن گیا؟ اور اس کا نام کرم داد کیسے ہو گیا؟“

کمانڈو خالد پورا ڈرامہ کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے منہ ڈالے پیالی میں سے دودھ

پی رہا تھا۔ خالد نے حیدر سے کہا۔

”اچھا بھائی حیدر اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو خود اس سے پوچھ لو۔“

خالد نے پوچھا۔

”اپنی تنظیم کے دوسرے مجاہدوں کا کیا حال ہے؟“

حیدر نے کہا۔

”سب اپنی اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں کلی گھٹ کے علاقے میں ہندوؤں نے ایک مسجد میں بم پھینک کر دو نمازیوں کو شہید کر دیا تھا۔ ہم نے ان انتہا پسند ہندوؤں کا سراغ لگا کر انہیں ان کے گھروں کے اندر جا کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد کلی گھٹ کے علاقے میں بالکل امن ہو گیا۔ بلکہ شہر میں بھی کسی مسجد میں اس قسم کی واردات دوبارہ نہیں ہوئی۔“

”ہمارا مشن بھی یہی ہے“ خالد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہم بھارت میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ہم حکومت کے باغی نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کو بھی اسمن اور خود اختیاری کے حقوق کے ساتھ رہنے کی سہولیات دی جائیں۔“

حیدر نے میری طرف دیکھا۔

”کرم دانا کیا تم میری بات سن رہے ہو؟“

میں نے کہا۔

”کیوں نہیں۔ تم بولو“ میں سن رہا ہوں۔“

وہ ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

”خدا جانے کیوں مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ تم سناپ نہیں انسان ہو۔“

خالد نے کہا۔

”تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

حیدر نے مجھ سے سوال کیا۔

”کیا تمہیں یاد ہے تم جب ڈھاکہ سے فرار ہو کر نکلتے آئے تھے تو کون سے علاقے میں کتنی باغی والوں سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟“

اب میں نے اس کو مخاطب کیا اور کہا۔

”حیدر بھائی! میں صرف انسان کی طرح بول ہی نہیں سکتا بلکہ انسانوں کی طرح محسوس بھی کرتا ہوں۔ انسانوں کی طرح سوچتا بھی ہوں اور سنتا بھی ہوں۔ میں اصل میں تمہاری طرح کا انسان ہوں۔ میرے ساتھ ایک حلوہ ہوا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر ایک ظلم کا اثر ہو گیا ہے اور مجھ پر دورہ پڑتا ہے جس سے میں انسان سے سناپ اور سناپ سے واپس انسان کی شکل میں آ جاتا ہوں۔“

”تو کیا تم سناپ سے انسان بھی بن سکتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”بن سکتا نہیں بس بن جاتا ہوں۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ جب تک مجھ پر ظلم کا اثر رہتا ہے میں سناپ کی شکل میں رہتا ہوں جب اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے تو سناپ سے اپنی اصلی انسانی شکل اختیار کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد جب پھر ظلم کا اثر زور پکڑتا ہے تو میں اجانک سناپ بن جاتا ہوں۔“

”حیرت کی بات ہے۔ بھی اس قسم کی بات دیکھی نہیں۔“

کمانڈو خالد بولا۔

”اب تو دیکھ لی ہے ناں۔ آؤ بیٹھو۔ پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر تمہیں بتاتے ہیں کہ

ہم دونوں کمانڈو کلکتہ کس مشن پر آئے ہیں۔“

میں بٹنگ پر بیٹھا رہا۔ تھوڑا سا دودھ میں نے پی لیا تھا۔ دونوں کمانڈو مجاہد کھانا کھاتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو خالد نے حیدر کو وہ سب کچھ بتا دیا جس کے لیے ہم کلکتہ آئے تھے۔ اس نے اسے میری زندگی کے پس منظر اور تمام واقعات سے بھی آگاہ کر دیا۔ حیدر نے باتیں شروع کرنے سے پہلے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر دیکھ لیا تھا اور پھر اندر سے کنڈی لگا دی تھی۔ کہنے لگا۔

”ڈھاکہ قتل کے بعد وہاں سے کئی پاکستانی بھارت میں داخل ہوئے ہیں۔ پولیس

ان کی تلاش میں رہتی ہے اور پھر تم جانتے ہو کہ ہمیں بہت چوکنا ہو کر رہنا پڑتا ہے۔“

حیدر کے کمرے یا کھولی کے بند دروازے کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر راہ داری میں کوئی شخص دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہماری باتیں سن رہا ہے۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”اسی طرح باتیں کرتے ہو۔ موضوع بدل لو۔“

یہ کہہ کر میں پلنگ سے اتر کر دروازے کی طرف ریختے لگ۔ مکناؤ خالد فوراً سمجھ گیا کہ باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ اس نے حیدر سے کہا۔

”یار گلے میں اس بار زیادہ گرمی ہے۔ شاید بارشیں جلدی شروع ہو جائیں۔“

اس وقت تک حیدر بھی سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

”تمہارے لیے چائے اور پکاوڑ؟“

میں نے دروازے کے ایک سووارخ میں سے سر باہر نکل کر دیکھا۔ باہر راہ داری میں معمولی سی روشنی تھی۔ میں نے آدھی کو دیکھا جو دروازے کے ساتھ سر لگائے جھک کر کھڑا تھا اور دروازے کی کسی درز میں سے اندر بھی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اندر جو باتیں ہو رہی تھیں انہیں سننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ یہ اٹلی جینس کا آدھی ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بہت سی باتیں سن لی تھیں۔ مجھ سے اور تو کچھ نہ ہو سکا۔ میں نے باہر نکل کر اس کے پاؤں پر ڈسے لگا تو مجھے خیال آ گیا کہ یہاں ایک پولیس کے آدھی کی لاش کا پلایا جانا حیدر کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ میں تیزی سے واپس کمرے میں گھس گیا اور ایک طرف چھپ گیا تاکہ اٹلی جینس کا آدھی دروازے کی درز میں سے مجھے نہ دیکھ سکے۔ میں نے خالد سے کہا۔

”مکناؤ! باہر ایک آدھی دروازے کے ساتھ لگا تمہاری ساری باتیں سن رہا ہے۔“

مکناؤ خالد نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے میری بات بالکل نہیں سنی۔ وہ حیدر سے گلے کی بارشوں اور قسمی دنیا کی ایکٹرسوں کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر موضوع بدل دیا تھا۔ میرے خروار کرنے پر تو وہ اور زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ اتنے میں حیدر چائے کے خلی برتنوں والا ٹرے لے کر اٹھا اور دروازے کی طرف

مجھے وہ علاقہ یاد تھا۔ میں نے اسے اس علاقے کا نام بتا دی اور اس چھوٹے چائے خانے کا نام بھی بتا دیا جس کے پچھلے کمرے میں ایک کتبی ہاتھی والے نے مجھے میری بیوی جیلہ کا پتہ بتایا تھا۔ حیدر نے مکناؤ خالد سے کہا۔

”وہ اس محلے میں بڑا بدنام علاقہ ہے۔ بنگہ دیش بننے کے بعد وہاں کتبی ہاتھی نے انڈین آرمی کے ساتھ مل کر غیر ملکی پاکستانیوں پر جو ظلم و ستم کیا تھا اور عورتوں کو اغوا کر کے لائے تھے تو ان عورتوں کو زیادہ تر اسی علاقے میں فروخت کیا جاتا تھا۔“

خالد نے کہا۔

”میں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں جتنے بھی کتبی ہاتھی والے آتے جاتے رہتے تھے وہ اس وقت کہاں کہاں پر ہیں۔ ہم ان میں سے ہر ایک کو موت کے گھاٹ اتارنے کا مشن لے کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہیں اپنے ذرائع سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ جو عورتیں مشرقی پاکستان سے اغوا کی گئی تھیں اگر ان میں سے کچھ ابھی تک گلے میں ہیں تو وہ کہاں کہاں ہیں۔“

حیدر پینک سے پیالیوں میں چائے انڈھلتے ہوئے کہنے لگا۔

”انشاء اللہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ لیکن تمہیں یہاں میری کھولی میں نہیں رہنا ہو گا۔ یہاں تم پولیس کی نظروں میں آ جاؤ گے۔ اس علاقے میں پولیس اٹلی جینس کے آدھی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔“

خالد نے کہا۔

”ہم دریا کے پرانے گھاٹ والی جگہ پر چلے جائیں گے۔ وہ جگہ ابھی تمہارے پاس ہی ہے؟“

”ہاں، وہ ہمارے پاس ہی ہے۔ رات کو تم یہاں آرام کرو۔ صبح صبح میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔“

اچانک مجھے دروازے کے باہر کسی آدھی کی نئی نئی بو محسوس ہوئی۔ سانپ ہونے کی وجہ سے مجھے آتے جاتے آدمیوں کی بو آ جاتی تھی۔ لیکن یہ ایسی بو ایسی تھی کہ جو

"میں نے اسے بنگلہ پولیس انسپکٹر کے ساتھ کڑوالے ہوٹل میں اکثر دیکھا ہے۔"
 "پھر تمہارا کیا خیال ہے؟" خالد نے پوچھا۔
 حیدر کہنے لگا۔

"پیشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایسا تو یہاں ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہاں کوئی اجنبی بلڈنگ کے کسی کمرے میں آ جائے تو سی آئی ڈی اس کا ضرور پیچھا کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ہماری باتیں نہیں سنی ہوں گی۔"
 میں نے کہا۔

"اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"
 مکناؤ خالد کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں صبح ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسی وقت یہاں سے دریا کے پرانے ٹکٹ والے ہائیڈ آؤٹ میں چلے جانا چاہیے۔"

حیدر بولا۔

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تم نے وہ جگہ تو دیکھی ہی ہوئی ہے۔ تم کرم داد کو لے کر وہاں جاؤ۔ میں کل کی دقت تمہیں وہیں آ کر ملوں گا۔ اس دوران میں مکتی ہاتھی والوں کی سرخ رسانی کرنے کی بھی کوشش کروں گا۔"

مکناؤ خالد نے مجھے اٹھا کر جب میں رکھ لیا حیدر اٹھ کر دروازے تک گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ اندر آ کر بولا۔

"گیلری میں کوئی نہیں ہے۔ تم نکل جاؤ۔"

مکناؤ خالد مجھے لے کر کمرے سے نکل آیا۔ بلڈنگ کے باہر آ کر اس نے کلاونی کی اس سڑک پر چلنا شروع کیا جو باہر کیمٹوں کی طرف جاتی تھی اور جن کے آگے دریاے ہنگی کا کنارہ آ جاتا تھا وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا تاکہ کسی کو اس پر شک نہ گزرے اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کرم داد کیا تمہیں پیچھے کسی اجنبی کی بو آ رہی ہے؟"

برہما میں بھی اندھیرے میں سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھا اور حیدر کے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی دروازے کے باہر نکل چکا تھا۔ میں نے اس آدمی کو گیلری میں اس طرف تیز تیز قدموں سے جلتے دیکھا جہاں میزبیاں پہلی منزل کو اترتی تھیں۔
 حیدر بھی رُے ہاتھ میں لیے گیلری میں آگیا۔ میں نے اسے اس آدمی کا حلیہ بتایا اور کہا کہ وہ میزبیاں کی طرف بھاگ گیا ہے۔ حیدر نے مجھ سے کہا۔

"خدا کے لیے تم اندر چل کر بیٹو۔"

میں اندر آگیا۔ خالد پرانے صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیدر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔
 مکناؤ خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"کون تھا وہ آدمی؟"

میں نے کہا۔

"مجھے اٹلی جینس کا آدمی لگتا تھا۔ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ مجھے اس کی بو آگئی تھی۔"

حیدر نے کہا۔

"تمہاری اس خصوصیت کا مجھے ابھی تک علم ہی نہیں تھا۔ اس سے تو بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہر انسان کی ایک خاص بو ہوتی ہے۔ سناپ آدمیوں کے درمیان ہو تو اسے یہ بو نہیں آتی لیکن اگر کوئی سناپ کسی کے پاس زیادہ دنوں تک رہے یا اسے کسی آدمی کے جسم کا اترا ہوا کپڑا سٹھکا دیا جائے تو اسے وہ بو یاد رہتی ہے اور جہاں سے وہ بو آ رہی ہوگی وہ اس کی تلاش میں اسی طرف جائے گا۔"

خالد نے کہا۔

"ابھی حیدر آکر بتائے گا کہ وہ آدمی کون ہو سکتا ہے۔"

حیدر نے آکر بتایا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہی تھا اور اس کا نام مراری تھا۔

”یہ ہماری عارضی اور ابرجی پناہ گاہ ہے۔ ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو ہم یہاں آکر چھپ جاتے تھے۔ یہاں سے کوئی نہیں گزرتا۔“

اس نے دیوار میں ٹٹول کر ایک جگہ سے ہاتھ اٹھائی۔ دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیے اور ہاتھ جلا دی۔ اس کی روشنی میں مجھے کوٹے میں مٹی کی تھالی میں ایک موم بتی نظر آئی جس کے نیچے کالی موم جی ہوئی تھی۔ خالد نے موم بتی روشن کر کے کوٹے میں ہی رہنے دی۔ دیوار کے ساتھ بانس کی چارپائی چھپی ہوئی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھے جب سے ٹٹول کر چارپائی پر ایک طرف رکھ دیا اور کہنے لگا۔

”مجھے یقین ہے حیدر کل کبھی باہنی والوں کا ٹھیک ٹھیک سراغ لگا کر آئے گا۔“

میں نے کہا۔

”اگر اس نے دیر کر دی تو مجھے خود وہاں جانا پڑے گا۔“

خالد بولا۔

”میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔“

میں نے کہا۔

”تم میرے ساتھ نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ میں تو اوہر اوہر چھپ کر اپنا بچاؤ کر سکتا ہوں مگر تم پر اگر کسی کو ذرا ساجھی شک پڑ گیا تو تمہارے لیے وہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ لوگ بوڑے قاتل بد معاش قسم کے لوگ ہیں۔“

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

”دوست کرم دلو! ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا ہے تو اب ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے۔“

یہ بات اس نے کچھ ایسے جذباتی لہجے میں کہی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بھی جذباتی ہو گیا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں انسان کے روپ میں نہیں تھا۔ سانپ کے روپ میں تھا۔ میں نے کہا۔

”کمانڈو! تم واقعی میرے سچے دوست ہو۔ تم میرے ساتھ ہی چلو گے۔ آگے جو

میں نے جیب سے گردن پہلے ہی باہر نکل ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

”نہیں کمانڈو! پیچھے کوئی آدمی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا۔“

یہ سن کر کمانڈو خالد نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کہنے لگا۔

”اب یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں، اچھا ہے۔“

ہماری دائیں جانب کلکتہ شہر کی اونچی اونچی عمارتوں کی روشنیاں جگمگاتی تھیں اور بانس جانب اندھیرا تھا اور کالی فاسلے پر کچھ روشنی کے نقطے جھلما رہے تھے۔ خالد کہنے لگا۔

”ہماری بانس جانب دریا ہے، کلکتہ کا سب سے بڑا دریا ہنگلی۔ یہ جو دور

دور تمہیں عثمانی روشنیاں نظر آ رہی ہیں یہ دریا پار کے کارخانوں کی روشنیاں ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”پرانے گھاٹ والی خفیہ کمین گاہ یہاں سے کتنی دور ہے؟“

اس نے کہا۔

”زیادہ دور نہیں ہے۔“

پھر بھی وہ کچھ نہیں تو آدھ گھنٹے تک چلا رہا۔ اب ہم دریا کے کنارے پر آ گئے تھے۔ اندھیرے میں مجھے دریا کا چوڑا پات صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دور دریا کے دوسرے کنارے سے کسی سینئر کے دسل کی دو بار آواز سنائی دی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ دو تین فرلانگ تک دریا کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد کمانڈو خالد نیچے نشیب میں اتر گیا۔ یہاں اتنی لمبی لمبی گھاس تھی کہ خالد اس میں چھپ گیا۔ دیر تک وہ اسی گھنی گھاس میں چلتا رہا۔ گھاس کا میدان ختم ہو گیا۔ میں چونکہ اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا مجھے میں مجھیں قدموں کے فاسلے پر ایک عمارت کے کھنڈر نظر آئے۔ دیواریں ٹوٹی پھوٹی تھیں، جبکہ جگہ اینٹیں پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف چار دیواری کھڑی تھی۔ خالد اسی طرف آ گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کھولی تھی جس کے دروازے کے پت آدھے کھلے تھے وہ اندر داخل ہو گیا۔ کہنے لگا۔

ہوگا دیکھا جائے گا۔

رات ہم نے اسی کھولی میں گزار دی۔ اگلے روز سورج غروب ہونے کے وقت ہمارا ساتھی حیدر آگیا، کہنے لگا۔

”دو آدمیوں کا میں نے سراغ لگا لیا ہے۔ یہ دونوں کلکتے کے ہندو بنگالی ہیں۔ ایک کا نام دھلیا ہے، دوسرے کا نام رلیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں یہ کتنی ہائی والوں کے ساتھ گئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے غیر بنگالی مسلمانوں کا بہت سا مال اسباب لوٹا اور ایک عورت کو بھی اغوا کر کے ساتھ لے آئے تھے۔ دونوں کھلی گھاٹ کے پاس ایک کھال خانے کے اوپر رہتے ہیں۔ وہیں کام کرتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”یہ کھال خانہ میں نے دیکھا ہوا ہے۔ جس مسلمان غیر بنگالی عورت کو یہ اغوا کر کے لائے تھے وہ کہاں ہے؟“

حیدر بولا۔

”یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس ہی ہو۔“

خالد کہنے لگا۔

”اس عورت کا پتہ چلانا بہت ضروری ہے؟“

میں نے کہا۔

”وہاں چلو تو سہی، وہ خود سب کچھ بتا دیں گے۔“

حیدر نے کانٹو خالد سے کہا۔

”خالد بھائی تمہیں اپنے ساتھ کوئی اسلحہ وغیرہ ضرور رکھنا ہوگا۔“

اس نے کہا۔

”میرے پاس ایک آلوٹیک پتول موجود ہے۔“

حیدر تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ جب ذرا شام کا اندھیرا ہو گیا تو خالد کہنے لگا۔

”میں نے وہ کھال خانہ یعنی شراب کا اڈہ نہیں دیکھا ہوا۔ تم میری راہ نمائی کرنا۔“

میں وہاں جا کر یہ ظاہر کروں گا کہ میں شراب پینے آیا ہوں۔“

حیدر نے ہمیں دونوں کتنی ہائی کا حلیہ بتا دیا تھا جس کو میں نے اپنے ذہن میں بیٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد کانٹو خالد نے مجھے اپنی جیب میں ڈالا اور ہم کھولی میں سے باہر آ گئے۔ کھولی کے چوک میں آ کر خالد ایک بس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس کھلی گھاٹ کو جاتی تھی۔ وہاں سے کھلی گھاٹ کھلی دور تھا۔ کلکتہ شہر کے مغربی کنارے پر یہ علاقہ تھا۔ کہیں آبادی تھی اور کہیں خالی پلاٹ پڑے تھے۔ خالد نے مجھ سے پوچھا۔

”میں شراب خانہ کہاں ہوگا؟“

میں جیب میں سے گردن نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”کسی غریب مزدور ٹاپ آدمی سے پوچھو، وہی بتائے گا۔“

ایسا ایک آدمی نظر آگیا۔ خالد نے اس سے شراب خانے کا پوچھا تو وہ بولا۔

”رلیا دھلیا کا کھال خانہ کنوایو۔ وہ سامنے ناریل پٹی میں ہے۔“

ناریل پٹی سے مطلب وہ جگہ تھی جہاں ناریل کے درختوں کی قطار تھی۔ خالد کہنے لگا۔

”کرم دادا! تم میری جیب میں ہی رہنا، باہر مت نکلتا کہیں سارا کام الٹ پلٹ نہ ہو جائے۔“

میں نے اس سے کہا۔

”مجھے اپنی جیب میں رکھو گے تو مجھے کچھ نظر نہیں آئے گا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔“

تم ایسا کرنا کہ شراب خانے میں داخل ہونے کے بعد مجھے اندھیرے میں کسی جگہ چھوڑ دینا۔ اس طرح میں حالات کا جائزہ بھی لے سکوں گا اور تمہاری مدد بھی کر سکوں گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

خالد ناریل پٹی کی طرف بڑھ گیا۔

ناریل کے نیچے میڑھے درختوں کے درمیان ایک بڑا سا جھونپڑا تھا جہاں مزدور اور محنت کش قسم کے بنگالی شراب میں اپنی مغلی کو ڈوبنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خالد نے کہا۔

”نہیں رلیا بھیا! ابھی نہیں۔ پہلے کام کی بات ہو جائے۔“

کام کی بات رلیا نے خود ہی آسان کر دی۔ خالد کی طرف جھک کر بولا۔

”ہاؤ! لونڈیا چاہیے تو ایک گھنٹے کے پورے ایک سو روپے لوں گا۔ ہاں۔ مگر لونڈیا

تکینے ایسی ہوگی۔“

خالد نے آہستہ سے کہا۔

”دادا! اگر ڈھاکہ سے لایا ہوا کوئی مال ہو تو وہ دکھاؤ۔ پسند آگیا تو دو سو روپے بھی

دے دوں گا۔“

رلیا نے خالد کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

”اے ہاؤ! ڈھاکہ سے لایا ہوا مال ہی ہے۔ بس ایک ٹک باقی رہ گیا ہے۔“

تب کمانڈو خالد نے دھلیا کے ہارے میں پوچھا کیونکہ اس کا آنا پتہ معلوم کرنا بھی

ضروری تھا اس نے کہا۔

”سنا ہے دھلیا کے پاس بڑا اچھا مال ہے۔“

رلیا نے دھلیا کو بنگلہ میں لگلی دی اور کہا۔

”اس سالے کے پاس مال کمال سے آئے گا۔ ایک بوڑھی عورت چٹاگانگ سے

پکڑ کر لایا تھا وہ نکلتے چپختے ہی مر گئی۔“

خالد نے کہا۔

”دھلیا اگر خود مجھے کہہ دے کہ میرے پاس ڈھاکہ کا کوئی مال نہیں ہے تو میں

تم سے ہی بات طے کر لوں گا۔ یہ تو ایک سو روپے پیٹگی۔“

اور خالد نے ایک سو روپے نکال کر رلیا کو دے دیے۔ وہ دھلیا کو لانے کے لیے

مجبور ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”دھلیا سالے کو بھی وہیں بلوا لوں گا۔ بے شک پوچھ لیتا اس کے پاس تو کچھ

بھی نہیں ہے۔ بولو ابھی چلو گے یا دارو پینے کے بعد چلو گے؟“

لوگ بڑی تیز بنگلہ زبان میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ شراب خانہ خلاف قانون نہیں تھا۔ گھنٹے میں شراب پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لائسنس لے کر کوئی بھی شراب خانہ کھول سکتا تھا۔ جمونپڑی کے باہر اور اندر بجلی کے بلب روشن تھے۔ مجھے جمونپڑی کے باہر ہی خالد نے جیب سے نکال کر زمین پر چھوڑ دیا۔ میں اندھیرے میں شریوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا جمونپڑی کے اندر ایک جگہ چھپ گیا۔ خالد ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔

میں اس کے قریب ہی تھا۔ خالد نے شراب خانے کے ملازم لڑکے سے کہا۔

”یہ تباؤ کہ رلیا اور دھلیا کمال ملیں گے؟“

لڑکے نے وہیں سے آواز دی۔

”رلیا دادا! یہ تمہیں ملنے آیا ہے۔“

کالے رنگ کا ایک ہٹا کتا بنگلہ کندھے پر پرتا ڈالے دھوتی بنیان پہنے ایک طرف

سے اٹھ کر آگیا۔

”کیوں بے تحرا! کون ملنے آیا ہے ہم کو؟“

ملازم لڑکے نے خالد کی طرف اشارہ کر کے۔

”دادا! یہ ہاؤ ہے۔“

”کیوں ہاؤ! کیا کام ہے مجھ سے؟ کہاں سے آئے ہو؟“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ حیر نے جو حلیہ بتایا تھا بالکل وہی شکل و صورت تھی اس کی۔ خالد نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر

اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔

”رلیا بھیا! میرا نام موہن داس ہے میں جاگتی پور سے آیا ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔ تم سے

کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

رلیا نے نوٹ اٹھا لیا اور مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ

گیا ہے کہ یہ اجنبی نوجوان کیا چاہتا ہے۔ اس نے ملازم لڑکے کو آواز دے کر کہا۔

”اے بھرا! پاؤ کے لیے دارو لاؤ۔“

”نہیں دادا! دارو نہیں چاہیے۔“

”اچھا! اچھا تو پھر کاجیا بنیو گے؟“

”میں کچھ نہیں بیا کرتا۔“

”اچھا اچھا۔“

رلیا دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ بولا۔

”باپو! تم مجھے بچلی لگتے ہو۔“

خالد نے کہا۔

”میں بیماری ہوں دادا۔ جانکی پور سے آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ دھلیا آجائے اور مشرقی پاکستان سے انہوں نے جو غیر بنگالی مسلمان عورت اغوا کی ہے وہ بھی آجائے تو ان دونوں کو ٹھکانے لگایا جائے۔ بوڑھا بنگالی ایک لڑکی کو لے کر آگیا۔ لڑکی کا رنگ گورا تھا۔ جسم صحت مند تھا۔ چہرے پر

مکری اداسی اور دلیری سی چھاری تھی۔ رلیا نے جھگڑو سے کہا۔

”اے وہ دھلیا کہاں ہے؟“

بوڑھے بنگالی نے کہا۔

”آ رہا ہے دادا آ رہا ہے۔“

”تو پھر تم جاؤ، جاؤ۔“

بوڑھا بنگالی چلا گیا! میں اور خالد غیر بنگالی لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو چارپائی کے پاس سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ کتنی ہاتھی والے رلیا نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا۔

”اری شرماتی کیوں ہے۔ یہ اپنے ہی باپو ہیں۔ جانکی پور سے آئے ہیں۔ بڑے دھن وان ہیں۔ ان کو خوش کرے گی تو یہ تمہیں ملا مل کر دیں گے جا باپو کے پاس جا کر بیٹھ جا۔“

خالد نے کہا۔

”میں تو کیا اسی لیے ہوں۔ ابھی چلوں گا۔“

”تو آ جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔“

رلیا اٹھ کر شراب خانے کے عقبی دروازے کی طرف چلا۔ شراب خانے میں شرابی لوگ آپس میں لگے ہوئے تھے۔ کسی نے خالد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ خالد نے اٹھتے ہوئے دائیں بائیں اور بیچ کے نیچے نگاہ ڈالی۔ میں اس دوران اچھل کر اس کے کرتے کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔ میں نے کہا۔

”فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہی ہوں۔“

اس نے ذرا گھبرا کر کہا۔

”میری جیب میں آ جاؤ کرم دادا! باہر تمہیں کوئی دیکھ لے گا۔“

میں اس کے کرتے کی بغل والی جیب میں گھس گیا۔ خالد رلیا کے پیچھے پیچھے نکل گیا۔ شراب خانے کے پیچھے ایک تھلا تھا۔ اس کے سامنے والے کنارے دو تین کوٹھریاں تھیں۔ وہیں تھوڑی تھوڑی روشنی ہو رہی تھی۔ ہٹا کتا کتنی ہاتھی والا بنگالی آگے آگے جا رہا تھا۔ مکناؤ خالد اس کے پیچھے تھا۔ وہ ایک کوٹھری میں چلا گیا۔ مکناؤ خالد بھی اس کے ساتھ ہی کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ اندر بانس کی دو چارپائیاں بھی تھیں۔ دیوار پر بلب جل رہا تھا۔ ایک بوڑھا بنگالی رلیا کو دیکھ کر چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ رلیا نے اس سے کہا۔

”جھگڑو! جاؤ سالے دھلیا کو یہاں بلا لاؤ اور سنو۔ ڈھاکے والی کو بھی یہاں لے آؤ۔ جلدی جاؤ۔“

رلیا اور مکناؤ خالد آئے سامنے چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔

رلیا بولا۔

”باپو! دارو چاہیے تو ابھی بتا دو میں جھگڑو سے کہہ کر بوقت منگوائے دیتا ہوں۔“

مکناؤ خالد نے کہا۔

ہمارے سامنے موجود تھے۔ بلکہ وہ لڑکی بھی وہاں موجود تھی جس کو ہمیں وہاں سے نکالنا تھا۔ کوٹھڑی میں بلب کی روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی اور ہماری چارپائی کے پیچھے اندھیرا تھا۔ میں خاموشی سے رہتا ہوا کمانڈو خالد کی جیب سے نکل کر چارپائی کے نیچے چلا گیا۔ کمانڈو خالد نے ان دونوں کو باتوں میں لگایا تھا۔ غیر ہنگامی لڑکی جو شکل صورت سے پنجابی لگتی تھی خالد کے پاس سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ رلیا اور دھلیا سامنے والی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ان کی ٹانگیں مجھے صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ رہتا ہوا دوسری چارپائی کے پیچھے سے ہو کر اس کے نیچے آ گیا۔ دونوں مکتی ہاتھی والے ہندو بنگالیوں کی ٹانگیں میرے سامنے تھیں۔ ان کی دھوپتیاں پنڈلیوں سے اوپر تھیں۔ کالی کالی پنڈلیاں مجھے صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے نہیں پتہ کمانڈو خالد ان سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ میں فرش پر رہتا ہوا ٹانگوں کی طرف بڑھا اور جلتے ہی پہلے ایک مکتی ہاتھی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے مکتی ہاتھی والے کی پنڈلی پر ڈس دیا۔ مجھے ان میں سے ایک کی آواز ضرور آئی تھی۔ اس نے بنگلہ زبان میں کہا تھا۔

”ارے سالے، یہ کیا ہے۔“

اس کے بعد دونوں بنگالیوں کی ٹانگیں ایک طرف سے اوپر ہو گئیں۔ وہ چارپائی پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ لڑکی نے سانپ کو دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کمانڈو خالد سمجھ گیا کہ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اس نے لڑکی سے کہا۔

”گھبرائو نہیں، خاموش رہو۔ ہم مسلمان ہیں، تمہارے بھائی ہیں۔ تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔ یہ سانپ نہیں ہے، یہ میرا بھائی ہے۔ جلدی سے ہمارے ساتھ نکل چلو۔“

لڑکی ششدر سی ہو کر کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی دونوں بنگالیوں کی لاشوں کو دیکھتی۔ دہشت کے مارے اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے انسانی آواز میں کہا۔

لڑکی ایسے اٹھ کر کمانڈو خالد کے پاس آ کر بیٹھ گئی جیسے اسے کسی نے چابی دی ہوئی ہو۔ اس کا چہرہ اسی طرح دیوانہ تھا۔ اس نے شلوار قبض پٹنی ہوئی تھی۔ رلیا کہنے لگا۔

”یہ ساڑھی نہیں پنتی۔ کتنی ہے میں اپنا لباس ہی پنوں گی۔ ہی ہی ہی۔“

”رلیا! اٹھا۔ کہنے لگا۔“

”میں چلتا ہوں۔ ایسا کرو باقی کی رقم بھی مجھے دے دو بابو! ہاں۔“

کمانڈو خالد نے اسے باقی کے پیسے نکال کر دیے اور دھلیا کا پوچھا۔ رلیا نے میز

سے لچے میں کہا۔

”ارے بابو! تو دھلیا سے مل کر کیا کرے گا؟ سلا کہیں وارد پئی کر پڑا ہو گا۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”واوا! مجھے اس سے ایک ضروری کام ہے۔“

”ارے کوئی سا کام ہے؟ مجھے بتاؤ وہ سلا تمہارا کیا کام کرے گا۔“

کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک دیلا پتلا کلا بنگالی داخل ہوا۔ رلیا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لو سلا دھلیا بھی آ گیا۔ ارے دھلیا یہاں بیٹھ جا بابو کو تھکے سے کوئی کام ہے۔“

دھلیا نے کمانڈو خالد کی طرف گھور کر دیکھا اور رلیا سے بنگلہ زبان میں پوچھا۔

”اس کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے واوا؟“

میں بنگلہ زبان سمجھتا تھا۔ رلیا نے اسے بنگلہ زبان میں ہی کہا کہ معلوم کر لے کیا کام ہے، شاید اس میں کوئی فائدہ ہو۔“

کمانڈو خالد نے اس دوران ایسا کیا کہ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے دائیں جانب کو ذرا شیڈز ہوا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی بٹن والی جیب جس کے اندر میں چھپا ہوا تھا ان دونوں مکتی ہاتھی والوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ کمانڈو خالد نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تاکہ میں ان لوگوں کی نظر میں آئے بغیر جیب سے باہر نکل سکوں۔ ہمارے دونوں ٹارگٹ

ڈرائیور سے کہا۔

”پرانے گھٹ کی طرف چلو۔“

ٹیکسی چل پڑی۔ کئی سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد جب ٹیکسی دریائے ہنگلی کے پاس آئی تو خالد نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ یہاں سے اسے پیدل ہی اپنے خفیہ ٹھکانے تک جانا تھا۔ لڑکی بھی اس کے ساتھ جلدی جلدی چل رہی تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے کہا۔

”رضیہ۔“

میں نے اس کے بعد کچھ نہ پوچھا۔ ہم اپنے خفیہ ٹھکانے کے قریب آئے تو لڑکی نے کہا۔

”یہاں کتنی باتنی والے نہ آجائیں۔“

خالد نے کہا۔

”وگھر نہ کرو، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

خالد نے کوشٹری میں آکر موسمِ بقی روشن کر دی اور دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی سے کہا۔

”یہاں بیٹھ جاؤ رضیہ بہن۔“

لڑکی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے جب سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور

لڑکی سے کہا۔

”تم کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، اب بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سانپ میرا دوست کرم داو ہے۔ اس پر ایک سپیرے نے جلو کر کے سانپ بنا دیا ہے مگر یہ کسی بھی وقت اپنی انسانی شکل میں واپس آ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ تمہیں جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

پھر اس نے رضیہ کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ تمہارا مشن غیر ہنگلی عورتوں کو آزاد کرانا

”کمانڈر! اسے لے کر نکلو۔“

لڑکی نے جب ایک ایسے انسان کی آواز سنی جو اس کمرے میں نہیں تھا تو اور زیادہ دہشت زدہ ہو گئی۔ خالد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”یہ میرے دوست کی آواز تھی۔ یہ سانپ نہیں ہے۔ یہ انسان ہے، میرا دوست ہے، تمہارا بھائی ہے۔ اسی نے ان دونوں دشمنوں کو ہلاک کیا ہے۔ ہم اسی مقصد کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ہمیں بتاؤ یہاں سے فرار ہونے کا کوئی دوسرا راستہ ہے؟“

اپنی رہائی کا سن کر لڑکی میں جیسے ایک نئی طاقت آ گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمانڈو خالد نے اس کے سامنے مجھے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ لڑکی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ کہنے لگی۔

”ان جھوٹوں کے پیچھے ایک راستہ ہے۔“

اس کا اردو بولنے کا لہجہ خالص پنجابی تھا۔ لڑکی ہمیں لے کر جھونپڑی سے نکلی اور باہر پیچھے اور میرے پس آ گئی اور سامنے دو درختوں کی طرف چل پڑی۔ خالد اس کے ساتھ ساتھ تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

”اس طرف کون سا علاقہ آئے گا؟“

لڑکی اب ہوشیار ہو گئی تھی۔ اسے ایک عذاب سے رہائی مل گئی تھی۔ اس نے یہ بالکل خیال نہ کیا کہ میں سانپ ہوں اور انسان کی آواز میں اس سے بات کر رہا ہوں۔ کہنے لگی۔

”معلوم نہیں کون سا علاقہ ہے۔ آگے ایک بڑی سڑک آئے گی۔“

اس سڑک کی روشنائی ہمیں دو درختوں کے عقب میں نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

”یہاں سے ٹیکسی رکشا جو ملے لے لیتا اور اپنے ٹھکانے پر ہی چلتا۔“

سڑک پر آکر کمانڈو خالد لڑکی کے ساتھ ایک جگہ رک گیا۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا۔ سڑک پر سے گاڑیاں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ خالد نے

وہ مجھے کوٹھڑی میں چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا۔
 ”رضیہ بہن! یہ ایک قیامت تھی جو آئی اور اپنے ساتھ سینکڑوں خاندانوں کو تباہ و برباد کر کے گزر گئی۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں گناہ کی دلدل سے نکل لیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں نہ جانے کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کتنے غیر بنگالیوں کا خون گلیوں اور بازاروں میں بہہ گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ نہ جانے کتنی عورتوں کے سواگ اڑ گئے۔ بہن! تم بھی صبر کرو۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔“

لڑکی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”خدا جانے ابھی میرا کیا حال ہونے والا ہے۔ میں وزیر آباد اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کے پاس کیسے پہنچوں گی۔ وہ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں مر چکی ہوں۔ کاش میں بھی جمیل کے ساتھ ہی مر جاتی۔“
 اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جمیل اس کے شہید خاوند کا نام تھا۔ میں نے اسے کہا۔

”بہن! ہم تمہیں جہنم سے نکل لائے ہیں تو تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس بھی ضرور پہنچا دیں گے۔ تم جگر نہ کرو۔ یہ ہمارا فرض ہے جسے ہم ضرور پورا کریں گے۔“

اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔
 ”بھائی! تم تو ایک سناپ ہو۔ تم مجھے میرے ماں باپ کے پاس کیسے پہنچا سکو گے؟“

میں نے اسے کہا۔

”ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے اور بھی مسلمان بچا ہوں۔ وہ تمہیں خود پاکستان تمہارے گھر پہنچا کر واپس آئیں گے۔“

خدا جانے کچھ دیر بعد کس ہوٹل سے مکائنڈو خالد تھوڑا بہت کھانے پینے کو لے

اور کتنی باتیں والوں کو ان کے ظلم کی سزا دینا ہے۔ لڑکی کا ڈر خوف کافی حد تک دور ہو چکا تھا لیکن ایک سناپ کو خالد کی کلائی میں لپٹا ہوا دیکھ کر اور اس کو انسانی آواز میں باتیں کرتے سن کر اس پر ایک دہشت سی ضرور تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں کہاں رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بتایا کہ اس کی شادی کو دو سال گزرے ہیں۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس کا خاوند گیس کے چولہوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کی وزیر آباد میں دکان تھی۔ کسی نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے شہر کھانا میں ایک بڑے مشہور حکیم صاحب ہیں وہ روحانی علاج بھی کرتے ہیں اور ان کے علاج سے ہاتھ عورتوں کو بھی اولاد مل چکی ہے۔ اس کا خاوند اسے لے کر مشرقی پاکستان آ گیا۔ اس نے آنسو پونچھے ہوئے کہا۔

”ہم کھانا میں حکیم صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ دو ماہ کا کورس پورا کرنا ہوگا۔ انہوں نے مجھے کھانے کو گولیاں بھی دیں اور کہا کہ میں چالیس دن تک صاف کروں گا۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا واپس وزیر آباد چلے چلو۔ وہ بولا علاج ادھورا رہ جائے گا اور یہ گڑبڑ معمولی ہے، جلدی ختم ہو جائے گی لیکن گڑبڑ بڑھ گئی۔ ایسی قیامت مچی کہ کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہندو بنگالیوں نے پنجابیوں، پنجابوں اور مسلمان بھائیوں کے مکانات کو آگ لگانا شروع کر دی۔ پھر کتنی باتیں والے بھی انڈیا سے آ گئے جو بنگالی نہیں تھے ان کو قتل کیا جانے لگا۔ ہم کسی طرح کھانا سے نکل کر چٹاگانگ آ گئے۔ وہاں میرے خاوند کا ایک سٹن والا رہتا تھا۔ ہمیں وہاں آئے دوسرا دن تھا کہ رات کو ہمارے گھر پر کتنی باتیں والے آ گئے۔ انہوں نے میرے خاوند کو گولی مار کر مار ڈالا اور مجھے اٹھا کر لے گئے۔“

لڑکی رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ مکائنڈو خالد نے اور میں نے اسے حوصلہ دلانے کی کوشش کی مگر لڑکی کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ خالد نے اسے چارپائی پر لیٹ جانے کو کہا اور مجھ سے بولا۔

”میں کچھ کھانے کو لاتا ہوں تم یہاں رہ کر رضیہ بہن کی حفاظت کرو۔“

میں نے خالد سے کہا۔

”میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہم رضیہ کو لے کر بھوپال چلے جاتے ہیں وہاں اپنے مجاہدوں کی ڈیوٹی لگائیں گے کہ وہ رضیہ کو اپنی حفاظت میں مقبوضہ کشمیر اور وہاں سے جنگ بندی لائن پار کر کے آزاد کشمیر لے جائیں اور اسے اس کے گھروں پر آباد چھوڑ آئیں۔“

کمانڈر خالد کہنے لگا۔

”میرے خیال میں یہی طریق کار ٹھیک رہے گا کیونکہ یہاں کلکتے میں حیدر بھائی کے اتنے وسائل نہیں ہیں۔ بھوپال میں ہمارے پہنچنے تک دونوں مجاہد کشمیری لیڈر غلام حسین کو سری نگر چھوڑ کر واپس آ چکے ہوں گے۔ وہی رضیہ بہن کو اپنے ساتھ آزاد کشمیر اور وہاں سے وزیر آباد لے جائیں گے۔ دونوں تجربہ کار بھی ہیں اور جنگ بندی لائن کے علاقے سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”تو پھر کیوں نہ بلاؤ شیش سے صبح صبح بھوپال جانے والی کوئی گاڑی پکڑ لیں۔ حیدر کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“

”یہ تجویز بھی مناسب ہے۔ میں بھوپال پہنچ کر حیدر کو کسی طریقے سے اطلاع کر دوں گا کہ ہم بھوپال آ چکے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”لیکن ایک بات ہے، کلکتے میں ابھی کتنی ہاتھی والے موجود ہیں۔ ہمیں ان سے بھی انتقام لینا ہے اور انہیں ان کے ظلم و ستم کی سزا دینی ہے اور اگر یہاں کسی جگہ اغوا شدہ عورتیں ہوں تو انہیں بھی رہا کروا کر پاکستان پہنچانا ہے۔“

کمانڈر خالد بولا۔

”ہم رضیہ کو بھوپال میں اپنے مجاہدوں کے ساتھ کشمیر کی طرف روانہ کر کے دوبارہ یہاں واپس آ جائیں گے۔“ آخر یہی طے پایا کہ ہمیں کلکتے سے سیدھا بھوپال ہی

آیا۔ اس نے رضیہ کو مجبور کر کے کچھ کھلایا۔ اس نے بھی لڑکی کو تلی دی اور کہا کہ ہم لوگ اسے ہر حالت میں پاکستان اس کے گھر پہنچا دیں گے۔ لڑکی کو کچھ اطمینان ہو گیا۔ کہنے لگی۔

”تم لوگ فرشتہ بن کر آئے ہو۔ خدا تمہیں اس نیکی کا بڑا ثواب دے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں تو حق کی خاطر یہ سب کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ایک مسلمان کی شخصیت ہے۔“

رضیہ بہن! ہم نے ثواب کی خاطر یہ سب کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ایک مسلمان کی شخصیت ہے۔ حیثیت سے ہمارا فرض تھا۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کچھ اور عورتوں کا بھی علم ہے جنہیں کتنی

ہاتھی والے اٹھا کر یہاں کلکتے لے آئے تھے۔“

اے حیدر! میرا مشورہ اور رافضی رضیہ نے کمری سانس بھر کر کہا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے یہاں ان درندوں نے آگلی ہی رکھا ہوا تھا۔“

ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ لڑکی نے کہا۔

”خدا نے دونوں خاندانوں سے میری بربادی کا بدلہ لے لیا۔ ان کی لاشیں دیکھ کر میرا سینہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔“

میں نے کمانڈر خالد سے کہا۔

”میرا خیال ہے ہمیں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل کر حیدر بھائی کے

پاس چلے جانا چاہیے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

کمانڈر کچھ سوچ کر بولا۔

”وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ حیدر بھائی کی کھولی اٹھلی جینس والوں کی نگاہوں میں

آ جکی ہے۔ ہم رضیہ بہن کو لے کر وہاں گئے تو ڈر ہے کہ پکڑے جائیں گے۔“

”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

خالد کہنے لگا۔ ”میں آدمی رات کے بعد حیدر کے پاس جاؤں گا اور اسے لے کر

یہاں آ جاؤں گا۔ اگر وہ نہ آ سکا تو اس سے مشورہ ضرور کروں گا کہ رضیہ کو ہم کیسے پاکستان پہنچا سکتے ہیں؟“

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک شیشن کا نام ہلوڑ ہے، دوسرے شیشن کا نام سیالہ ہے۔ بھوپال کی طرف گاڑیاں ہلوڑ جنکشن سے جاتی تھیں۔ ہلوڑ جنکشن پر بہت روٹن تھی۔ دھوٹی کرتوں والے بنگلے عام نظر آ رہے تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کی وجہ سے یہاں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی تھی۔ پولیس بھی تھی اور ملٹری پولیس کے آدمی بھی تھے۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

”زیادہ ہوشیار رہنا خالد بھائی۔ پولیس اوسر اوسر پھر رہی ہے۔ اٹلی جینس والے بھی ضرور ہوں گے۔“

کمانڈو خالد نے آہستہ سے کہا۔

”خدا کے لیے تم خاموش رہو۔“

رضیہ نے چونکہ بنگلے عورتوں کی طرح ساڑھی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ وہ شلوار قمیض میں تھی اس لیے بنگلی اس کے قریب سے گزرے ہوئے اسے ایک نظر گھور کر ضرور دیکھتے تھے۔ وہ اپنے لباس اور طے سے صاف پہچانی جاتی تھی کہ پنجابی عورت ہے۔ خالد ساتھ تھا جس نے بنگلیوں والا دھوٹی کرت پہنا ہوا تھا۔ اس نے بھوپال کے دو ٹکٹ لے لیے اور جس پلیٹ فارم سے گاڑی جانے والی تھی وہاں آگیا۔ وہاں مسافروں کا رش نہیں تھا جس کی وجہ سے اسے دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔ یہاں پولیس کے سپاہی بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک قلی نے بتایا تھا کہ دن کے چھ بجے سے پہلے کوئی گاڑی بھوپال سیدھی نہیں جائے گی۔ راستے میں گاڑی بدلتی پڑے گی۔ ایک ٹرین دو بجے والا کھن پور دلی جا رہی تھی۔ ہمیں کھن پور سے بھوپال والی گاڑی پکڑنی تھی۔ ہم ٹرین میں بیٹھ گئے۔ رضیہ کو کمانڈو خالد نے اپنے ساتھ ہی ڈبے میں بٹھایا۔ میں اس کی جیب میں تھا۔ شیشن پر کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا تھا۔

ٹرین دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ بھی بڑا تھا دینے والا طویل سفر تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت ٹرین کھن پور پہنچی۔ یہاں سے ہمیں ٹرین بدلتی تھی

جانا چاہیے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ لڑکی کو ہم نے مجبور کر کے چارپائی پر سلا دیا کہ وہ کچھ دیر آرام کرے۔ شیشن پر جانے سے پہلے اسے اٹھا دیں گے۔ رضیہ بے چاری جانے کب کی جاگی ہوئی تھی، چارپائی پر سٹ کر پڑ گئی اور تھوڑی دیر بعد گری نیند سو رہی تھی۔ میں نے خالد سے کہا۔

”تمہارے پاس بھوپال تک کا دو آدمیوں کا کرالیہ ہے؟“

اس نے بتایا کہ اس کے پاس کافی پیسے ہیں۔ میں نے کہا۔

”رضیہ کو اپنے ساتھ ٹرین پر بٹھانا۔ عورتوں والے ڈبے میں اکیلی نہ بٹھانا۔“

”میں اپنے ساتھ ہی بٹھاؤں گا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ بھوپال جانے والی گاڑی

کس وقت چھوٹی ہے۔“

میں نے کہا۔

”صبح ہونے سے پہلے ہم شیشن پر پہنچ جائیں گے۔ بھوپال کی طرف جو گاڑی بھی

جاتی ہوگی اس میں بیٹھ جائیں گے۔ یہاں سے ٹکنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے صبح تک کھال خانے والوں کو کتنی ہاتھی والوں کی لاشوں کا پتہ چل جائے گا۔“

”تو پھر ابھی یہاں سے نکل پڑتے ہیں ہو سکتا ہے کوئی گاڑی مل جائے۔“

”رضیہ کو جگا دو۔ ابھی چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

خالد نے رضیہ کو جگا دیا۔

”رضیہ! ہمیں ابھی جانا ہوگا۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمانڈو خالد نے مجھے اٹھا کر اپنی قمیض کی جیب میں ڈالا اور رضیہ سے کہا۔

”میرے ساتھ آ جاؤ۔“

علاقہ غیر آباد تھا۔ رات کے وقت اوسر اور بھی سناتا تھا۔ ہم کلاونی سے ہٹ کر جا رہے تھے۔ دریا ایک طرف رہ گیا تھا۔ دور سے دریائے بنگلے کے پل کی روشنیوں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جگہ سے رک شامل گیا۔ ہم شیشن پر آ گئے۔ ٹکٹ کے دو شیشن ہیں۔

اور بھول جانے والی گاڑیاں پکڑنی تھیں۔ ہم ایک پلیٹ فارم پر آکر بیٹھ گئے۔ یہیں خالد اور رضیہ نے کھانا کھلیا۔ چونکہ ہمارے پاس کوئی نہیں تھا اس لیے ہم بے فکر ہو کر گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے خالد سے کہا میں جیب سے باہر نکل رہا ہوں۔ اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔

”کسی کی نظر پڑ گئی تو نظروں میں آجائیں گے۔“

گاڑی کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ خالد چائے کی کینٹین سے چائے کے گلاس لے آیا۔ یہ مٹی کے گلاس تھے۔ چائے پینے کے بعد یہ گلاس پیسٹک دیے جاتے تھے۔ خالد اور رضیہ پلیٹ فارم کے خلی بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے اس کی بگلی جیب میں سے گردن باہر نکال ہوئی تھی۔ دودھ ریلوے پارڈ پر شام کی سیاہی انجڑوں کے دھوئیں میں مکمل مل رہی تھی۔ انجڑوں کے اوپر اوپر شٹل کرنے اور ڈبوں کے آہٹوں میں کرا کر رکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مکلی پور کا شہر بڑا پرانا اور عجیب شہر ہے۔ اس کا ریلوے اسٹیشن بھی ویسا ہی پرانا اور عجیب تھا۔ لوگوں کے چروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ مفلسی کا شکار ہیں اور انہیں جیت بھر کر کھانے کو نہیں مل رہا۔ مکناؤ خالد رضیہ کو تسلی دے رہا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ ہمارے آدمی اس کو پاکستان پہنچا کر واپس آئیں گے۔ میں بچ میں کوئی ایک آدھ بات کر لیتا تھا۔ ایک درمیان عمر کا دہلا پتلا ہتھکریا لے بالوں والا دھاتی ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گھڑی پکڑے ہمارے سامنے سے گزرا۔ اس کا رنگ گہرا سا ہوا تھا اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتا تھا۔ بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ جب قریب آیا تو میں خالد کی جیب کے اندر ہو گیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد گردن باہر نکلا۔ مکناؤ خالد رضیہ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہتھکریا لے بالوں والا اوجیز عمر دھاتی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کبھی سامنے دیکھتا کبھی اوپر پلیٹ فارم کی چھت کو دیکھتا اور کبھی گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگتا۔ میں نے اس دھاتی کو دیکھ لیا تھا۔ خالد نے شاید اسے قریب سے گزرتے ہوئے سرسری نظر سے ہی دیکھا ہو گا۔

دھاتی آدمی کوئی ایک آدھ منٹ وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہیں سے اٹے پاؤں واپس ہماری طرف آنے لگا۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مکناؤ خالد پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور آگے نکل گیا۔ میں نے خالد سے کہا۔

”یہ بوڑھا دھاتی تمہاری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔“

خالد کہنے لگا۔

”مجھے دیکھنے سے اسے کیا لے گا۔ میرا خیال ہے کہ رضیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”مکناؤ! ایسی بات نہیں ہے۔ یہ جہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ سی آئی ڈی کا آدمی لگتا ہے۔“

مکناؤ خالد رضیہ سے باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا تھا۔ بوڑھا دھاتی ہمیں تیس قدم آگے جانے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

”وہ واپس آ رہا ہے۔ وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

بوڑھا دھاتی ہمارے قریب سے گزرتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اس دفعہ اس نے ہماری طرف بالکل نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اپنی رفتار آہستہ کر دی تھی۔ جب وہ آگے چلا گیا تو مکناؤ خالد کہنے لگا۔

”مجھے تو اس میں کوئی سی آئی ڈی والوں کی بات دکھائی نہیں دیتی۔ عام سا دھاتی بوڑھا ہے شاید اپنے کسی ساتھی کو اوپر اوپر دیکھ رہا ہے۔“

میں خالد کی جیب سے تھوڑی سی گردن نکالے بوڑھے دھاتی کو آگے کی طرف جاتے برابر دیکھ رہا تھا۔ وہ دس بارہ قدم چل کر ایک بار پھر رک گیا۔ اب وہ وہیں ایک طرف ہو کر پلیٹ فارم کی چھت کے آہنی ستون کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور بیڑی پینے لگا۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ بیڑی کے دو ایک سس لگانے کے بعد بوڑھے دھاتی نے ایک بار پھر مشکوک انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

”خالد بھائی یہاں سے اٹھ کر کسی دوسری طرف چلے چلو“ یہ بوڑھا اٹھلی جینس کا آدمی ہے۔“

خالد اٹھ کھڑا ہوا۔ رضیہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر کوئی آدمی نہیں تھا وہاں جا کر خالد ایک خالی بیچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے سر نکال کر دیکھا۔ بوڑھا دہماتی جہاں بیٹھا تھا وہاں نہیں تھا۔ وہ چلا گیا تھا مجھے بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ آدمی سی آئی ڈی کا نہ ہو۔ مجھے یونی ویم ہو گیا ہو۔ لیکن میں نے وقت پر چوکنا ہو کر اپنی ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا۔ مکناؤ خالد بھی پولیس کو مطلوب تھا اور سی آئی ڈی اس کی خفیہ اسلامی تنظیم کے کارکنوں کو تلاش کرتی پھرتی تھی۔ اتنے میں پلیٹ فارم پر مسافروں کی آمد شروع ہو گئی۔

بھوپال جانے والی ٹرین آرہی تھی۔ ٹرین آگئی۔ مسافر ڈیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ ٹرین میں پہلے بھی کئی رش تھا۔ خالد کو بھی ایک ڈبے میں جگہ مل گئی۔ اس نے رضیہ کو ایک کورٹ کے ساتھ بٹھایا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ خالد کے کرتے کی جیب ڈبے کے دروازے کی طرف تھی۔ میں جیب سے تھوڑا سا سر باہر نکال کر دروازے میں سے آنے جانے والے مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ یونی مجھے وہم تھا کہ کہیں وہی بوڑھا دہماتی ہمارے ڈبے میں نہ آجائے مگر وہ نہ آیا۔ ٹرین چل پڑی۔ ٹرین جھانسی پہنچی تو خالد رضیہ کو یہ کہہ کر اٹھا کہ میں چائے لے کر آتا ہوں۔ میں اس کی جیب میں ہی تھا۔ ڈبے سے باہر آ کر اس نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا۔

”وہ آدمی تمہیں دوبارہ تو نظر نہیں آیا؟“

میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

”نہیں، دوبارہ اسے نہیں دیکھا۔ تمہارا خیال ٹھیک تھا وہ کوئی عام دہماتی تھا۔

ویسے ہمیں محتاط ہی رہنا چاہیے۔“

مکناؤ خالد سامنے چائے کے شل کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”اپنی طرف سے تو ہم کافی احتیاط کرتے ہیں بلی اللہ مالک ہے۔“

اس نے چائے کے دو مٹی کے کٹورے لیے اور واپس ڈبے کی طرف چل پڑا۔ پلیٹ فارم پر کئی روشنی تھی۔ اچانک مجھے وہی بوڑھا دہماتی نظر آ گیا۔ وہ ہمارے ساتھ والے ڈبے کی کھڑکی کے پاس کھڑا اندر جھانک کر جیسے کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ میں نے خالد کو ایک خاص سیٹی کی آواز میں خطرے کا سگنل دیا۔ یہ ہلکی سی سیٹی میں سن پت ہوئے کی وجہ سے اپنے منہ سے دو بار نکلا تھا اور یہ اس وقت نکلا تھا جب آس پاس کوئی خطرہ نہ تھا اور میں انسانی آواز میں خالد کو خطرے سے آگاہ نہ کر سکتا ہوں۔ سگنل کی آواز پر خالد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”کیا بات ہے؟“

میں کچھ نہ بولا۔ کیونکہ ہم ڈبے کے مسافروں کے درمیان آگئے ہوئے تھے۔ چونکہ میں نے خطرے کا سگنل دے دیا تھا اس لیے خالد مجھ سے بات کرنے کو بے چین تھا۔ اس نے چائے کے گلاس رضیہ کو پکڑائے اور یہ کہہ کر لیٹرن کی طرف گیا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ لیٹرن میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور مجھ سے پوچھا۔

”کیا بات ہو گئی ہے؟“

میں نے کہا۔

”میں اسی مشتبہ بوڑھے کو ساتھ والے ڈبے کے باہر دیکھا ہے۔ وہ کھڑکی میں سے جھانک کر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔“

خالد نے کہا۔

”تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی دہماتی بوڑھا تھا؟“

میں نے کہا۔

”یہاں تو روشنی ہے۔ میں تو اندھیرے میں بھی آدمی کی شکل دیکھ لیتا ہوں۔ یقین کرو یہ وہی بوڑھا تھا۔“

خالد کسنے لگا۔ ”کیا خیال ہے تمہارا؟ ہم جھانسی میں اتر جائیں؟“

میں نے کہا۔

تھی۔ اپنی بیوی کے جسم کی خوشبو میرے دل و دماغ کو فرحت بخش رہی تھی۔ میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ زندہ سلامت واپس اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا تھا ورنہ راستے میں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک تو پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ دوسرے میں سناپ کی شکل میں تھا۔ ذرا خالد کی جب سے باہر نکلا تو لوگ مجھ پر پتھروں اور لاشیوں کی بارش کر دیتے اور پکلی ڈالتے۔ انسان کی شکل میں ہوتا تو کوئی تعجب نہیں تھا کہ انڈین پولیس یا ملٹری پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ زندہ سلامت واپس آنے پر مجھے واقعی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔

خفیہ کمین گاہ کے باہر اپنے محلہ ہمیں دیکھ کر اندھروں میں سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے لیڈر کو پہچان لیا تھا۔ وہ خالد اور رضیہ کو اپنی حفاظت میں لے کر کمین گاہ کے اندر آ گئے۔

اندر تجربے میں آکر کمینڈو نے رضیہ سے کہا۔

”ہن! یہ ہماری خفیہ کمین گاہ ہے۔ یہاں تم ہر طرف سے محفوظ ہو۔“
رضیہ کہنے لگی۔

”بھائی جان! جیسے بھی ہو مجھے پاکستان پہنچا دیں۔ میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔“

خالد نے کہا۔

”میں کل ہی کوئی بندوبست کرتا ہوں۔“

میں نے خالد سے کہا۔

”معلوم کرنا چاہیے کہ ہمارے جو محلہ کشمیری لیڈر کو کشمیر چھوڑنے گئے تھے وہ واپس آ گئے ہیں۔“

خالد نے اسی وقت کمینڈو ارشد کو بلوایا اور اس سے اپنے دونوں محلہوں کے بارے میں پوچھا۔ کمینڈو ارشد نے کہا۔

”سر! وہ دونوں کشمیری حریت پرست لیڈر کو سری نگر ان کی خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں

”ٹرین سے اتر جاؤ گے تو پولیس کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ اگر یہ واقعی سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور تم کو اس نے شناخت کر لیا ہے تو یہ فوراً پولیس کو خبر کر کے تمہیں پکڑوا دے گا۔ میرا خیال ہے اسی ٹرین میں بیٹھے رہو۔“
اتنے میں ٹرین کو ایک دھچکا لگا اور وہ آگے کو چلنے لگی۔
”اب تو اسی ٹرین میں رہنا ہو گا فکر نہ کرو۔ آئوٹیک پستول میرے پاس موجود ہے۔“

میں نے کہا۔

”میں بھی چوکس ہو کر تھماری جب میں رہوں گا۔“

خالد لیڈرین سے باہر آکر رضیہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ بھوپال وہاں سے کلنی فاسٹل پر تھا۔ میں نے دو ایک بار جیب میں سے سر تھوڑا سا نکل کر ڈبے کے مسافروں کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے مشکوک بوڑھا دیکھا کہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ مجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بوڑھا کوئی عام دھاتی مسافر ہے اور ہمیں خواہ مخواہ اس پر شک ہو گیا ہے یا جج انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ راستے میں شیشن آتے اور گزرتے جاتے۔ ٹرین جنگلوں و دریاؤں پر سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ کسی شیشن پر رکتی، کسی شیشن کو چھوڑ کر آگے نکل جاتی۔ دن کی سفیدی ابھی نہیں پھیلی تھی۔ رات کا پچھلا پھر ہو گا کہ ٹرین بھوپال کے شیشن میں داخل ہو گئی۔ ہم لوگ پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ دوسرے مسافر بھی یہاں اترے تھے۔ ہم ان کے درمیان میں چل رہے تھے۔ یہ خالد کی شکندی تھی کہ وہ مسافروں سے الگ نہیں ہوا تھا۔ وہ اور رضیہ پلیٹ فارم کے گیٹ پر سے نکل گئے۔ یہ خالد کا اپنا شہر تھا۔ اس نے باہر آتے ہی ایک رکشا لے لیا۔ رضیہ کو ساتھ بٹھایا اور اسے ایک خاص علاقے کی طرف چلنے کو کہا۔ یہ علاقہ ہماری خفیہ کمین گاہ کا ایک قریبی علاقہ تھا۔ وہاں آکر رکشا چھوڑ دیا۔ آگے اندھیرے میں خالد رضیہ کو لے کر ایک میدان میں سے گزرنے لگا۔ یہ میدان میرا دیکھا ہوا تھا۔ بھوپال شہر میں داخل ہوتے ہی جیلہ کی خوشبو کلنی تیز ہو کر مجھے محسوس ہونے لگی

پنچا کرواپس آگئے تھے۔ اس وقت وہ اپنے دوسرے ہائیڈ آؤٹ میں ہیں۔ آپ حکم دیں تو میں انہیں وہیں سے بلوا لیتا ہوں۔“

خلد نے کہا۔

”دن نکل لینے دو۔ پھر تم خود جا کر انہیں لے آنا۔“

خلد نے رضیہ کے ساتھ تھوڑا سا بیٹھ کیا۔ چائے بنوائی۔ مجھے اس خبر سے آنے کے فوراً بعد جیب سے نکل کر سامنے تپائی پر بٹھا دیا۔ کہنے لگا۔

”مجھے تو بھوپال کے شیش پر وہ بوڑھا دیہاتی کہیں نظر نہیں آیا۔ تم نے اسے کہیں دیکھا تھا؟“

میں نے کہا۔

”میں تھماری جیب میں تھا اور گرد مسافر چل رہے تھے۔ مجھے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

وہ بولا۔

”میرا خیال ہے وہ بھوپال سے آگے بمبئی کی طرف چلا گیا ہوگا۔“

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔“

کمانڈر خلد کے مشورے پر میں نے رضیہ کو اپنے اور اپنی بیوی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ خلد نے بالکل صحیح سوچا تھا کہ اگر ہم نے رضیہ کو بتا دیا تو حالات بدلتے کچھ دیر نہیں لگی اگر پولیس نے رضیہ کو پکڑ لیا تو وہ ایک منٹ میں اس سے میرے اور میری بیوی کے بارے میں معلومات حاصل کر لے گی اور ہم سارے لوگ پکڑے جائیں گے۔ اپنی کمین گاہ کے بارے میں بھی خلد کو بتانا ہی پڑا تھا لیکن وہ اس لیے مطمئن تھا کہ رضیہ اس کی تحویل میں ہے اور ہمیں سے وہ اسے اپنے مجاہدوں کے حوالے کر دے گا جو اسے اپنی حفاظت میں آزاد کشمیر پہنچا آئیں گے۔ رضیہ کو ہم نے دوسری کو غرضی میں آرام کرنے کے لیے بھجوا دیا۔ میں اور خلد اسی حجرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہم نے چائے پی۔ خلد نے جیلہ کو بلانے کے لیے آدی بھجوا دیا

تھا۔ وہ اسی وقت آگئی میری طرف دیکھ کر بولی۔

”خدا کے واسطے تم کب انسانی شکل میں واپس آؤ گے۔ یا اللہ! ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما۔“

میں نے کہا۔

”جیلہ! اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد ہم پاکستان چلے جائیں گے۔ وہیں جاتے ہی مجھے اللہ کی حکم سے اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا۔“

”ہم کب پاکستان جائیں گے۔ تم ہر بار یہی کہتے ہو اور پھر بھول جاتے ہو۔“

میں نے کہا۔

”بس یہ سمجھ لو کہ انشاء اللہ اگلے مہینے ہم یہاں سے آزاد کشمیر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

جیلہ کافی دیر میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ واپس چلی گئی۔ کمانڈر ارشد نے دونوں مجاہدوں کو بلوا بھیجا تھا جو کشمیری لیڈر کو سری نگر چھوڑنے گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کمانڈر خلد کو سیلوٹ کیا اور اوپ سے کھڑے ہو گئے۔ کمانڈر خلد نے اسے رضیہ کے بارے میں ساری بات تفصیل سے بتائی اور پوچھا۔

”کیا تم لوگ ہماری اس بہن کو وزیر آبلو تک لے جاسکتے ہو؟“

ایک مجاہد نے کہا۔

”سر! ہم آزاد کشمیر کا پلڑ کر اس کرا دیں گے، آگے اپنا ایک آدی اس خاتون کو وزیر آبلو اس کے گھر تک چھوڑ آئے گا۔“

”کیا تمہیں اس آدی پر بھروسہ ہے۔“

”میں سر! وہ اپنا حمت پرست مجاہد ہے۔ اس کے لیے خاتون کو وزیر آبلو پہنچانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ وہ پورا بھروسے کا آدی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر تم تیاری شروع کر دو۔ شام کا اندھیرا ہوتے ہی تمہیں رضیہ بہن کو ساتھ لے کر یہاں سے مقبوضہ کشمیر کی طرف نکل جانا ہے لیکن تمہارے ساتھ کسی

مدر عورت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا شمارے پاس کیا انتظام ہے؟

دوسرا مجاہد بولا۔

”سزا ہماری ایک خالد ہے وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔ وہ کشمیر کی رہنے والی ہے۔

ان دونوں بھوپال آئی ہوئی ہے۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

”بالکل ٹھیک ہے اب تم جا کر ضروری تیاری کرو۔ یہاں سے تم جیپ میں جاؤ

گے اور بھوپال سے آگے لاہور پور سے دہلی والی ٹرین پکڑو گے۔ بھوپال سٹیشن سے

ٹرین میں سوار نہیں ہو گے۔“

”اوکے سزا“

اور دونوں مجاہد سلام کر کے چلے گئے۔ میں مکاتو خالد کے پاس ہی بیٹھتا تھا۔ اس

نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”رضیہ بی بی تو خدا کا شکر ہے اپنے گھر پاکستان پہنچ جائے گی۔“

میں نے کہا۔

”لیکن ابھی کلکتے میں اور بدلتی ہوئی رضیہ بھی ہیں جنہیں ہمیں نکال کر پاکستان

پہنچانا ہے اور ہندو درندوں کی قید سے آزاد کرانا ہے۔“

مکاتو خالد بولا۔

”تم مطمئن رہو رضیہ کو بھجوانے کے بعد ہم واپس کلکتے جا کر بیگم دیش سے اغوا

کی ہوئی دوسری عورتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور جن مکتی ہاتھی والوں

نے انہیں اغوا کیا ہے ان سے بھی اس درندگی کا پورا پورا انتقام لیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے بے اختیار کہا۔

جیسے ہی شام کا اندھیرا ہوا مکاتو خالد نے رضیہ کو اپنے دو مجاہدوں کے ساتھ جوں

کشمیر کی طرف روانہ کر دیا۔ اتنا اس نے ضرور کیا کہ رضیہ کو ساڑھی پٹا دی تاکہ کسی

کو اس پر کوئی شک نہ پڑے۔ اب ہمارا مشن ایک بار پھر کلکتے جا کر مشرقی پاکستان سے

اغوا کی ہوئی عورتوں کو بازیاب کرنا اور انہیں اغوا کرنے والوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ جیلہ کو

ہم نے یہی بتایا کہ ہم ایک ضروری کام کے سلسلے میں ناگ پور جا رہے ہیں۔ چند

روز میں واپس آ جائیں گے۔ اب ہم نے اپنے مشن کے سلسلے میں ضروری تیاریاں

شروع کر دیں۔ اس بار مکاتو خالد نے اپنے ساتھ دو آئوٹریک پتول رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک پتول میرے لیے تھا۔ یہ فیصلہ اس امکان کے پیش نظر کیا گیا تھا کہ مجھے انسان

سے سانپ کی شکل میں تبدیل ہوئے کافی دن گزر گئے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں میں کب

انسان کی شکل میں واپس آ جاؤں۔

لیکن مجھے اس کا امکان کم ہی نظر آ رہا تھا۔ مجھے سانپ سے انسان میں تبدیل

ہونے کے پہلے کی سنہاٹ ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پولیس

سٹیشن کی قبر میں ڈسنے والے سانپ نے میرے اندر زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی

اور میرے دورے کا وقت طویل ہو گیا تھا۔ مجھے مکاتو خالد کی خیر کمین گاہ میں چھپے

رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سانپ کے روپ میں تھا اور میں اگر کمین گاہ سے

باہر بھی نکل جاؤں تو مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کمین گاہ کے تقریباً سبھی مجاہد میری

اس کلیا پلٹ سے واقف ہو چکے تھے۔ رضیہ کو متوجہ جوں کشمیر کی طرف بھجوانے کے

دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ میں کمین گاہ میں بیٹھے بیٹھے ہزار ہو گیا تھا۔ دن کا وقت تھا۔

میں نے سوچا کہ ذرا باہر نکل کر کھلی ہوا کی سیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں خاموشی سے

رینگا ہوا کمین گاہ کے دہانے سے نکل کر گڑھے میں آیا اور وہاں سے دیوار پر چڑھ کر

باہر آیا۔

موسم بڑا خوشگوار تھا۔ اگرچہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن دن کی روشنی

خوب پھیلی ہوئی تھی۔ سردی کا موسم رخصت ہو رہا تھا۔ دن کے وقت زیادہ سردی

محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں یونی مزنے مزنے سے رینگتا ہوا پرانی بارہ دری کے پاس

آ کر بیٹھ گیا اور سامنے والے درختوں سے درمیان سے گزرتی پگھڑی کی طرف دیکھنے

لگا۔ اچانک مجھے بین کی آواز سنائی دی۔ یہ میں آپ سے سانپ کی حیثیت سے اپنے

تجربے کی بات بیان کرنے لگا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سانپ پر بین کی آواز کا کوئی اثر

ہوئے میری طرف آہستہ آہستہ بڑھا چلا آ رہا تھا وہ مجھ سے ساتھ ستر گز کے فاصلے پر تھا۔ میں سانپ کی حیثیت سے فوراً سمجھ گیا کہ یہ سپیرا مجھے پکڑنا چاہتا ہے۔ ورنہ وہ کبھی بین اتنی تیز تل اور لے کے ساتھ نہ بجاتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گرمیوں کی دوپہروں میں جب کوئی سپیرا گلی محلے میں سے گزرتا ہے تو وہ بڑی ست لے میں بین بجا رہا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی بین کی لے تیز نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سانپ پکڑنے کے لیے بین نہیں بجا رہا ہوتا۔

لیکن یہ سپیرا جو آہستہ آہستہ بارہ دری کی طرف جہاں میں بیٹھا تھا بڑھ رہا تھا بڑی تیز لے اور تل میں بین بجا رہا تھا۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی اصطلاح میں اس لے کو درت تل کہتے ہیں۔ یعنی سپیرے نے مجھے یا تو دور سے دیکھ لیا تھا یا پھر اس نے میری بو محسوس کر لی تھی۔ وہ میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ پرانے تجربہ کار سپیروں کو سانپ کی بو دور سے آ جاتی ہے۔ میں نے ابھی اس سپیرے کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بچپن کھول لیا تھا اور بین کی تل پر بچپن کو لہرانے لگا تھا۔ میں نے ارادہ بھی کیا اور کوشش بھی کی وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن بین کی لے کاری اور تیز تل کا مجھ پر اس قدر شدید اور مسلسل اثر پڑ رہا تھا کہ میں کوشش کے بلوجود وہاں سے بھاگ نہ سکا۔ سپیرا میرے قریب پہنچ چکا تھا۔

جیسے میری نگاہ اس پر پڑی وہشت کے مارے میرا سارا بدن جھنجھٹا اٹھا۔ یہ سپیرا وہی دیہاتی بوڑھا تھا جس کو میں نے کان پور کے شیشوں پر دیکھا تھا اور جس نے جہانمی کے شیشوں تک ہمارا تعاقب کیا تھا اور ہمارے خیال میں جو جہانمی میں ہی رک گیا تھا اور جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور مکائنڈو خالد کا پیچھا کر رہا ہے۔ تب مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ یہ بوڑھا دیہاتی سپیرا تھا اور مکائنڈو خالد کا نہیں بلکہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے علم کے زور سے یا میرے جسم سے نکلنے والی خاص بو کی وجہ سے محسوس کر لیا تھا کہ میں حقیقت میں سانپ نہیں ہوں، انسان ہوں جس نے سانپ کا روپ اختیار کر رکھا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی

نہیں ہوتا۔ کیونکہ سانپ کے تو کان ہی نہیں ہوتے، وہ بین کی آواز سن ہی نہیں سکتا۔ وہ تو محض سپیرے کے بین ہلانے سے اور اور بچپن پھیلا کر ہلانے لگتا ہے، یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں سانپ پر ہر آواز کا اثر ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے کان نہیں ہوتے مگر وہ ہر آواز کو سن لیتا ہے۔ آواز کی لہریں جب اس کے جسم سے ٹکراتی ہیں اور یہ لہریں اپنے ارتعاش سے سانپ پر پورا اثر ڈالتی ہیں۔ خاص طور پر بین کی آواز کا سانپ پر بہت زیادہ اور فوری اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ سپیرا بین کی لے کو تیز بجاتا ہے اور اس کی تل بھی تیز ہوتی ہے۔ جب بین میں سے ٹک، ٹک، ٹک، ٹک کی مسلسل اور جلدی جلدی آواز نکلتی ہے تو سانپ کے جسم پر اس BEAT کا ہمدست اثر ہوتا ہے۔ اس تل کی تیز لے پر سانپ جھومنے لگ جاتا ہے۔ سپیرے کو جب کوئی سانپ پکڑنا ہوتا ہے تو وہ یہی حربہ استعمال کرتا ہے۔ سانپ کے تل کے باہر بیٹھ کر وہ بین بجاتے ہوئے اپنی لے اور تل کو آہستہ آہستہ تیز سے تیز تر کرتا جاتا ہے۔ اس تل کے اپنے جسم پر مسلسل ٹکراؤ کی وجہ سے سانپ بے حل ہو کر تل سے باہر آ جاتا ہے۔ بین کی تل کی ضربیں اس کے جسم پر بارش کے قطروں کی طرح مسلسل پڑ رہی ہوتی ہیں۔ سانپ اپنی سادہ بدھ بھول جاتا ہے اور سپیرے کے آگے بے بس ہو کر دائیں بائیں جھومتا ہے اور پھر تھک کر اس کے آگے سر ڈال دیتا ہے اور چلاک سپیرا اسے پکڑ کر پٹاری میں بند کر لیتا ہے۔

بارہ دری کے قریب بیٹھے بیٹھے مجھے سپیرے کی بین کی آواز آئی تو میرا جسم بے چین ہونے لگا۔ کیونکہ سپیرا بڑی تیز تل کے ساتھ بین بجا رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں انسان کی طرح بول لیتا تھا انسان کی طرح سوچ سکتا تھا اور سانپ سے الگ ہو کر انسان کی آنکھوں سے اسے دیکھ بھی سکتا تھا لیکن اس کے بلوجود میں انسانی وجود میں نہیں تھا۔ میں سانپ کے وجود میں تھا۔ بین کی لے اور تل بہت تیز تھی اور میرے جسم پر اس کی ضرب مسلسل پڑ رہی تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں اس طرف گردن موڑ کر دیکھا جس طرف سے بین کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ایک سپیرے کو دیکھا جو بین بجاتے

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ سپیرا میرے اس قدر قریب پہنچ گیا تھا کہ مجھے اس کی سرخ آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور بغیر پلکیں جھپکے مسلسل میری طرف گھور رہی تھیں۔ سپیرا اپنی بین کی لے کو بے حد تیز کرتا جا رہا تھا گرمی کا موسم نہیں تھا مگر اس بوڑھے سپیرے کی چیشلی سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے جسم میں طاقت نہیں رہی۔ میرا بچن لہرانے کی بجائے ڈولنے لگا تھا۔ میرا بچن بھی اپنے آپ سنا جا رہا تھا میں کوشش کر کے سر کو اوپر اٹھاتا تو وہ پھر نیچے کو گر پڑتا۔ میرا انسانی ذہن پوری طرح بیدار تھا اور فرار ہونے کی ترکیبیں دھڑا دھڑا سوچ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے زور زور سے چلاتا اور مدد کے لیے پکارنا شروع کر دینا چاہیے۔ میری آواز سن کر خیرہ کین گاہ سے جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی لوگ ضرور میری مدد کو پہنچ جائیں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سپیرے نے پلک جھپکنے میں اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ لگتے ہی مجھے میری آواز خشک ہو گئی اور میں کوشش کے باوجود اپنی انسانی آواز نہ نکال سکا۔ شاید بوڑھے سپیرے کو بھی میرے ارادے کا علم ہو گیا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ میں انسانی آواز میں شور نہ مچا دوں، اس نے میری گردن نہ چھوڑی اور اس طرح مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ کر اٹھا اور تیز قدموں سے درختوں کے درمیان جو گھنڈڑی تھی اس طرف چل پڑا۔ مجھے اپنا سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اپنے دوستوں سے دور ہوتا جا رہا تھا بوڑھا سپیرا مجھے اپنی کلائی کے ساتھ لپیٹے میری گردن انگلیوں میں جکڑے پکی سڑک پر آگیا جس کو پار کر کے وہ سامنے والے کھیتوں میں چلے لگا۔



تھی کہ وہ میرا پیچھا اس لیے کر رہا تھا کہ مجھے پکڑ کر اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ بہر حال جب میں نے بوڑھے دہاتی کو سپیرے کے لباس میں پہچان لیا اور یہ حقیقت بھی مجھ پر مکمل گئی کہ وہ مجھے پکڑنے کے ارادے سے آیا ہے اور اب میری خیر نہیں ہے تو میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت اور انسانی ذہن کی پوری قوت ارادوی کو جمع کر کے اپنے آپ کو وہاں سے بھاگ کر لے جانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں جب بھی اپنے آپ کو پیچھے لے جانے کی کوشش کرتا مجھے بین کی تل کا جھٹکا سا لگتا اور مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے میرے سانپ والے بدن میں طاقت نہیں رہی اور میں انتہائی کمزور ہو چکا ہوں۔

عیار بوڑھا سپیرا بھی شاید میری کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔ اس نے بین کی لے اور تیز کر دی اور مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور بین بھاگتے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف کھینکے لگا۔ اس کے کندھے سے ایک کپڑے کا تھملا لٹک رہا تھا جس میں ضرور سانپوں کو بند کرنے والی پٹاری ہوگی۔ میں جلیبی کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ میری گردن اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور بچن کھلا تھا۔ میرے دل میں خیال ضرور آتا کہ میں اپنی انسانی آواز نکال کر اسے ڈرا دوں۔ اس سے کہوں کہ میں شوجی مہاراج کا خاص سانپ ہوں اور اگر اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو اس پر دیوتیوں کا عذاب آئے گا۔ لیکن یہ سوچ کر میں نے فوراً اس خیال کو ذہن سے نکال دیا کہ ابھی تو سپیرے کا قیاس یہ ہے کہ میں انسانی سانپ ہوں۔ اگر میں نے اس کے ساتھ انسانی آواز میں بات کی تو اس کو پورا یقین ہو جائے گا کہ جس سانپ کی اسے تلاش تھی وہ میں ہی ہوں اور پھر تو یہ کسی صورت میں مجھے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنی طرف سے اپنے انسان ہونے کا راز راز ہی رہنے دیا۔ کیونکہ مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ انسانی آواز میں بولنے کے بعد بھی میرے اندر کوئی خاص طاقت پیدا نہیں ہو جائے گی اور میں پھر بھی سپیرے کے ہاتھوں پکڑا جاؤں گا۔ چنانچہ میں انسانی آواز میں بولنے کی بجائے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔

بات اس پر ثابت ہو جائے گی کہ میں اصل میں انسان ہوں اور میں نے سانپ کا روپ اختیار کیا ہوا ہے۔ پھر تو یہ مجھے کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ یہ اس کی چال ہے۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیا واقعی میں سانپ نہیں بلکہ انسان ہوں۔ وہاں کسی کو شور مچا کر بلانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ لوگ تو ویسے بھی ایک سانپ کو انسان کی آواز میں بات کرتے دیکھ کر ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں بالکل نہیں بولوں گا اور اس بوڑھے مکار سپیرے پر یہ راز کبھی افشا نہیں کروں گا کہ میں سانپ نہیں بلکہ انسان ہوں۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔

بوڑھے سپیرے نے میری گردن تو چھوڑ دی تھی مگر مجھے پوری طرح سے قابو کیا ہوا تھا اور میں اس کی گرفت سے نکل کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر تم اپنا آپ مجھ پر ظاہر کر دو اور انسان کی آواز میں مجھ سے کوئی بات کر لو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں سانپ کے جسم سے نکل کر انسان کے روپ میں واپس لے آؤں گا۔ میرے گورو کے پاس شوناگ کے منتر کا توڑ موجود ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا اور وہ منتر پڑھ کر تمہیں سانپ سے انسان بنا دے گا۔“

یہ بھی اس عیار سپیرے کی ایک چال تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی مار پر ہے۔ وہ یونہی کلن پور سے میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ اس کو میری بو سے محسوس ہو گیا تھا کہ میں سانپ کی شکل میں انسان ہوں۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے قبضے میں کر کے مجھ سے کوئی زبردست کام لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لیے شرط تھی اور ضروری تھا کہ میرا انسان ہونا ثابت ہو جائے۔ ابھی تک اس پر یہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ میں واقعی سانپ کی شکل میں انسان ہوں۔ اگر میں ذرا بول دیتا تو یہ بات ثابت ہو جاتی اور پھر مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ میں خاموش رہا۔ بوڑھے سپیرے نے ایک بار پھر میری گردن مضبوطی سے پکڑ لی اور بین زبانی پر رکھ کر بائیں ہاتھ سے



میرے لیے یہ ایک بلائے نامکملی تھی۔

میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میرے دل میں کمین گاہ سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں سیر کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ کچھ توں میں ابھی لوٹنی فصل کھڑی تھی۔ بوڑھا سپیرا ایک جگہ کھیت کی میندھ پر بیٹھ گیا۔ اس کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ابھی تک گردن سے پکڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے انگلیوں کی گرفت میری گردن پر ڈھیلی کر دی اور اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر مجھے اپنی سرخ انگارہ ایسی آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور بولا۔

”میں جانتا ہوں تم میری آواز سن رہے ہو۔ میں جانتا ہوں تم سانپ نہیں ہو۔ تم انسان ہو اور تمہیں کسی سپیرے نے شوناگ کا منتر پڑھ کر سانپ بنا دیا ہوا ہے۔ میرے پاس اس منتر کا توڑ نہیں ہے۔ میں تمہیں انسانی شکل میں واپس نہیں لا سکتا لیکن اگر تم مجھ سے اپنی انسانی آواز میں کوئی بات کرو گے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ بتاؤ، تمہارا نام کیا ہے؟“

میں اب شور مچا کر اپنے ساتھی مجاہدوں کو نہیں بلا سکتا تھا۔ میں ان سے بہت دور ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس مکار سپیرے نے ضرور کسی خاص مقصد کے لیے مجھے پکڑا ہے۔ اس کے لیے میں ایک نایاب سانپ ہوں اور وہ اپنا مقصد پورا کیے بغیر مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اگر میں نے اس کے ساتھ انسان کی آواز میں کوئی بات کی تو یہ

تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ اگر تم مجھ سے انسان کی آواز میں بات کرو گے تو مجھے خوش ہوگی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن جائیں گے۔ میں تمہیں اپنے گورو سپیرے کے پاس لے جا کر سنایپ سے انسانی شکل میں واپس بھی لے آؤں گا۔ اس کے بعد میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا کہ ہم دونوں ملا مل ہو جائیں گے۔ ہمارا میں امیر سے امیر اور دھن دان سے دھن دان بھی ہماری دولت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ بولو کیا کہتے ہو۔“

میں پھر بھی خاموش رہا اور زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ بوڑھے سپیرے نے سر ہلایا اور بولا۔

”تم بڑے ضدی آدمی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ میں بھی اس وقت تک تمہیں اپنی قید میں رکھوں گا جب تک کہ تم مجھ سے انسان کی آواز میں بات نہیں کرتے۔ میں نے تم پر ایسا انجی منتر پڑھ کر پھونکا ہے کہ تم اپنی جگہ سے زیادہ بل جل نہیں سکو گے اور میں اگر تمہیں میدان میں نکلا بھی چھوڑ دوں گا تو تم وہاں سے بھاگ نہیں سکو گے۔ میرے منتر کے اثر سے تم اسی طرح سنایپ کی شکل میں ہی رہو گے۔ بتاؤ کیا سوچا ہے تم نے؟“

میں اس کے بلوجود خاموش رہا۔ کوئی بات نہ کی۔ بوڑھے سپیرے نے مجھے اٹھا کر پٹاری میں بند کیا۔ پٹاری جھولے میں ڈالی اور لاشی نیکتا ایک طرف چل پڑا۔ میں پٹاری میں بند تھا۔ پٹاری کو اس نے کپڑے میں باندھ رکھا تھا۔ مجھے باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاں جیلہ کے جسم کی اور کلمنڈو خالد کے جسم کی بو ضرور آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ دونوں بوئیں ہلکی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ بوڑھا سپیرا مجھے پٹاری میں بند کر کے شہر سے دور نکلتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ کسی ایسی جگہ پر آ کر رک گیا جہاں موٹر گاڑیوں اور لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں سے بوڑھا سپیرا ایک رکشے میں سوار ہو گیا۔ رکشا دیر تک چلتا رہا۔ وہ جہاں رکا وہاں بھی لوگوں کی کافی آوازیں تھیں۔ ان آوازوں میں ریل گاڑی کے انجن کی آواز آتی تو میں سمجھ گیا کہ سپیرا

زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور دھیمی آواز میں عجیب و غریب قسم کے منتر پڑھنے شروع کر دیے۔ منتر پڑھتے پڑھتے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے ہاتھ میں لی ہوئی تھوڑی سی مٹی میرے اوپر ڈال دیتا۔ میرے جسم میں پہلے ہی کافی کمزوری آ چکی تھی۔ اس کے منتر پڑھ کر میرے اوپر مٹی ڈالنے سے مجھے ایسے لگا جیسے میری رہی سہی طاقت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

کچھ توں میں خاموشی تھی کوئی کسان وغیرہ وہاں نہیں تھا۔ کوئی آتا جاتا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوڑھا سپیرا بڑی بے فکری سے منتر پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونک بھی رہا تھا اور مجھ پر مٹی بھی ڈالتا جا رہا تھا۔ ایک بار اس نے مجھ پر مٹی ڈالی تو مجھے اپنا جسم پہلے سے زیادہ بوجھل محسوس ہونے لگا۔ بوڑھے سپیرے نے میری گردن پر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میری گردن اس کے ہاتھ میں ڈھلک گئی۔ وہ برابر منتر کا چاپ کرتا جا رہا تھا اور مجھ پر تھوڑی مٹی ڈالتا جا رہا تھا۔ جب اس کے ہاتھوں کی مٹی ختم ہو گئی تو اس نے زور سے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور مجھے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

میں زمین پر بے جان سا ہو کر گر پڑا۔ میں نے کھیت کی فصل میں بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن میرا جسم اتنا بوجھل ہو گیا تھا کہ میں تھوڑا سا رینگ کر وہیں رہ گیا۔ ایسی میری حالت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بالکل وہی کیفیت تھی جیسے آدمی خواب میں کسی چیز کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے پاؤں من من بھاری ہو جاتے ہیں اور دوڑ نہیں سکتا۔ آپ کو بھی شاید خواب میں اس کا تجربہ ہوا ہو گا۔ میری بھی وہی حالت ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین بار فرار ہونا چاہا لیکن میرا جسم اتنا بوجھل اور بھاری ہو چکا تھا کہ میں ایک دو انچ رینگ کر وہیں رہ گیا۔

تب بوڑھے سپیرے نے جھک کر کہا۔

”تم مجھ سے کب تک اپنا آپ چھپاؤ گے؟ میں تمہیں ایک بار پھر موقع دیتا ہوں۔ مجھ سے انسان کی آواز میں بات کرو۔ میں جانتا ہوں تم میری آواز سن بھی رہے ہو اور انسان کی آواز میں میرے سوال کا جواب بھی دے سکتے ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں“

کوئی دیران علاقہ تھا۔ کسی گاڑی، موٹر یا آدی کی کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ ایک بار صرف ایک ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی جو آسمان پر سے گزر رہا تھا۔ یہ آواز بھی آہستہ آہستہ دور دورے ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ پھر پرندوں کی آواز آئی۔ یہ آوازیں بھی پیچھے رہ گئیں اور خاموشی چھا گئی۔ بوڑھا سپیرا ایک خاص پنی تلی رفتار سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ خدا جانے وہ مجھے کہاں لیے جا رہا تھا۔ ایک تیل گاڑی قریب سے گزری۔ مجھے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز آئی۔ کسی رہائی نے بوڑھے سپیرے کو مخاطب کر کے کہا۔

”پرنام میرو داول۔“

”پرنام بھیا۔“

بوڑھے سپیرے نے جواب میں کہا۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ اس سپیرے کا نام میرو ہے اور وہ کسی ایسی ہستی کے قریب پہنچ گیا ہے جہاں لوگ اسے جانتے ہیں۔ کسی آنے کی چکی کے چلنے کی آواز دور سے آ رہی تھی۔ یہ چکی کے انجن کی ٹک ٹک کی آواز تھی۔ یہ آواز دور ہو گئی۔ لگتا تھا ہم ہستی سے بھی دور نکل آئے ہیں۔ میں بوڑھے سپیرے کو کھلی دے کر پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کہاں لیے جا رہا ہے مگر میں انسانی آواز نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ بولنے سے میرا راز فاش ہو جاتا۔ میں میرے شکر کر کے پٹاری میں خاموش پڑا رہا۔ بوڑھے سپیرے کو لاری سے اتر کر پیدل چلے آؤا۔ کھنڈ ضرور گزر گیا تھا۔ کم بخت ایسا چاق و چوبند بوڑھا تھا ذرا نہیں تھا تھا۔ آخر ایک جگہ وہ رک گیا۔ وہ بیٹھ گیا تھا۔ پھر ایسا لگا جیسے اس نے اپنا جھولا کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ مجھے پانی کی آواز آئی۔ بوڑھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ شاید یہ کوئی ندی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا سپیرا وہاں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد پھر آگے روانہ ہو گیا مگر اب وہ قدم قدم چل رہا تھا، لگتا تھا کہ اس کی منزل آگئی ہے۔ دور سے کچھ بچوں کے کھیلنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آئیں۔ بوڑھا سپیرا رک گیا۔ کسی نے اس کو پکار کر کہا۔

”میرا تم اندر بیٹھو میں آ رہا ہوں۔“

میرا سپیرا چند قدم چل کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ جھولے کو اس نے اپنے گھنٹوں

ریلوے سٹیشن پر آ گیا ہے اور مجھے یہاں سے کسی دوسرے شہر لے جا رہا ہے۔ میری سوچنے سننے اور محسوس کرنے کی حس اسی طرح نارمل حالت میں تھی۔ صرف میرا جسم سن ہو کر بوجھل ہو گیا ہوا تھا اور میں اسے مرضی کے مطابق زیادہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

بوڑھا سپیرا کسی ٹرین میں سوار ہو گیا۔

ٹرین کسی طرف جا رہی تھی؟ مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ شروع میں مجھے وقت کا کچھ احساس رہا۔ پھر یہ اندازہ بھی جاتا رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ ٹرین مختلف سٹیشنوں پر رکتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں پٹاری میں بند پڑا تھا۔ مجھے اب نہ مکانات و خلد کی بو آ رہی تھی نہ جیل کے جسم کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ یہ لوگ مجھ سے بہت دور ہو چکے تھے۔ شاید ٹرین ایک دن اور ایک رات چلتی رہی تھی۔ اس دوران بوڑھا سپیرا ٹرین سے کئی بار اترا تھا۔ ایک بار وہ اترا تو مجھے سنائی دیا کہ وہ کسی سے دو سری ٹرین کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ یہ سپیرا اتنا عیار تھا کہ اس نے کسی سے پوچھتے ہوئے شرفیغہ کا نام نہیں لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں شہر کا نام سن لوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے معلوم ہو کہ وہ مجھے کہاں لیے جا رہا ہے۔ یہاں اس نے ٹرین بدلی تھی۔ یہاں سے آگے پھر ریل گاڑی کا طویل سفر شروع ہو گیا۔ ہندوستان کا ملک بڑا کشادہ ملک ہے۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب کی طرف جائیں تو تین تین دن گاڑی چلتی رہتی ہے۔

اس دوران بوڑھے سپیرے نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی پٹاری سے باہر نہیں نکالا تھا۔ مجھے باہر نکلنے کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سانپ کسی کئی دن کچھ کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ آخر ایک جگہ وہ ریل گاڑی سے اتر کر کسی لاری میں سوار ہو گیا۔ لاری اوپنی جگہوں پر دیر تک چلتی گئی۔ کئی دیر بعد ایک جگہ رک گئی۔ مسافروں کے اترنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہاں لوگ ٹھیک ٹھاک اردو زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ سپیرا پیدل چل رہا ہے۔ شاید

اسے ہلاک کر دے۔ میں اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہلنا ضرور تھا لیکن ڈسنے کے لیے جتنا منہ کھولنے کی ایک سانپ کو ضرورت اور دانت گاڑنے کے لیے جتنی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں نہیں رہی تھی۔

بوڑھے سپیرے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میں تمہیں جہل لے کر آگیا ہوں یہاں سے تم کبھی واپس نہیں جاسکو گے۔ تمہارے لیے یہی مہتر ہے کہ مجھ کو اپنا بھیدی بنا لو۔ مجھ سے آدمیوں کی طرح بات کر کے بتا دو کہ تم آوی ہی ہو اور تم پر فلاں سپیرے نے منتر کر کے تمہیں سانپ بنا دیا تھا۔ بولو۔“

میں نے تو فیصلہ کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے یہ راز میں اس مکار کو نہیں بتاؤں گا۔ یہی ایک چیز میرے پاس باقی رہ گئی تھی جس کی میں پوری طرح حفاظت کر رہا تھا اور جس پر میرا اختیار بھی تھا اور اس عیار سپیرے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کے پاس ایسا کوئی منتر نہیں تھا جس کو پھونک کر وہ مجھے انسانوں کی طرح بولنے پر مجبور کر سکے۔ میں جب رہا بوڑھے سپیرے کے پھر گیا۔

”تم میرے دوست بن جاؤ۔ میں تمہیں دنیا کا سب سے بڑا دھن وان سب سے بڑا دولت مند بنا دوں گا۔ لوگ دور دور سے تمہاری پوجا کرنے آئیں گے اور تمہارے قدموں میں سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیں گے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ تم دن میں ایک بار اپنے پیچاریوں کے آگے انسانی آواز میں ایک اشلوک پڑھ دیا کرو۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کسی مندر میں رکھ کر لوگوں کو احقر بنا کر یہ مشہور کر کے میری اندھا دھند پوجا کروانا چاہتا تھا کہ میں شوشی دیوتا کا مقدس سانپ ہوں اور میرے اندر شوشی بول رہے ہیں۔ اس طرح سے وہ میرے ذریعے خود بے پناہ دولت کماتا چاہتا تھا۔ مجھے خیال بھی آیا کہ اگر میں اس پر یہ ظاہر کر دوں کہ میں واقعی انسانی آواز میں بات کر سکتا ہوں تو یہ مجھے کسی مندر میں ہی بٹھائے گا۔ میں وہاں سے آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ یہ مکار سپیرا اتنا احقر اور گدھا نہیں ہے کہ آسانی سے

پر رکھ لیا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں وہی آدمی جس نے اسے آواز دی تھی۔ اس کی آواز قریب سے آئی۔

”کو دادا کہاں گئے تھے؟ کوئی کمائی وغیرہ ہوئی؟ بڑے دن لگا دیے ہیں اس بار؟“

بوڑھے سپیرے نے جواب دیا۔

”لوگ بھاگ سانپوں کا تماشہ اب نہیں دیکھتے۔ بچے بھی دوسرے کھیل کھیلے ہیں۔ سانپ کا تماشہ دکھاؤں تو ان کی نائیں انہیں پکڑ کر گھروں میں لے جاتی ہیں کہ ناگ ڈس لے گا۔“

پھر بوڑھے سپیرے نے اس آدمی سے پوچھا۔

”مرادی آیا تھا؟“

دوسرے نے کہا۔

”کل آیا تھا۔ کہتا تھا یہ دادا آئے تو اسے کہنا میں اگلے دن رات کو آؤں گا۔“

”شاید آج آجائے۔“

”ہاں دادا تمہارے لیے پھڑی لاؤں۔ تیری بوٹے آج پھڑی پکائی ہے۔“

”لے آؤ۔“

دوسرا آدمی چلا گیا۔ بوڑھے شکاری نے جھوٹے میں سے ہٹاری نکالی، اس کا ڈھکانا کھولا اور مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس کے ہاتھ میں عجیب طاقت تھی۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آیا مجھ پر اور زیادہ غائب طاری ہو گئی اور میں کوشش کے باوجود بوڑھے سپیرے کے ہاتھ پر نہ ڈس سکا۔ لیکن وہ اتنا تجربے کار اور پرانا سپیرا تھا کہ اگر میں ڈس بھی لیتا تو اس کے پاس میرے زہر کا توڑ ضرور موجود تھا۔ اس قسم کے پرانے اور تجربہ کار بوڑھے سپیروں کے پاس شو ناگ کا منکا ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ ان پر زہریلے سے زہریلے سانپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ انہیں ایسے منتر یاد ہوتے ہیں کہ جن کے پھونکنے سے سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن میں نے اس خیال سے اسے ڈسنے کی کوشش کی تھی کہ شاید میرا زہر

جس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ لیٹ گیا ہے۔ کافی وقت گزرنے کے بعد کسی بارے سے آواز دی۔

”ارے میرو دادا! اندر ہو کیا؟“

بوڑھا شکاری جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بولا۔

”مراری! اندر آ جاؤ۔ میں تمہاری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔“

کوئی آدمی اندر آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا نام مراری تھا۔ مراری نے پوچھا۔

”کو، کوئی پھلتا ہوئی؟ کچھ ملا؟“

بوڑھے شکاری نے غرط مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ارے مراری! لکشی دیوی ہم پر مہربان ہو گئی ہے۔ آج کل ایسے سانپ کہاں

پلتے ہیں جو آدمی کی جون میں آ جاتے ہوں لیکن لکشی دیوی ہم پر مہربان تھی۔ مجھے

ایک ایسا سانپ مل گیا ہے۔“

مراری نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

”کہاں ہے یہ سانپ؟ مجھے دکھاؤ جلدی دکھاؤ۔ اورے ہم تو کوڑھتی بن جائیں

گے۔“

یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم راز لگتے تھے۔ بوڑھے سپیرے نے چارپائی کے

نیچے سے پٹاری نکال کر اپنے آگے چارپائی پر رکھی اور اسے کھول کر بولا۔

”دیکھو۔ یہ ہے وہ سانپ۔“

جھونپڑی میں لائین روشن تھی۔ رات ہو گئی تھی۔ اس کے ہم راز ساتھی مراری

نے جھک کر مجھے دیکھا اور بولا۔

”دادا! کیا یہ آدمی کی طرح ہوتا ہے؟“

بوڑھا شکاری کہنے لگا۔

”بس یہی ایک مصیبت ہے، یہ آدمی کی آواز جان بوجھ کر نہیں نکال رہا۔ ارے

میرا تجربہ بتا رہا ہے اور اس کے جسم سے وہی بو آ رہی ہے جو ایک منٹ ناگ کے جسم

مجھے فرار ہونے کا موقع دے دے۔ اس کو بھی معلوم ہے کہ میں فرار ہو سکتا ہوں۔ یہ کوئی ایسا منتر پڑھ کر مجھ پر پھونک دے گا کہ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکوں گا یا تھوڑی سی حرکت ہی کر سکوں گا۔ اس کا علاج تو ایک ہی تھا کہ میرا دورہ ختم ہو جائے اور میں خود بخود سانپ سے اپنی انسانی شکل میں واپس آ جاؤں اور یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ پھر یہ خیال بھی آتا کہ مجھ پر سپیرے نے جو نیم بے ہوشی کا منتر پھونکا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے انسان بن جانے پر بھی وہ اثر میرے جسم پر قائم رہے اور میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکوں۔ غرض کہ میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ لیکن یہ میں نے عمد کر لیا تھا کہ میں سپیرے پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ میں انسان کی طرح بات کر سکتا ہوں۔

صرف اسی طرح میں اسے شکست دے سکتا تھا۔

میں ایک جھونپڑی میں تھا جس کے دروازے میں سے ڈوہڑے سورج کی چمکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہاں بھوپال والی سڑی نہیں تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہندوستان کا جنوبی علاقہ ہے۔ جھونپڑی کے دروازے میں سے باہر دیران میدان تھا جس میں دو ایک دو جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید یہ سپیروں کی کوئی بستی تھی۔ باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ آئی تو بوڑھے سپیرے نے جلدی سے مجھے پٹاری میں بند کر کے پٹاری چارپائی کے نیچے رکھ دی۔ وہی آدمی جس نے بوڑھے شکاری سے کچھڑی کے بارے میں کہا تھا، کیلے کے چوں میں اس کے لیے کچھڑی اور پانی لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔

”دادا! لو کچھڑی کھاؤ، پانی بھی لے آیا ہوں۔“

بوڑھا شکاری بولا۔

”جیتے رہو بیٹا۔“

دونوں آپس میں دوسرے سپیروں اور سانپوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ آدمی چلا گیا۔ سپیرا چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے چارپائی کے چرچانے کی آواز آئی تھی

”مراری! راجہ کا پپ بھی بیس لاکھ طلائی مرہیں دے گا۔ تم مجھے اس کے پاس تو لے چلو۔“

مراری بولا۔

”واو! لے تو میں جاؤں گا۔ پر یہ سوچ لو اگر تمہارا سناپ آدمی کی بولی نہ بولا تو ہم دونوں کی خیر نہیں۔“

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

”مراری! یہ ضرور بولے گا، ضرور بولے گا۔ تم منتہری سے بات کرو، جاؤ۔“

میں دل میں بڑا حیران رہ رہا تھا کہ آخر یہ عیار سپیرا اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ رہا ہے کہ میں راجہ کے آگے اتنی آواز میں بول پڑوں گا۔ بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس مکار سپیرے نے دل میں کیا سوچا ہوا ہے۔ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ راجہ کے دربار میں جا کر مجھ پر ضرور کوئی خاص قسم کا طلسمی منتہر ہوئے گا جس کے اثر سے میں اپنے آپ بول پڑوں گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں زبان نہیں کھولوں گا۔

وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن مراری نے آکر بوڑھے سپیرے کو بتایا کہ راجہ کے منتہری نے اپنے محل میں بلایا ہے۔ بوڑھا سپیرا اسی وقت اس کے ساتھ چل پڑا۔ جس پٹاری میں میں بند تھا وہ اس نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ یہ میرے کڑے استحقاق کا وقت تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ راجہ کے دربار میں جا کر کیا ہو جائے۔ اگر اس پرانے پاپی سپیرے نے کوئی ایسا منتہر پڑھ دیا جس کا مجھ پر اثر ہو گیا اور میں اپنے آپ بول پڑا تو یہ میری شکست اور اس بد معاش کی فتح ہوگی جو میں نہیں چاہتا تھا۔ یہ خاص منتہر اس بوڑھے سپیرے نے آخری وقت کے لیے شاید اسی لیے بچا کر رکھا ہوا تھا۔

میں پٹاری میں بند تھا دیکھ نہیں سکتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور یہ لوگ مجھے لے کر کہاں آگئے ہیں۔ باہر کی آوازیں سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہم کسی بڑے محل میں آگئے ہیں۔ جگہ جگہ بوڑھے سپیرے اور مراری سے پوچھ گچھ ہوتی کہ کون ہو،

سے آتی ہے مگر یہ بڑا چلاک آدمی ہے۔ منہ بند کر کے بیٹھ گیا ہے۔ میرے لالچ دینے پر بھی نہیں بولتا۔“

مراری بھی کوئی سپیرا تھا۔ اس نے مجھے اٹھا کر سونگھا اور بولا۔

”دادا! ہے تو یہ منٹھ سناپ۔ اسے تم نے تو کمال کر دکھایا دادا۔ راجہ سے ہم دس لاکھ سونے کی مرہیں لیں گے۔ پوری دس لاکھ۔ مگر دادا! جب تک یہ سناپ آدمی کی زبان میں کوئی بات نہیں کرے گا راجہ تو ہمیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے گا۔ بلکہ اٹنا ہمیں ریاست کی جیل میں بند کر دے گا، جہاں سے ہم کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔ وہیں مرکپ جائیں گے۔“

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

”یہ ضرور بولے گا“ یہ ضرور بولے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ تم مجھے راجہ کے پاس تو لے کر جاؤ۔ راجہ کے سامنے جا کر یہ سناپ اپنے آپ آدمی کی آواز نکالے گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“

مراری کہنے لگا۔

”پہلے ہمیں راجہ کے منتہری جی سے ملنا ہوگا۔ وہ سلا بھی تو انعام میں سے اپنی پتی مانگے گا۔ اس کو بھی ایک حصہ دینا ہوگا۔“

بوڑھا سپیرا بولا۔

”ہم راجہ سے بیس لاکھ مرہیں طلب کریں گے۔ اس میں سے ایک حصہ منتہری کو دینے کے بعد بھی ہمارے پاس بہت کچھ بچ جائے گا۔“

مراری نے کہا۔

”میرا دھار کتا ہے کہ راجہ اس سے بھی زیادہ انعام دے گا۔ آخر اس کی ریاست کی گدڑی کی وراثت کا معاملہ ہے۔ راجہ کیسے گوارا کرے گا کہ اس کے مرنے کے بعد ریاست پر اس کے بھائی کا بیٹا بیٹھ جائے۔“

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

منتری نے کہا۔

”مگر تمہارا منتر نہ چلا تو میری جو بے عزتی ہوگی وہ تو ہوگی مگر تم بھی زندہ نہ بچ سکو گے۔ یہ سوچ لو۔“

بوڑھے شکاری نے اسی پر اٹھو لیجے میں کہا۔

”مہاراج! یہ ضرور بولے گا ضرور بولے گا۔“

تب منتری نے مراری سے کہا۔

”مراری! تم نے اس سپیرے سے میرے حصے کی بات کر لی ہے میں؟ تمہیں راجہ

سے جو انعام ملے گا اس کا تیرا حصہ میرا ہوگا۔“

مراری نے کہا۔

”مہاراج! میں نے بات کر لی ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔“

منتری بولا۔

”تم لوگ یہاں آؤم کو راجہ صاحب سے جا کر بات کرنا ہوں۔“

خدا جانے یہ ہندوستان کی کون سی ریاست تھی۔ کوئی چھوٹی سی گنہم ریاست ہی ہوگی کیونکہ بڑی بڑی ریاستیں تو بھارتی حکومت نے ختم کر دی تھیں۔ منتری کے جانے کے بعد مراری ایک بار پھر بوڑھے سپیرے سے کہنے لگا کہ میرو دادا ایک بار پھر سوچ لو۔ ابھی وقت ہے کہ از کم مجھے ہی بتا دو کہ تم راجہ کے سامنے جا کر اس پر کونسا منتر پڑھو گے۔ بوڑھے سپیرے نے اسے کچھ نہ بتایا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ میری پٹاری لے کر چلے گئے۔ ان کے قدموں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تالینوں پر چل رہے ہیں۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئے۔ مراری اور بوڑھے سپیرے نے کسی کو ہندی سنگرت میں زبردست طریقے سے پٹام وغیرہ کیل۔ منتری کی آواز بلند ہوئی۔

”مہاراج! ادھیراج! بوڑھا سپیرا میرو اوتاری ناگ لے کر آپ کی سیوا میں حاضر

ہے۔“

کہاں جا رہے ہو‘ اجازت نامہ دکھاؤ۔ مراری اس کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ اس کے پاس ریاست کے راجہ کے منتری کا خاص اجازت نامہ تھا جسے دکھا کر وہ محل میں ایک کمرے میں پہنچ گیا جہاں اسے بتایا گیا کہ یہاں بیٹھو۔ منتری جی ابھی تشریف لاتے ہیں۔ دونوں بیٹھ گئے اور آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے بیک وقت پرنام کرنے کی آواز آئی۔

”منتری جی کو مہاراج شو جی کے درشن ہوں۔ مہاراج! میرو سپیرا حاضر ہے۔“

ایک بھاری آواز آئی۔

”کیا وہ سانپ مل گیا ہے؟“

میرو نے کہا۔

”ہاں مہاراج! مل گیا ہے۔ یہ دیکھئے۔ یہ شو جی کے ایک اوتار کا ناگ ہے۔ یہ

دیوتا سان ہے‘ پر سانپ کی جون میں ہے۔“

منتری نے پوچھا۔

”یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ دیوتا ہے‘ اس کو بلا کر دکھاؤ۔ پہلے یہ آدی کی آواز میں

بات تو کرے۔“

میرو نے بڑے اچھوٹے کہا۔

”مہاراج! آپ ہمیں راجہ جی کے حضور لے چلیں‘ میں آپ کو دشواش دلاتا

ہوں وہاں جاتے ہی یہ آدی کی آواز میں باتیں کرنے لگے گا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ پہلے یہاں اس سے بات کر کے دکھاؤ۔ راجہ کے حضور

نہ بولا تو میری بھی بے عزتی ہوگی اور تم دونوں بھی قیدیں ڈال دیے جاؤ گے۔“

خدا جانے بوڑھا سپیرا کیوں اصرار کر رہا تھا کہ کہنے لگا۔

”مہاراج! یہ راجہ کے دربار کے سوا اور کسی جگہ نہیں بولے گا۔ آپ دشواش

رکھیں مہاراج! یہ راجہ کے دربار میں اپنے آپ بولنے لگے گا۔ میرے پاس ایک خاص

منتر ہے جس کا اثر صرف راجہ کے سامنے ہی اس پر ہوگا۔“

”میرو کیا تمہیں پورا وشواش ہے کہ اوتاری ناگ ہی ہے؟“

بوڑھے سپیرے نے عاجزی سے کہا۔

”مہاراج! میری سات سنتائیں ناگوں میں گزر گئی ہیں۔ میں سلتپ کی بوسنگھ کر اس کی نسل کو پہچان لیتا ہوں۔ یہ اوتاری ناگ ہی ہے۔ مجھے پورا وشواش ہے۔“

بادشاہ آواز بھینٹا ”راجہ کی تھی۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”کیا تم اس سے انسان کی آواز میں بات کر سکتے ہو؟ کیونکہ یہی اوتاری ناگ کی پہچان ہے اور ہمیں اسی ناگ کی ضرورت ہے۔“

بوڑھا سپیرا بولا۔

”مہاراج! ہاتھ لگن کو آرسی کیا۔ میں ابھی ناگ سے بات کر کے دکھاتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے میری پٹاری کھول دی۔ مجھے گردن سے پکڑ کر باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی عالی شان محل کے سجے ہوئے کمرے میں ہوں۔

درواروں پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ ستونوں کے پاس سرخ وردیوں والے خلام اوب سے کھڑے تھے۔ چھت منقش تھی جس میں کہیں کہیں بلور کے قیمتی فانوس لگے

تھے۔ میرے قریب ہی مسند پر گھو گئے لگائے ایک بھاری بھر کم ادبی جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، گلے میں ہیرے موتیوں کے ہار تھے، چمکیلی انگوٹھیں اور ریشمی پٹری پاندھے

بیٹھا تھا۔ بوڑھے سپیرے کے پاس ہی مراری اور منتری اوب سے کھڑے تھے۔ بوڑھے سپیرے نے مجھے چاندی کی چھوٹی سی میز پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں جلنے کون سا

طلم تھا کہ اس کا ہاتھ لگتے ہی میرے بدن کی تھمت بڑھ جاتی تھی اور میں زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ سپیرے نے اپنی جیب میں سے ایک کلا دھاگا نکالا اور اسے سامنے

رکھ کر اسی پر منتر پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگا۔ پھر اس نے وہ کلا دھاگا میری گردن میں پاندھ دیا۔ اس کے بعد دوبارہ منتر پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکنا جاتا

تھا ویسے میرے اندر ایک توج سا پیدا ہونے لگا تھا۔ کوئی شے بے اختیار ہو کر میرے

جو میرے سلتپ والے جسم کے اندر کی شکل میں میرے منہ کے قریب آ

رہی ہے۔

بوڑھے سپیرے نے منتر کی آواز تیز کر دی تھی۔ میں چاندی کی میز پر بیٹھا ادھر ادھر بل کھانے لگا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی آواز پر قابو نہیں رہا اور میں

کسی وقت انسانی آواز میں بول پڑوں گا۔ میں اپنی انسانی آواز کو روکنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور آواز کے بلبلے میرے گلے میں آکر جمع ہو رہے تھے اور باہر نکلنے

کو زور لگا رہے تھے۔ منتر پڑھتے پڑھتے بوڑھے سپیرے نے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

میں نے خاموش رہنے کی ہمت کوشش کی لیکن آواز کے بلبلے میرے حلق کے ساتھ ٹکرا کر باہر نکلنے کو زور لگا رہے تھے۔ بوڑھا سپیرا بار بار اونچی آواز میں پوچھ رہا

تھا۔

”تم کون ہو؟ بولو تم کون ہو؟“

اور پھر میرے حلق سے اپنے آپ آواز بلند ہوئی۔ یہ میری اپنی انسانی اور مروی آواز تھی۔ میں نے کہا۔

”میں انسان ہوں۔ میں انسان ہوں۔“

راجہ اور منتری کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”جے ہوشو جی مہاراج کی۔“

اس کے بعد مجھ پر تھمت طاری ہو گئی۔ میں راجہ کو بتانا چاہتا تھا کہ میں کسی دیوتا کا اوتار نہیں ہوں۔ میں ایک مصیبت میں پھنسا ہوا انسان ہوں۔ لیکن اپنے بارے میں

ان کو بتانا بھی میرے لیے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اگر میں اپنی اصل حقیقت وہاں ظاہر کر دیتا تو یہ بات محل تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ ریاست میں اور ریاست کے

”مہاراج! ایک بات اور کہنے والی رہ گئی ہے اس اوتاری ناگ پر میں نے شو ناگ کا منتر پھونک دیا ہے۔ یہ چلے بھی تو بھاگ نہیں سکے گا۔ مہارانی جی کو ہدایت کر دیجئے گا کہ جب تک اوتاری ناگ کمرے میں رہے وہ کمرے کے سارے دروازے بند رکھیں۔“

منتری نے جواب میں کہا۔

”بے فکر رہو۔ جیسا تم کہتے ہو ایسا ہی ہو گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ صبح آکر اپنا انعام و اکرام لے جاؤ۔“

مجھے راجہ کے محل میں چھوڑ کر بوڑھا سپہرا اور مراری ادب سے جھک کر سلام کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں شیشے کے مرتبان میں بند سمنا ہوا پڑا قلم میری گردن میں مکار سپہرا کلا دھاگہ باندھ گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ دھاگہ اس نے کس لیے باندھا ہے۔ میں یہی سمجھا کہ اس کلمے دھاگے کی وجہ سے مجھ پر منتروں کا اثر ہو رہا ہے۔ اگر یہ دھاگہ اتار دیا جائے تو ہو سکتا ہے مجھ پر منتروں کا اثر ختم ہو جائے اور میری توانائی واپس آجائے۔ توانائی واپس آ جانے کی صورت میں میں محل سے فرار ہو سکتا تھا۔

راجہ نے منتری سے کہا۔ ”منتری جی! اوتاری ناگ کو لے کر ہمارے ساتھ آئیں، ہم مہارانی کے پاس جائیں گے۔ بھگون کی کپڑا سے ہمیں اوتاری ناگ مل گیا ہے۔ اب شو جی مہاراج کی کپڑا سے ہم بہت جلد بیٹے کے باپ بن جائیں گے اور ہماری ریاست کو ولی عہد مل جائے گا جو ہمارا نام روشن کرے گا اور ہماری ریاست پر ہمارے بعد راج کرے گا۔ آجائیں ہمارے ساتھ۔“

منتری نے یہ کہہ کر شیشے کا مرتبان اٹھا لیا۔

”مہاراج! بھگون کی کپڑا سے ایسا ہی ہو گا۔“

محل کے کئی بڑے بڑے کمرے تھے جن کی دیواروں پر عئیں پردے لٹک رہے تھے۔ چھت سے جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ جگہ جگہ بلور دی خدمت گار کھڑے

باہر دوسرے شہروں میں یہ بات عام ہو جاتی کہ راجہ کے پاس ایک سپہرا ایسا سانپ لایا ہے جو پاکستانی جاسوس ہے۔ پولیس میری تلاش میں وہاں پہنچ سکتی تھی۔ میں بات کو بردھانا نہیں چاہتا تھا اور یہ سوچ کر خاموش رہا کہ تھوڑی سی قناعت دور ہو جائے تو میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔

بوڑھے شکاری نے مجھ سے کہا۔

”سنو اوتاری ناگ! ہمیں راجہ اور میراج جو حکم دیں اسے پورا کرنا ہو گا۔ کیا ان کا حکم مانو گے؟“

میرے حلق سے آواز کے کچھ بلبلے باہر نکل کر پھٹ گئے اور مجھے اپنی آواز یہ کہتی لگتی دی۔

”میں ہر حکم مانوں گا۔“

اس کے بعد راجہ نے منتری سے کہا۔

”منتری جی! اوتاری ناگ کو ہماری مہارانی کے کمرے میں پہنچا دیا جائے اور میری شکاری کو اس کا پورا پورا انعام دیا جائے۔“

”جو حکم مہاراج! منتری نے سر جھکا کر کہا۔

میرے لیے اسی وقت بلور کا چھوٹا سا مرتبان لایا گیا۔ بوڑھے شکاری نے مجھے اس

میں ڈال کر بند کر دیا اور راجہ سے کہا۔

”مہاراج! تین راتیں یہ اوتاری ناگ مہارانی جی کے کمرے میں رہے گا اور جیسا

میں نے منتری جی کو کہا ہے ویسا ہی کیا جائے گا۔ اگر مہارانی جی کے پاس یہ اوتاری ناگ تین راتیں رہ گیا تو بھگون کی کپڑا سے مہارانی جی کے ہاں بڑا خوبصورت لڑکا پیدا ہو گا جو مہاراج کا نام روشن کرے گا۔“

راجہ نے خوش ہو کر کہا۔

”ہم ایسا ہی کریں گے۔“

بوڑھے سپہرے نے کہا۔

راجہ بولا۔ ”کیوں نہیں۔ میں نے خود اسے بات کرتے سنا ہے۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“

راجہ نے مرتین کا ڈمکن اٹھلایا۔ رانی نے ذرا ڈری ہوئی آواز میں کہا۔
”مہاراج! یہ کیسے آپ کو کٹ نہ لے۔“

راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بوڑھے سپیرے نے مجھے بتا دیا ہے کہ اس نے اس پر جو منتر پڑھ کر پھونکا ہے اس کی وجہ سے اس کے زہر کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ یہ ڈنسا بھی بھول گیا ہے۔“

اور راجہ نے مرتین میں ہاتھ ڈال کر مجھے باہر نکل کر میز پر رکھ دیا۔ میں نے اس دوران کچھ سوچ کر ایک فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ رانی اور راجہ پر کسی ظاہر کون کہ میں شوجی کا اوتاری ناگ ہوں اور سانپ کے روپ میں بانجھ عورتوں کو اولاد زینہ کی نعمت سے ملا مل کرنے کے لیے دنیا میں آیا ہوا ہوں۔ اس طرح سے میں رانی کو اپنے نقوس کے اثر میں لے کر اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکوں گا اور پہل سے فرار ہونے کی کوشش کر سکوں گا۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان لوگوں کے سامنے انسان کی آواز میں بات نہ کرنے اور خاموش رہنے کا اب مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ان لوگوں سے بات کرنے میں ہی میری تھوڑی بہت نجات تھی۔ چنانچہ جب راجہ نے اپنی رانی پر میرا اوتاری ناگ ہونا ثابت کرنے کے لیے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے انسانی آواز میں جواب دیا۔

”اے راجہ! میرا نام دشواستر ہے۔ تو بڑا خوش بخت ہے کہ مجھے حاصل کرنے میں ہی سہیل ہوئے ہو۔“

مہارانی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ راجہ بھی خوشی سے منہل ہو رہا تھا۔ اس نے رانی سے کہا۔

”دیکھا مہارانی! میں نہ کتنا تھا بھگوان نے ہم پر بڑی کپا کی ہے۔ تم نے اپنے

تھے۔ راجہ گزرتا تو وہ جھک جاتے۔ آخر راجہ ایک کمرے کے دروازے پر آکر رک گیا۔ اس نے شیشے کا مرتین منتری سے لے لیا اور اسے واپس جانے کا حکم دیا۔ منتری تنظیم بجالا کر چلا گیا۔

راجہ نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور کہا۔
”مہارانی سدران! میں ہوں بکرم سنگھ۔“

”آجائیں مہاراج۔“

کمرے کے اندر سے نسوانی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ایک حسین عورت مہارانیوں کے لباس میں کھڑی تھی۔ اس نے میرے جواہرات کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ باندھ کر راجہ کو پرنام کیا اور شیشے کے مرتین کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مہاراج! کیا یہی اوتاری ناگ ہے؟“

راجہ اندر آ کر مجلس کلچ پر بیٹھ گیا اور مرتین میز پر رکھ کر بولا۔

”سدران رانی! ہم بڑے خوش نصیب ہیں۔ ہمیں اوتاری ناگ مل گیا ہے۔ بھگوان کی بڑی کپا ہوئی ہے۔ اب تمہاری گود ضرور بھر جائے گی اور رشی مینوں اور جوشیوں کے کہنے کے مطابق تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہوگا جو ہماری ریاست کا وارث بنے گا۔“

رانی نے خوش ہو کر کہا۔

”مہاراج! کیا آپ سچ کہتے ہیں؟“

راجہ نے رانی کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور کہا۔
”ہم سچ کہتے ہیں رانی۔ یہ شوجی مہاراج کا اوتاری ناگ ہے۔ ہمارے بڑے دھن بھاگ تھے کہ سپیرے کو یہ ناگ مل گیا۔“

رانی نے پوچھا۔

”مہاراج! کیا یہ انسان کی آواز میں بات کرتا ہے؟“

کاٹوں سے سن لیا کہ یہ اوتاری ناگ ہے اور اس کا نام دشواستر ہے جو تہوجی مہاراج کا
داس تھا۔“

دونوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنے اپنے سر جھکا دیے۔ میں نے بھی
اواکاری شروع کر دی۔ کیونکہ اب میرا ٹارگٹ بوڑھا سپہا نہیں تھا بلکہ یہ راجہ اور
زیادہ تر اس کی رانی تھی۔ راجہ نے مجھ سے کہا۔

”مہاراج کا ہمارے محل میں آنا ہمارے لیے بڑا نیک شگون ہے۔ مہاراج مجھے
دشواش ہے کہ آپ کی کپا سے میری رانی کی گود ضرور ہری ہو جائے گی۔“

میں نے دل میں کہا ہری ہوگی کہ لال ہوگی یہ تو خدا ہی جانتا ہے لیکن میں تمہاری
رانی کی مدد سے میل سے فرار ضرور ہو جاؤں گا۔ اوپر سے میں نے انسانی آواز میں
کہا۔

”تمہاری رانی کے ہاں تو اب بعد ایک مندر بیٹا پیدا ہو گا۔“
دونوں خوشی سے اچھل پڑے اور ہاتھ جوڑ کر میرے آگے سجدے کرنے لگے۔
میں نے کہا۔

”لیکن میری ایک شرط ہے۔“
”وہ کیا مہاراج۔“ راجہ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔
میں نے کہا۔ ”رانی کو میرا ہر حکم ماننا پڑے گا۔ اگر اس نے میرا کوئی حکم نہ مانا تو
پھر یہ بانجھ ہی رہے گی۔“
رانی نے میرے آگے سر جھکا دی۔

”مہاراج! آپ جو حکم کریں گے میں وہی کروں گی میں تو آپ کی داسی ہوں۔ بس
مجھے ایک بیٹا دے دیجئے۔“

”ہمارا حکم ہوگی تو بیٹا ضرور تمہیں مل جائے گا۔“
مجھے یہ علم نہیں تھا کہ رانی میرے ساتھ کیا کرنے والی تھی یا مجھے رانی کے ساتھ
کیا کرنا تھا۔ یہ سب کچھ شامی محل کے جوشیوں نے راجہ اور اس کی رانی کو سمجھا دیا

ہوا تھا۔ راجہ نے کہا۔

”مہاراج! میں جاتا ہوں۔“

اس نے سر جھکا کر مجھے ہاتھ دیا اور اگلے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ اس کے
جانے کے بعد مہاراج نے دروازے کو بند کر کے چٹخی لگا دی اور آہستہ آہستہ چل کر
میرے قریب آکر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔

”مہاراج! مجھے حکم کیجئے۔“

میں کیا اسے حکم کرتا۔ پہلے تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شامی محل کے جوشیوں
نے اسے کیا ہدایات دے رکھی ہیں۔ لیکن میری توجہ کا مرکز میری گردن میں بندھا ہوا
کلا دھاکہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری گردن سے یہ کلا دھاکہ اتار دیا گیا تو میری
توتانی بحال ہو جائے گی اور میں رانی کو ڈس کر بے ہوش کر دوں گا اور بڑے آرام سے
محل میں سے باہر نکل جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح بمبھال پیچنے کی کوشش کروں گا۔
میں نے کہا۔

”رانی! میری گردن میں جو دھاکہ بندھا ہوا ہے وہ اتار کر پھینک دو۔“

یہ سنتا تھا کہ رانی کا چہرہ مارے خوف کے زرد ہو گیا۔ وہ دو زانو ہو کر جس میز پر
میں بیٹھا تھا اس کے آگے سجدہ میں گر پڑی اور التجا میں کہنے لگی۔

”مہاراج! مجھے ایسا حکم نہ دیں۔ مجھے ایسا حکم نہ دیں۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔

”کیوں اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟“

تب رانی نے سہمی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ شیوہی مندر کے بڑے جوتشی پجاری
نے راجہ کو رانی کی کنڈلی دیکھ کر بتایا تھا کہ رانی کے ہاں صرف ایک صورت میں بیٹا
پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں سے شوجی مہاراج کا اوتاری ناگ لایا جائے۔ یہ ناگ دیوتا کا
اوتار ہو گا مگر سناپ کے روپ میں ہو گا اور دیوتاؤں کی زبان میں بات کرتا ہو گا۔ مہاراجی
اس ناگ کے ساتھ تین راتیں بسر کرے گی۔ اس کے نو سینے بعد رانی کو بھگوان چاند

جیسے ایک جتنی اپنے جتنی سے پیار کرتی ہے۔“
میں دل میں خوش ہوا کیونکہ میں نے جو ترکیب سوچی تھی اور جو منصوبہ بنایا تھا یہ
رانی اپنے آپ اسی طرف آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”اگر تم ایسا کوئی تو دوشواش رکھو، بیگوان تمہیں چاند سا بیٹا ضرور دے گا۔“
رانی نے بے اختیار ہو کر مجھے اپنی ہتھیلیوں میں اٹھایا اور مجھے اپنے سینے سے لگا
لیا۔ اس کے لباس اور جسم سے یورپ اور امریکہ کے پرفوم کی خوشبوئیں آ رہی
تھیں۔ رانی نے مجھے اٹھایا اور اپنے نرم ریشمی بستر پر لے جا کر بٹھا دیا اور بولی۔

”ہمارا راج! آپ میرے لیے کام دیوتا سناں ہیں۔ کام دیوتا عشق اور پریم کا دیوتا
ہے۔ عورت اور مرد کے ملاپ کا دیوتا ہے۔ میں تین راتوں کے لیے آپ کی داسی
ہوں۔ آپ کی جتنی ہوں۔ میں وہی پوجا پانچہ کھوں گی جو آکاش کی دیوداسیاں اپنے
دیوتوں کو رجمانے کے لیے کیا کرتی ہیں۔“

رانی کے بیڈ روم میں ایک شاندار سنگھار میز تھا۔ وہ مجھے بستر پر بٹھانے کے بعد
انگنائی لے کر آرام آرام سے قدم اٹھاتی اور کچھ گنگنائی سنگھار میز کی طرف گئی اور
اپنے بال کھول کر ان میں برش پھیرنے لگی۔ اس کے سیاہ بال لیے اور پچھیلے تھے۔ بیڈ
روم میں کافی روشنی تھی۔ اس نے بالوں میں برش کرنے کے بعد سوائے پلنگ کے
ساتھ رکھے ٹیبل لیپ کے باقی ساری روشنیاں بجھا دیں۔ اس ٹیبل لیپ کا شیڈ سرخ
رنگ کا تھا۔ بیڈ روم میں ہلکی ہلکی سرخ روشنی پھیل گئی۔

مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے رانی سے ایک فرمائش کرنی تھی لیکن یہ
فرمائش میں صرف اس وقت کرنا چاہتا تھا جب رانی خوب موڈ میں آ چکی ہو۔ اس چھوٹی
سی ریاست کی مہارانی جس کا نام سندھوان تھا ہندو دیولہا کی دلدلوں میں سر سے پاؤں
تک ڈوبی ہوئی تھی اور پھر اس وقت وہ اپنی ریاست کی وراثت کی خاطر ایک ساپ سے
بیادہ کر چکی تھی۔ بہت جلد اس پر کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنا سارا لباس اتار دیا
اور مجھے گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے کہا۔

سا بیٹا دے گا لیکن اس کی ایک شرط ہوگی جو سپیرا اوتاری ناگ پکڑ کر لائے گا وہ اس کی
گردن میں نارومتی کا کلا دھاگہ ضرور باندھ دے گا۔ یہ کلا دھاگہ کسی حالت میں بھی
ناگ کے گلے سے نہیں اتارا جائے گا۔ اوتاری ناگ کو مجبور بھی کرے تو وہ اسے
نہیں اتارے گی۔ اگر اس نے کلا دھاگہ ناگ کی گردن سے اتار دیا تو پھر رانی کے ہاں
کبھی اولاد نہیں پیدا ہوگی اور وہ پانچھ کی پانچھ ہی رہے گی اور اگلے جنم میں لومڑی کی
شکل میں پیدا ہوگی۔

جب میں نے یہ سنا تو سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میرے اختیار میں
نہیں تھا کہ میں فوراً اپنی گردن سے سپیرے کا باندھا ہوا کلا دھاگہ اتار دوں۔ یہ اب
مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کالے دھاگے نے ہی مجھے متزوں کے ظلم میں باندھ رکھا
ہے۔ اگر کسی طرح اسے میری گردن سے الگ کر دیا جائے تو میری طاقت مجھے واپس مل
سکتی ہے اور میں فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں، میں کچھ
نہیں کر سکتا تھا۔ میں بول ضرور کرتا تھا، سن ضرور سکتا تھا لیکن زیادہ دور تک ریگ
نہیں سکتا تھا۔ چند قدم ریگھنے سے میرا جسم پتھر کی طرح بے جان ہو جاتا تھا۔ ایسی حالت
میں میرا عمل سے فرار ہونا ناممکن تھا۔
آخر میرے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔

مجھے یقین تھا کہ یہ ترکیب ضرور کارگر ثابت ہوگی۔ آگے چل کر آپ کو بھی
معلوم ہو جائے گا کہ یہ ترکیب کیا تھی۔ چنانچہ میں نے رانی سے کہا۔
”اگر یہ بات ہے تو بے شک تم میری گردن میں دھاگہ بندا رہنے دو۔ اسے
مت اتارو۔“

رانی بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔
”ہمارا راج! آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ میں آپ کی دھن واوی ہوں۔
میں بیگوان کے سامنے آپ کو دجن دیتی ہوں کہ اگرچہ آپ مرد کے روپ میں نہیں
ہیں لیکن میں عورت کے روپ میں ضرور ہوں۔ میں آپ کو اس طرح پیار کروں گی

رانی اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ اسے مندر کے جوتی نے میری گردن کا دھاگہ اتارنے سے منع کر رکھا ہے۔ اس نے نشے میں کہا۔

”مہاراج جی! یہ کون سی مشکل بات ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے میری گردن میں بندھا ہوا کالا دھاگہ اتار دیا۔ کالا دھاگہ اترتے ہی مجھے اپنے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ سناپ کا خون سرد ہوتا ہے اور اس کی گردش بھی بہت ہی ست ہوتی ہے لیکن میرے اندر جیسے ایک دم گرمی آگئی اور میری کھوپڑی ہوئی توانائی بحال ہوگئی۔ میں اپنے جسم کو بھی تیزی سے حرکت دے سکتا تھا۔ میں نے اپنا پچھن بھی بڑی آسانی سے کھول لیا۔ رانی میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب میں آبی کی شکل اختیار نہ کر سکا تو وہ بولی۔

”مہاراج! آپ ابھی تک ٹانگ ہی ہیں۔ مرد کے روپ میں کیوں نہیں آئے؟“

میں اسے کہنے لگا کہ ابھی کچھ وقت لگے گا لیکن میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میرے گلے سے انسانی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے دو تین بار اپنی مروانہ آواز میں بولنے کی کوشش کی لیکن میری آواز جیسے مجھ سے جدا ہوگئی تھی۔ میں انسانی آواز میں بالکل نہ بول سکا۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں رانی کو کیا کہتا۔ وہ مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

”میرے دیوتا! جلدی سے مرو بن کر میرے سامنے آ جاؤ۔ بس صرف ایک بار

تھوڑی دیر کے لیے مرو بن جاؤ۔“

میں سخت پریشان تھا۔ مجھے یہ غم لگ گیا تھا کہ دھاگہ اترنے کے بعد شاید اب میں نہ تو کبھی انسانی شکل میں واپس آ سکوں گا اور نہ سناپ کے روپ میں کبھی انسانی آواز میں بول ہی سکوں گا۔ میں رانی کو یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ کالا دھاگہ میری گردن میں دوبارہ باندھ دے کیونکہ دھاگہ باندھنے سے میرے جسم کی ساری توانائی ختم ہو جاتی تھی اور میں وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح کم از کم میری توانائی تو بحال ہوگئی تھی اور میں وہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔ میرے دل کی آواز نے مجھے کہا۔

”مہاراج! کیا دیوتاؤں کی شراب سوم رس نہیں پیو گی؟ اس کے بغیر تو تمہارا یکہ پورا نہیں ہوگا۔“

”شمار کریں مہاراج! میں تو بھول ہی گئی تھی۔“

وہ جلدی سے اٹھ کر ایک الماری میں سے شراب کی بوتل اور دو گلاس لے آئی۔

میں نے کہا۔

”ہم سوم رس میں پہلے ہی ڈوبے ہوئے ہیں۔ صرف تم سوم رس پیو گی۔“

”جو حکم مہاراج۔“

اس نے میرے سامنے گلاس میں شراب ڈالی اور غٹاٹ چڑھا گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ شراب کی علوی ہے۔ شراب پینے کے بعد وہ مجھ سے کھیلنے لگی۔ کبھی مجھے چومتی، کبھی مجھے اپنے سینے سے لگا لگا کر بچھتی اور کبھی مجھے اپنے جسم پر چھوڑ کر مسکراتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں نے اسے دوسرا گلاس بھی پینے کو کہا۔ اس کی کیا محفل تھی کہ میری حکم عدولی کرتی۔ وہ دوسرا اور پھر تیسرا گلاس بھی چڑھا گئی۔ ہنسی ہنسی باتیں کرنے لگی اور مجھے اپنے جسم کے ساتھ لگا کر زور زور سے دھکیلنے لگی۔

یہی وہ وقت تھا جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اسے کہا۔

”رانی! کیا تم نہیں چاہتی کہ اس وقت میں ایک مرد کی شکل میں تمہارے سامنے

آؤں اور تمہیں ایک مرد کی طرح پیار کروں؟“

رانی نشے میں بھرتے ہوئے بولی۔

”مہاراج! مجھ پر کپا کریں اور مرو بن کر مجھے اپنے ساتھ لگالیں۔“

میں نے کہا۔

”میں مرد کی شکل میں صرف اسی وقت واپس آ سکتا ہوں جب میری گردن میں

بندھا ہوا یہ دھاگہ اتار دو گی۔ اسے میری گردن سے اتار دو پھر دیکھنا میں تمہیں کس

طرح پیار کرتا ہوں۔“

اور دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف نیچے محل کا ایک باغ تھا۔ میں دیوار سے اتر کر باغ میں آگیا۔ مجھے اگر اس بات کی خوشی تھی کہ میں بوڑھے سپیرے کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں تو اس بات کا غم بھی لگ چکا تھا کہ میں انسانی آواز میں بول نہیں سکتا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری انسانی آواز عارضی طور پر بند ہوئی تھی یا ہمیشہ کے لیے میں انسانی آواز سے محروم ہو گیا تھا۔

انہی پریشان خیالات میں الجھا ہوا میں محل کے باغ میں سے نکل کر اس کی اونچی دیوار کے پاس آگیا۔ ایک سانپ کے لیے اونچی دیوار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں دیوار پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف آگیا جہاں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ میں محل سے باہر آ چکا تھا۔ معلوم نہیں کہ کون سی جگہ تھی، کون سی ریاست تھی اور کون سے بڑے شہر سے کتنی دور تھی۔ شاہی محل پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور محل کے چاروں طرف کھیتوں اور دور دور تک پھیلے درختوں کے جھنڈوں پر بھی سناٹا طاری تھا۔ میں نے ایک جگہ رک کر چاروں طرف منہ کر کے فضا کو سونگھا۔ مجھے کسی طرف سے بھی جیلہ یا اپنے دوست مکندو منظر خالد کی بو نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ان لوگوں سے بہت دور آگیا ہوا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل کلاں چھٹ گئے تھے۔ تارے نظر آرہے تھے۔ میں نے تاروں کے حساب سے مغرب کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ کیونکہ میرے اس وقت کے قیاس کے مطابق بھوپال مغرب کی سمت واقع تھا اور مجھے بھوپال ہی جانا تھا۔ اگرچہ مجھے رات کے اندھیرے میں نظر آ رہا تھا لیکن دن کی روشنی میں میں سمت کا زیادہ خیال رکھ سکتا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ راتوں رات اس دوزخی محل اور عیار سپیروں کی بستی سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ جب سورج نکلے گا تو اس کی روشنی میری ہنر طریقے سے راہ نمائی کر سکے گی۔ میں رینگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کھیتوں میں سے گزر گیا۔ پھر درختوں کے جھنڈ بھی عبور کر لیے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری توانائی بھل ہو چکی تھی۔ گو میں انسانی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چلتے چلتے

”کرم دادا! اللہ کا نام لے کر اس گناہ کی دنیا سے بھاگ جاؤ۔ آگے اللہ مالک ہے۔ وہ جہنم اس عذاب سے بھی نجات دلا دے گا۔“

میں نے رائی کے سینے سے لگے لگے جلدی سے اپنا منہ پیچھے ہٹایا۔ چمن کھول کر گرج دار پھنکار ماری۔ رائی تو ڈر کر پیچھے گر پڑی۔ میں اچھل کر اس گناہ کے بستر سے نیچے آگیا، دروازہ بند تھا۔ میں رائی کو انسانی آواز میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دروازہ کھول دے۔ دروازے میں کسی قسم کے سوال یا درز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ کسی گیراج کا دروازہ نہیں تھا۔ ایک ریاست کی مہارانی کے بیڈ روم کا بڑی قیمتی لکڑی کا دروازہ تھا۔ میں بیڈ روم کی دیوار کے ساتھ ساتھ پکر لگانے لگا۔ رائی گھبرا گئی تھی۔ وہ ہاتھ باندھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور مجھ سے معافیاں مانگنے لگی۔

”مہاراج! مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہے تو مجھے شاکر دیں۔ میری غلطی معاف کر دیں۔“

مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں اس بیڈ روم سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ آخر مجھے ایک راستہ مل گیا۔ اس بیڈ روم کا ایک دوسرا دروازہ بھی تھا۔ اس دروازے کے نیچے قالین ڈرا سا پیچھے ہٹا ہوا تھا اور وہاں دوسری طرف سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں وہاں سے دوسری طرف نکل گیا۔ دوسری طرف لکڑی کی میزبھیاں اوپر جاتی تھیں۔ یہ بیڈ روم کا عقبی اور ہنگامی دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ وہاں اوپر ایک چلنے ہوئے بلب کی روشنی تھی۔ میں میزبھیاں پر سے رینگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اوپر ایک بند کوریڈور یا راہ داری تھی۔ یہ راہ داری ایک سرنگ کی طرح تھی مگر اس میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں اس میں سے تیزی سے رینگتا ہوا آگے نکل گیا۔

آگے ایک چھوٹا سا رخ دار دروازہ تھا۔ میں اس میں سے بھی گزر گیا۔ اب میرے سامنے ایک اور میزبھیاں تھیں جو اوپر کو جا رہی تھیں۔ میں میزبھیاں چڑھتا گیا۔ یہ میزبھیاں محل کی چھت پر جاتی تھیں۔ میں چھت پر آیا تو دیکھا کہ آسمان پر کہیں بادل تھے اور کہیں تارے جھلما رہے تھے۔ میں چھت پر سے ہوتا ہوا اس کی منزیر پر آگیا

دو ایک بار اپنے آپ سے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن میرے حلق سے انسانی آواز نہ نکل سکی۔

دور سے مجھے کسی گاؤں کی روشنیوں نظر آئیں۔ میں گاؤں میں جانے کی بجائے اس کے پلوے ہو کر آگے نکل گیا۔ اب میں ایک کچی سڑک پر تھا جس کے درمیان تیل گاڑیوں کے پٹنے کے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں طرف بھاڑیاں تھیں۔ دور تک رات کا اندھیرا اور خاموشی تھی۔ کچی سڑک کھیتوں میں دور تک چلی گئی تھی۔ مجھے فضا میں پانی کی نمی کا احساس ہوا۔ میں نے دو تین بار زبان باہر نکالی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ دریا کی نمی ہے اور کوئی دریا قریب ہی ہے۔ میں فکر مند ہوا کہ اگر سامنے دریا آ گیا تو اسے تیر کر ہی پار کرنا ہو گا اور دریا کی لہریں مجھے کافی دور آگے لے جائیں گی اور خدا جانے میں اپنی منزل سے کتنی دور جا پڑوں۔ دریا کنارے آگے ہوئے سرکنڈوں کی مرطوب خوشبو قریب ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں دریا پر پہنچ گیا۔ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ میں اسے تیر کر پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لیتا چاہتا تھا۔

میں نے بائیں جانب نگاہ ڈالی تو مجھے کچھ فاصلے پر دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتی روشنیوں ٹمٹماتی دکھائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دریا کا پل ہے۔ میں نے اپنا رخ پل کی طرف کر لیا۔ میں دریا کے پل پر سے آسانی کے ساتھ گزر سکتا تھا۔ مجھے پل تک پہنچنے پہنچنے کافی وقت لگ گیا۔ یہ پل لوہے کے گارڈوں کو قینچیوں کی طرح جوڑ کر بنایا گیا تھا اور بہت بڑا پل تھا۔ اس پر ایک طرف پیدل اور تیل گاڑیوں وغیرہ کے پٹنے کا راستہ تھا اور درمیان میں ریلوے لائن تھی۔ میں ریلوے لائن سے ہٹ کر پل پر چل پڑا۔ ابھی آدھا پل عبور کیا تھا کہ پیچھے سے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریل گاڑی آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ریلوے لائن پر انجن کی روشنی پڑنے لگی۔ پھر انجن کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ گاڑی بڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ کر دور سے آتی ریل گاڑی کو دیکھنے لگا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ دریا کے پل پر گاڑی بڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ عام طور پر دریا کے پلوں پر

گاڑیاں اتنی آہستہ آہستہ نہیں چلا کرتیں۔ انجن اپنی تیز روشنی کو اپنے ساتھ ہی سمیٹا آہستہ آہستہ چلتا میرے قریب سے گزر گیا۔ ڈبوں میں روشنیوں ہو رہی تھیں۔ شاید مسافر سو رہے تھے۔ کسی کسی کھڑکی میں سے کوئی مسافر باہر بھاٹک رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار اور آہستہ ہو گئی۔ آخر پیوں کے چرچانے کی آواز کے ساتھ ٹرین رک گئی۔ ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب سے گزر گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں بھی مغرب کی طرف جا رہا ہوں اور ٹرین کا رخ بھی مغرب کی طرف ہے۔ کیوں نہ ٹرین پر چڑھ جاؤں، آگے کوئی نہ کوئی بڑا شہر ضرور آئے گا۔ وہاں کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ میں بھوپال شہر سے کتنی دور ہوں۔ وہاں سے میں کسی دوسری ٹرین پر چڑھ کر بھوپال کی طرف نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ یہ اچھا خیال تھا۔

میں تیز تیز رینگتا ہوا ریل کی پٹری پر آ گیا۔

گاڑی کے آخری ڈبے کی سرخ روشنی مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ٹرین کسی بھی وقت چل سکتی تھی۔ چلتی ٹرین پر میں سنبھلنے کے لیے گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا ڈبے کی صورت میں نہیں چڑھ سکتا تھا۔ میں آخری ڈبے کے پیچھے پہنچ گیا۔ وہاں سے میں اس کے عقبی دیوار سے ہو کر چھت پر آ گیا۔ اتنے میں ایک دھچکے کے ساتھ ٹرین چل پڑی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ٹرین صرف میرے لیے وہاں رکی تھی۔ ٹرین کی چھت پر میں بوسے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ دونوں جانب دور تک دریا کا پاٹ پھیلا ہوا تھا۔ ٹرین اسی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس طرح وہ پل پر سے گزر گئی۔ پل پر سے گزرنے کے بعد ٹرین نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑنی شروع کر دی اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ یہ پہاڑی علاقہ نہیں تھا۔ دونوں طرف کھیت اور میدان تھے کہیں کہیں دور ناریل اور تازہ کے درخت تھے جنہیں میری سانب کی آنکھیں واضح طور پر پہچان سکتی تھیں۔ ٹرین ایک چھوٹے شیش کو چھوٹتی ہوئی گزر گئی۔ اسی طرح اس نے کسی شیش چھوٹے۔ کافی دیر بعد کوئی شہر آ گیا۔ یہ زیادہ بڑا شہر نہیں لگتا تھا۔ میں شیش پر اس شہر کا نام پڑھنا چاہتا تھا۔ ٹرین شیش پر جا کر رک گئی۔ میں چھت پر بیٹھا تھا۔ میں نے سرزدرا

کے اندر ہی رہنا چاہتا تھا اور کسی طریقے سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہاں سے بھوپال والی گاڑی کب اور کس پلٹ فارم پر سے جائے گی۔

اتنا مجھے اندازہ تھا کہ بنارس سے بھوپال کتنی دور ہے۔ بنارس کا شیش بھوپال جانے والی مین لائن پر نہیں تھا۔ یہ دلی نکلنے روت تھا، ہو سکتا تھا کہ مجھے راستے میں گاڑی تبدیل بھی کرنی پڑتی جو میرے لیے مزید مشکلات کا باعث تھا لیکن میں وہاں ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا۔ میری پرالہم یہ تھی کہ میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اول تو میری انسانی آواز بند ہو چکی تھی اور اگر میں بول بھی سکتا تو ایک سانپ کو انسان کی آواز میں بولتے دیکھ کر لوگ ڈر کر بھاگ جاتے یا مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرتے۔ میں ہر طرح سے مجبور تھا۔ یہاں بھی میں نے بولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میری انسانی آواز لگتا تھا بالکل ختم ہو گئی ہے اور شاید اب میں انسانی شکل میں آنے کے بعد بھی نہ بول سکوں گا۔

میں پلٹ فارم کی دیوار کے ساتھ اندر کی جانب رینگتا ہوا آگے نکل گیا۔ جہاں پلٹ فارم ختم ہوتا تھا وہاں سے اوپر پلٹ فارم چڑھ گیا۔ یہاں بھی کھجیوں پر طاقتور بلب لگے تھے جن کی روشنی میں بیوی تک نظر آ سکتی تھی۔ میں تو سانپ تھا۔ میں تیزی سے پلٹ فارم پار کر کے دوسری طرف ریلوے لائن سے گزرتا ہوا سامنے والی ایک منزلہ عمارت کے احاطے میں پہنچ گیا۔ یہاں بھی روشنی تھی مگر آدمی کوئی نہیں تھا۔ صحن میں ایک طرف سلمان تولے والا کتہا لگا ہوا تھا۔ شاید یہ ریلوے کا کوئی آفس تھا جو رات ہونے کی وجہ سے بند تھا۔ میں آفس کے برآمدے کے ستون کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیسے معلوم کرنا چاہیے کہ بھوپال والی گاڑی کس پلٹ فارم سے کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ کسی سے پوچھتے بغیر مجھے پتہ نہیں چل سکتا تھا اور میں بول نہیں سکتا تھا۔

دفتر بند تھا اس کے برآمدے میں بلب جل رہا تھا۔ خدا جانے کہاں سے ایک چوکیدار آگیا۔ اس نے کہیں مجھے دیکھ لیا۔ فوراً "سانپ سانپ کا شور مچا کر مجھ پر لٹھ

نیچے کر کے پلٹ فارم پر شیش کا ٹام پڑھنے کی کوشش کی مگر وہاں کسی جگہ شیش کا ٹام لکھا ہوا نہیں تھا۔ کچھ مسافر اتر گئے۔ کچھ مسافر سوار ہوئے۔ ٹرین چند منٹ کے بعد وہاں سے چل پڑی۔ میں کسی بڑے شہر کے انتظار میں تھا۔ ٹرین نے ایک بار پھر پیٹ پکڑ لی۔ اس دفعہ گاڑی کافی دیر تک بغیر کسی جگہ رکے چلتی رہی۔ راستے میں ایک دریا بھی آیا، کھیت بھی آئے، جنگل بھی آیا۔ زمین کسی جگہ اونچی نیچی بھی ہوئی۔ پھر میدان شروع ہو گئے۔ آخر دور سے روشنیوں نظر آنے لگیں۔ یہ کوئی بڑا شہر تھا۔ کافی دیر تک ٹرین ان روشنیوں کے درمیان سے گزرتی چلی گئی۔ پھر ایک دریا کا پل آگیا۔ ٹرین پل عبور کر گئی۔ یہ واقعی کوئی بہت بڑا شہر تھا۔ دریا کی دونوں جانب اس طرح روشنیوں ہو رہی تھیں جیسے وہاں کوئی تھوڑا سا شہر چل رہا ہو۔ مجھے ڈبے کے اندر سے مسافروں کے نعروں کی آواز آئی۔

"جے گنگا میا جے گنگا میا۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا تھا۔ ٹرین ایک بار رونق اور روشن روشن پلٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ جس طرف پلٹ فارم تھا میں اس طرف جھانک رہا تھا۔ میں پلٹ فارم کے شروع میں لگے بورڈ پر شیش کا ٹام پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے ٹام پڑھ لیا۔ یہ بنارس کا شہر تھا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں بنارس پہنچ گیا ہوں۔ یہاں سے مجھے بھوپال جانے والی گاڑی مل سکتی تھی۔ ٹرین کے رکتے ہی میں لوگوں کی نظریں ہچا کر ڈبے میں سے دوسری جانب اتر گیا۔ یہاں کافی روشنی تھی، مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف بھی ایک پلٹ فارم تھا۔ درمیان میں ریل کی پٹری تھی۔ میں ریل کی پٹری کی لوٹ میں ہو کر رینگ رہا تھا۔ اچانک اس پلٹ فارم پر بھی ایک گاڑی آگئی۔ میں جلدی سے پٹری کو چھوڑ کر پلٹ فارم کی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ جب ٹرین گزر گئی تو میں نے دیوار پر چڑھ کر سر باہر نکل کر پلٹ فارم پر نگہ ڈالی۔ پلٹ فارم پر مسافروں کا رش وغیرہ نہیں تھا۔ پھر بھی اوپر اوپر کچھ لوگ اپنے سلمان کے پاس بیٹھے تھے۔ پلٹ فارم پر روشنی تھی۔ میں ریلوے شیش کے احاطے

پر سے رات کے وقت بھی گاڑیاں اور موٹر رکھ کر گزر رہے تھے۔ اب میرے پیچھے گئے ہوئے آدمیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ مجھے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

مجھے ایک ٹرک نظر آگیا جو ایک جگہ کھڑا تھا۔ اس کا انجن چل رہا تھا۔ میں ٹرک پر چڑھ کر اس کے پچھلے حصے میں تریل کے ڈھیریں چھپ گیا۔ کسی نے مجھے ٹرک پر چڑھنے نہیں دیکھا تھا۔ لوگ سانپ سانپ کا شور مچاتے ٹرک کے قریب سے گزر گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں کچھ دیر تک ٹرک میں بی چھپا رہتا چاہتا تھا۔ اتنے میں ٹرک چل پڑا۔ میں نے سوچا کہ آگے جا کر ٹرک پر سے چھلانگ لگا دوں گا پھر سوچا کہ ٹرک خالی ہے اس پر سلسلہ وغیرہ نہیں لدا ہوا۔ یہ شرمیں ہی کسی جگہ جا رہا ہو گا۔ میں بھی وہیں تک اس کے ساتھ جاتا ہوں۔ جہن پتائی بھوپال جانے سے زیادہ ضروری تھی۔ ٹرک شرے باہر نکل کر دریا کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ میں تریلوں کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ دریا کی سائے کی جانب شرے کے مکانوں اور گھٹ کی روشنیوں دریا کے پانی میں منعکس ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ نہ جانے یہ ٹرک کسی دوسرے شرنہ جا رہا ہو۔ مجھے نیچے چھلانگ لگا دینی چاہیے لیکن ٹرک کی رفتار تیز تھی۔ اگر میں اصلیت میں سانپ ہوتا تو شاید باہر چھلانگ لگا دیتا مگر میں حقیقت میں انسان تھا اور چھلانگ لگاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ زخمی بھی ہو گیا تو یہاں مجھے اٹھا کر مستراح کے مرگٹ تک لے جانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ میں ٹرک میں ہی بیٹھا رہا۔

ٹرک شرے کچھ زیادہ باہر آ کر دریا کے کنارے کی طرف گھوم گیا۔ اب وہ دریا کی ریت پر چل رہا تھا۔ ایک جگہ آ کر وہ رک گیا۔ میں جلدی سے ٹرک سے نیچے اتر گیا۔ ٹرک شاید وہیں ریت لینے آیا تھا۔ کیونکہ وہاں پہلے سے کچھ آوی کھڑے تھے۔ میں ریت پر پیچھے بنارس شر کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے گنگا جو ہندوؤں کا مقدس دریا ہے بنارس شر کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس کے دونوں کنارے پر گھٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہ بڑے بڑے گول، کنگڑ دار اور چوکور چوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں جن کے عقب میں دریا تک بیڑھیاں اترتی ہیں۔ ان چوڑوں پر سلاخو لوگ آسن

لے کر حملہ کر دیا۔ اس کی آواز سن کر دو تین اور آدمی کسی طرف سے نکل آئے۔ میں تیزی سے ایک طرف دوڑ پڑا۔ دوڑنا کیا تھا بس ریک ہی سکتا تھا۔ وہ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل کر ایک تنگ راستے میں سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ لوگ شور مچاتے زمین پر لٹھ مارنے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں گھبرا گیا۔ گھبراتا قدرتی بات تھی۔ اگر وہ مجھے مار ڈالتے تو میرا کیا حشر ہوتا؟ مجھے معلوم نہیں تھا جو گن مایا دیوی نے مجھے اتنا بتا دیا تھا کہ اگر کبھی میں زخمی ہو جاؤں یا میرے جسم کے دو ٹکڑے ہو جائیں تو میرے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہوگی کہ کوئی مجھے مٹی کے کوزے میں بند کر کے بھارت کے مشہور مذہبی شرمسترا لے جائے۔ وہاں پرانے راجاؤں کا ایک مرگٹ ہے۔ اس مرگٹ میں ہندو لوگ اپنے مردے جلاتے ہیں۔ مجھے وہاں تازہ جلے ہوئے مردے کی ٹھنڈی راکھ میں تین دن تک دبائے رکھے۔ تین دن کے بعد میرا جسم اپنے آپ جڑ جائے گا اور میں پھر سے زندہ ہو جاؤں گا۔ یہ بات میں نے احتیاط کے طور پر کمائنڈو منظر خالد اور جیلہ کو بھی بتا دی تھی۔ لیکن یہاں بنارس میں نہ کمائنڈو خالد میرے پاس تھا نہ جیلہ ہی میرے پاس تھی۔ مگر یہاں میں ہلاک کر دیا جاتا ہوں تو پھر شاید قیامت تک زندہ حالت میں واپس نہیں آ سکتا تھا۔

اس وجہ سے مجھے اپنی جان کے لالے پڑے تھے اور جس طرف منہ اٹھا ہی طرف بھاگ رہا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں جہاں سے گزر رہا تھا وہاں روشنی تھی۔ میں اپنے پیچھے آنے والوں کو صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ میرے سر پر پہنچ گئے کیونکہ میری رفتار آدمی کے دوڑنے کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک لٹھ بالکل میرے قریب پڑا۔ میں نے فوراً "بچن اٹھا کر اتنی زور سے پھینکار ماری کہ چوکیدار اور اس کے ساتھی ڈر کر پیچھے کو بھاگے۔ مجھے موقع مل گیا۔ سامنے ایک تنگ سارستہ تھا۔ میں اس میں سے ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ آگے کوئی ویران جگہ ہوگی جہاں میں اندھیرے میں چھپ جاؤں گا۔ مگر وہ شر تھا اور شر بھی بنارس تھا اور ریلوے سٹیشن کا علاقہ تھا۔ میں ایک بازار میں نکل آیا۔ جہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ سڑک

کر کے مجھے آواگون سے کتنی دلا دیجئے۔ میں ناگ دیوتا کی پجاری ہوں اور آپ کی داسی ہوں۔

میں آگے نکلنے لگا تھا کہ خیال آگیا اس عورت سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ میری عقیدت مند ہے۔ اس کی مدد سے میں بھوپال جانے والی گاڑی میں سوار ہو سکتا ہوں۔ ہندو عورتوں کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی سے میں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ میں وہیں رک گیا اور اس عورت پر مزید اثر ڈالنے کے لیے میں نے گردن اٹھائی، پھن پھیلایا اور ہلکی سی پھنکار مار کر اپنے پھن کو دائیں بائیں جھلانے لگا۔ میری اس حرکت سے وہ عورت خوشی سے نمل ہو گئی۔

کنے لگی۔

”میں کتنی سوہاگہی دیتی ہوں کہ ناگ منی دیوتا نے میری التجا قبول کر لی ہے۔ ہے مہاراج! ہے ناگوں کے دیوتا ناگ منی! میں جنم جنم سے آپ کی کھوج میں تھی۔ میرے ساتھ گنگا میا کے چرنوں میں چل کر اشنان کیجئے تاکہ میرے جنم جنم کے پاپ جھڑ جائیں اور مجھے آواگون سے کتنی مل جائے۔“

میں نے اپنا پھن پھیلایا اور آہستہ آہستہ ریگتے ہوئے اس عورت کے قریب آ گیا۔ اس عورت نے ذرا سے بھی ڈر خوف کے بغیر مجھے اٹھا کر اپنی ساڑھی کے اندر چھپایا اور کہل۔

”میرے مہاراج ناگ منی جی! میں نہیں چاہتی کہ کسی دوسرے کو پتہ چلے کہ مجھے ناگ منی جی نے درشن دیے ہیں۔“

اس نے پیتل کی قہلی اٹھائی اور دریا کی طرف چل پڑی۔ دریا بالکل سامنے تھا۔ میں اس کی ساڑھی میں سے سر باہر نکالے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس عورت کو کس طریقے سے بتایا جائے کہ میں بھوپال جانا چاہتا ہوں۔ کاش میں انسان کی زبان میں اس سے بات کر سکتا ہوں اس وقت مجھے شدید محرومی کا احساس ہوا۔ دریا پر میڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو نیچے پانی تک جاتی تھیں۔ دریا کی لہریں آہستہ آہستہ میڑھیوں سے ٹکرا

جملے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہندو عورتیں اور مرد صبح دہلی آکر اشنان کرتے ہیں۔ ان ساوہوؤں کو آکر آٹھا نکلتے ہیں۔ ساوہو ان کے ماتھوں پر تلک لگاتے ہیں۔ انہیں پرشاد دیتے ہیں اور ان سے دکھتا کے طور پر رقم وصول کرتے ہیں۔ یہ قدیم زمانے سے ان ساوہو لوگوں کا کاروبار چلا آ رہا ہے۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دن کا اجالا ہوئے ہوئے پھیلنے لگا تھا۔ گھاٹوں پر ساوہو لوگ اپنی اپنی دکانیں سجا رہے تھے اور اشنان کرنے کے بعد اشلوک پڑھتے ہوئے چوتھے پر گنگا کا پانی چھڑک رہے تھے۔ میں ان سے دور ہو کر آگے نکلا چلا گیا۔

ایک جگہ درختوں کے درمیان کھینچا تھا۔ سورج طلوع ہو گیا تھا اور اس کی روشنی دریا کو روشن کر رہی تھی۔ ہر طرف دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں کنیا کے قریب سے گزرا تو کنیا کے اندر سے میں نے ایک صحت مند جسم والی دروازہ عورت کو ہاتھ میں پیتل کی قہلی لیے باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے اپنے جسم کے گرو سفید ساڑھی لپیٹ رکھی تھی مگر اس کا جسم جگہ جگہ سے نمایاں ہو رہا تھا۔ پیتل کی قہلی میں گیندے کے کیسری پھول لگے تھے۔ مجھے اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو کسی طرح بتارس کے ریلوے سٹیشن پر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے بھوپال جانے کا کوئی ہندوستان کر سکوں۔ وہاں اور کوئی انسان نہیں تھا۔ دریا پر کچھ عورتیں مرد اشنان کر رہے تھے۔ دور مندروں میں سے پوچھا پانڈ کی گھنٹیں بج رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس عورت کے قریب آنے سے پہلے اس کی کنیا کے آگے سے نکل جاؤں گا لیکن اندازہ غلط پڑ گیا۔ جس وقت میں کنیا کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس عورت کی مجھ پر نگاہ پڑ گئی۔ میں نے اسے اپنی طرف دیکھتے دیکھتے مجھے تعین تھا کہ عورت مجھے دیکھ کر چیخ مار کر بھاگ جانے کی لیکن اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اس نے پیتل کی قہلی ریت پر رکھ دی اور ہاتھ جوڑ کر کہل۔

”دیوتا ناگ منی کی بے ہو۔ میرا انکا جنم پھل ہو گیا کہ دیوتا ناگ منی کے درشن ہو گئے۔ ہے مہاراج! مجھ ابناگن کو درشن دیے ہیں تو میرے ساتھ گنگا میا کا اشنان

رہی تھیں۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس عورت نے مجھے ساڑھی کے اندر سے نکال کر اپنے پاس بیٹھی مٹی! آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے کہ میں بدری پور کی بیوہ سوٹیا

”ہمارا ناگ مٹی! آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے کہ میں بدری پور کی بیوہ سوٹیا دیوی ہوں اور اپنی ساس کے ظلم سے تنگ آکر گنگا میا کے پاس آکر اپنی کنیا میں بیٹھ گئی ہوں اور دن رات مہا ناگ دیوتا کی پوجا کرتی ہوں۔ میرے دھن بھاگ کہ آپ نے مجھے درشن دے کر میرا جیون سچل کر دیا۔ اب میری ایک ہی خواہش ہے کہ آپ کچھ روز میرے ساتھ میری کنیا میں بسر کریں۔ میں آپ کی ہر طرح سے سیوا کروں گی۔ میرے لیے یہ سنسار سورگ بن جائے گا۔“

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے سر کو اثبات کے انداز میں ہلایا جیسے اسے کہہ رہا ہوں کہ میں ضرور تمہارے پاس رہوں گا۔ سوٹیا دیوی خوشی سے منال ہو گئی۔ اس نے مجھے اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا اور جھوم جھوم کر کوئی اشلوک پڑھنے لگی۔ پھر اس نے مجھے دریا کی آخری میڑھی پر بٹھادیا اور کہا۔

”ہمارا ناگ! میں اٹھان کرتے لگی ہوں۔ میرے سر پر (جسم) پر سے اپنی نظریں نہ ہٹائیں۔ میرے سر پر ہر جہاں جہاں آپ کی نظریں پڑے گی وہاں وہاں سے میرے پاپ جھڑ جائیں گے۔ اوم اوم! پڑھو مہا ناگ اوم!“

وہ دریا کی آخری میڑھی پر اس طرح بیٹھ گئی کہ دریا کی لہریں اس کی پتلیوں کو چھو رہی تھیں۔ اس نے اشلوک پڑھتے ہوئے مجھ پر دریا کا پانی چلو میں بھر کر ڈالا اور پھر اپنی سفید ساڑھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ اس عورت کی عمر تیس سال کے قریب ہو گئی۔ جسم گورا اور صحت مند تھا۔ یہ واہیات خیال ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا اور میں نے اسے اپنے ذہن سے نکال دیا۔ وہ دریا کے پانی کو دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم پر ڈالنے لگی۔ وہ اشلوک بھی پڑھتی جا رہی تھی اور بار بار ہر زاویے سے مجھے اپنا جسم بھی دکھا رہی تھی تاکہ میری نگاہ اس کے بدن کے ہر حصے پر پڑے اور اس کے عقیدے کے مطابق اس کے پاپ جھڑتے جائیں۔ مجھ پر اس عورت کے جسم کے

زاویوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ایک تو میں انسانی جسم میں نہیں تھا، سنہ پ کے روپ میں تھا۔ دوسرے میرا ذہن صرف ایک ہی مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا بلکہ الجھا ہوا تھا کہ اس عورت کی مدد سے میں بھوپال کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ اگر میں بول سکتا تو یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔ میں بڑے آرام سے اسے کہتا کہ مجھے لے کر بھوپال کے فلاں مندر میں چلو وہ بڑی خوشی اور عقیدت کے ساتھ مجھے لے کر بھوپال روانہ ہو جاتی لیکن میں اسے انسان کی زبان سے کچھ نہیں بتا سکتا تھا، لکھ کر بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ میں اسی سوچ میں گم تھا اور وہ میرے سامنے طلوع ہوتے سورج کی سنہری روشنی میں دریا کی میڑھیوں پر بیٹھی نما رہی تھی۔

نمانے کے بعد اس نے کڑی ہو کر اپنے بالوں کو پنجڑ کر جھاڑا، کنگھی کی اور ساڑھی جسم کے گرد لپیٹ کر مجھے گودی میں اٹھالیا اور کہا۔

”ہمارا ناگ کی کپا سے میرے جسم کے سارے پاپ جھڑ گئے ہیں۔ اب میرا جیون سچل ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ کنیا میں چل کر دودھ پیئیں۔ آپ کو اپنے ہاتھوں سے دودھ پلاؤں گی۔“

میرا خیال تھا کنیا میں اس نے کسی برتن میں دودھ رکھا ہوگا لیکن وہاں آکر وہ مجھے اپنا دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں ہر بار منہ دوسری طرف کر لیتا۔ میں اس قسم کی حرکتوں سے سخت بیزار ہو چکا تھا۔ میری سوچ انسانی تھی۔ انسان جب کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہو تو اسے اس قسم کی حرکتیں اچھی نہیں لگتیں۔ جب میں نے دودھ نہ پیا تو اس نے مجھے پورے پر بٹھادیا اور ہاتھ باندھ کر کہا۔

”جو میرے ہمارا ناگ کی مرضی وہی میری مرضی۔ میں آپ کو بازار سے لا کر دودھ پلاؤں گی۔“

پھر اس نے میرے آگے گیندے کے پھول رکھے۔ لوہاں سلکایا اور اشلوک پڑھتے ہوئے میری پوجا شروع کر دی۔ لوہاں کی تیز بو نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ میں اٹھ کر باہر کی طرف جانے لگا تو اس نے مجھے بڑی محبت سے پکڑ کر اٹھلایا اور اپنے ساتھ لگا کر

دیس کی بجلی روشنی تھی۔ میں کنیا کے دروازے پر جو بوریا پڑا تھا اس کے نیچے سے ہو کر باہر آ گیا۔

اندھیرے میں میں نے دو آدمیوں کو دیکھا ایک دائنی جانب سے اور ایک بائیں جانب سے دبے پاؤں کنیا کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس نیت سے وہاں آئے ہیں۔ پچکار نے میری بڑی خدمت کی تھی۔ میں اس پر یہ ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ دونوں آدمی چوری کی نیت سے وہاں نہیں آئے تھے کیونکہ پچکار کی کنیا میں چرانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کی عزت پر حملہ کرنے آ رہے تھے۔ یہ پچکار بیوہ تھی اور اپنی ساس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر یہاں اپنے طریقے اور اپنے عقیدے کے مطابق پوجا پاٹھ کر کے زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں تجزی سے واپس پلٹ کر کنیا کے اندر چلا گیا اور جہاں سناپ کی مورتی رکھی تھی اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی جو شکل صورت سے ہی بد معاش لگ رہے تھے، بوریا اٹھا کر کنیا میں داخل ہو گئے۔ ایک نے جب سے خنجر نکال لیا اور دوسرے کو اشارہ کیا۔ دوسرے بد معاش نے جھک کر پچکار کو غور سے دیکھا پھر آہستہ سے اس کے ساتھ لیٹ گیا۔

پچکار اس طرح ہڑبدا کر اٹھ بیٹھی جیسے اسے کسی سناپ نے کلٹ لیا ہو۔ اپنی کنیا میں دو بد معاشوں کو دیکھ کر اس نے شور مچانے کے لیے منہ کھولا تو دوسرے آدمی نے اس کی گردن پر خنجر رکھ دیا اور کہا۔

”آواز نکلی تو گردن کلٹ دوں گا۔“

دوسرے بد معاش نے پچکار پر دست درازی شروع کر دی۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کس نیت سے اندر آئے ہیں۔ مجھے یہ خیال آیا تھا کہ شاید یہ سناپ کی وہ مورتی چرانے آئے ہوں جو کنیا کے اندر رکھی ہوئی تھی۔ بھارت کے مندروں سے پرانی مورتیاں چرانے کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ جب دوسرے بد معاش نے پچکار سے دست درازی شروع کی تو میں سناپ کی مورتی کے

ہوئی۔

”مہاراج! باہر کیوں جا رہے ہو؟ اگر لوہان کا دھواں پسند نہیں تو میں اسے بجھا دیتی ہوں۔“

اور اس نے لوہان بجھا دیا۔ سارا دن میں نے اس عورت کی کنیا میں گزار دیا۔ اس دوران کئی بار خیال آیا کہ باہر نکل کر بنارس ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑوں۔ پھر یہ سوچ کر وہیں بیٹھا رہا کہ دن کا وقت ہے۔ میں ہر ایک کو نظر آ جاؤں گا اور لوگ مجھے مارنے کو دوڑیں گے۔ سٹیشن ویسے بھی وہاں سے کافی دور تھا۔ یہی طے کیا کہ رات جب کافی گزر جائے گی اور لوگ سڑکوں پر نہیں ہوں گے تو سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ شاید بھوپال کی طرف جانے والی کوئی گاڑی مل جائے۔

یہ بیوہ عورت جس نے اپنا نام سوشیلا دیوی بتایا تھا سارا دن اپنی کنیا میں بیٹھی پوجا پاٹھ کرتی رہی۔ بھوجن بھی اس نے وہیں کیا۔ مجھے بازار سے دودھ بھی لاکر پلایا۔ شام کو وہ مجھے ساتھ لے کر دریا کنارے دوبارہ اٹھان کرنے گئی۔ رات ہوئی تو اس نے کنیا میں دیا جلایا اور کونے میں سناپ کی جو مورتی رکھی تھی اس کے آگے پھول رکھ کر مجھے اپنے سامنے بٹھایا اور اشوک پڑھنے شروع کر دیے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ رات ذرا گہری ہو تو میں کنیا سے نکل کر دریا کے کنارے کتنا رہتا ہوں۔ چتا بنارس ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑوں۔ میں اس عورت کو پچکار کہوں گا۔ پچکار کافی رات پڑے تک پوجا پاٹھ کرتی رہی۔ پھر مجھے بچے کی طرف اپنے ساتھ لگا کر وہیں بوسے پر لیٹ گئی۔ باہر سے دریا کی طرف سے کبھی کبھی شمر کی جانب سے کسی موٹریا ٹرک کے بارن کی آواز آ جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ رات ذرا اور گہری ہو جائے تو وہاں سے نکلوں۔ اس کے کچھ دیر بعد باہر گہری خاموشی چھا گئی۔ پچکار گہری نیند سو رہی تھی۔ میں آہستہ سے اس کے پلو سے نکل کر کنیا کے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر مجھے دو آدمیوں کے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں وہیں رک گیا۔ باہر دو آدمی ایک دوسرے کو کچھ کہہ رہے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ کنیا میں

”سمراج! بنگوں کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ میں بھی اب یہاں نہیں رہوں گی۔ میں کشمن پور کے ناگ مندر میں چلی جاؤں گی۔ باقی سارا جیون وہیں بسر کروں گی۔ آپ بھی میرے ساتھ جائیں۔ آپ کے بغیر میری پوجا لوصوری ہوگی۔“

کشمن پور کا سن کر میں چونک کر کشمن پور میں ناگن درگا رہتی تھی جو میری محسن تھی اور جو میری قوت گویائی کے ختم ہو جانے کا علاج کر سکتی تھی۔ میں ناگن درگا کے بارے میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ناگن درگا کشمن پور کے ایک برہمن کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ مرچکا تھا۔ بھگنوں میں ایک مندر تھا جس کے پجاری نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ ایک روز وہ مندر پوجا کرنے آئی تو پجاری نے اس کے ساتھ دست درازی کی۔ درگا نے اس کو تھپڑ دے مار۔ پجاری نے کہا۔

”میں تم سے اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا“ درگا۔

پجاری کے پاس منزلوں کی طاقت تھی۔ اس نے برہمن کی ایک ڈلی پر منتر پڑھ کر کسی طریقے سے درگا کو کھلا دی۔ برہمنی کھانے کے چند دن بعد درگا عورت سے ناگن بن گئی۔ ناگن بننے کے بعد سب سے پہلے اس نے پجاری کو ڈس کر ہلاک کر دیا۔ اب اس کی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ عورت کے روپ میں واپس آنے کے لیے وہ تپیا کر رہی تھی۔ جب وہ مجھے وسطی ہندوستان کے ایک جنگل میں ملی تو اس کو ناگن بنے پانچ برس گزر چکے تھے۔ اس نے مجھے کہا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ پانچ برس کے بعد جب میں کشمن پور کے قریب اللت پور کے وشوا تری کے مندر میں بیٹھ کر ایک ماہ تپیا کروں گی تو دوبارہ اپنی عورت کی شکل میں واپس آ جاؤں گی۔ تم کبھی کشمن پور آؤ تو اللت پور وشوا تری کے مندر میں مجھ سے ضرور ملنا۔ میں وہیں تمہیں ملوں گی۔“

مجھے یقین تھا کہ کشمن پور کی ناگن درگا ہی میری اس بیماری کا علاج کر سکے گی۔ وہ خود ناگن بننے کے عذاب سے گزر چکی ہے اور اب تک ضرور عورت کے روپ میں واپس آ چکی ہوگی۔ اس نے مجھے ستاپ کے روپ میں ہی دیکھا ہوا تھا اور وہ مجھے

پچھے سے ریک کر اس بد معاش کے عقب میں آ گیا جس نے خنجر پجارن کی گردن پر رکھا ہوا تھا۔ اس بد معاش نے دھوٹی دھری کر کے اوپر کی ہوئی تھی اور اس کی پنڈلیاں تنگی تھیں۔ میرے لیے اس سے آسان ٹارگٹ اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے لپک کر اس کی پنڈلی پر ڈس دیا۔ بد معاش کے منہ سے عجیب سی آواز نکلتے نکلتے لوصوری رہ گئی اور وہ ایک طرف کو کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔ میرے زہر کا فوری اثر یہی ہوتا تھا کہ آدمی کی سب سے پہلے آواز بند ہو جاتی تھی۔ اس بد معاش کی بڑی ہمت تھی کہ میرے ڈسنے کے بعد بھی اس کے حلق سے لوصوری آواز نکل آئی تھی۔

اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر دوسرے بد معاش نے گھبرا کر پجارن کو چھوڑ دیا اور باہر کی طرف بھاگا۔ لیکن میں اسے کیسے بھاگنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ باہر کو دوڑا میں اچھل کر اس کے کندھے پر آیا اور اس کی گردن پر ڈسنے کے بعد فوراً اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔ دوسرا بد معاش بھی منہ کے بل گر پڑا۔ پجارن نے دیے کی روشنی میں دونوں بد معاشوں کو گرتے دیکھا تو پچھتی پچھتی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں دونوں لاشوں کے درمیان پھن گھوبے بیٹھا تھا۔ وہ روتے ہوئے میرے آگے سجے میں گر پڑی۔

”سمراج! آپ نے میری عزت بچائی۔ سماراج آپ نے مجھ ابھانگن کی عزت بچا لی۔“

وہ روئے جا رہی تھی۔ میں اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ میرے آگے سجے میں پڑی روتی رہی اور میں خاموش اپنی جگہ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر روتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے عورتوں پر مردوں نے بڑے ظلم کیے ہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ ظلم عورتوں پر ہی ہوئے ہیں۔

پھر میں خاموشی سے دروازے کی طرف رہینگے لنگ اس نے بے اختیار ہو کر مجھے دونوں ہاتھوں سے اٹھالیا۔ شاید وہ میرا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ کئے گئی۔

نہیں باقی ساری رات چلتی رہی اور شیشوں پر کھڑی بھی ہوتی رہی۔ ابھی دن کا
اجلا پھیلنے لگا تھا کہ ایک شیش پر پکارن گاڑی سے اتر گئی۔ چھوٹا سا شیش تھا۔ پکارن
نے مجھ سے کہا۔
”مہاراج! ہم کنٹین پور پہنچ گئے ہیں۔ ناگ مندر یہاں سے دور نہیں ہے۔
پیدل جانا ہو گا مجھے۔ اس وقت کوئی سواری اور نہیں جاتی۔“
میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا اور وہ شیش سے باہر نکل کر صبح کلاب کے
دھندلے میں کھیتوں میں چل پڑی۔



Famous Urdu Novels

Free pdf Library

ضرور پہچان لے گی۔ پہچان نہ سکی تو میری بو اسے ضرور بتا دے گی کہ میں وہی کرم داد
ہوں جو کبھی اسے جنگل کے ایک مندر میں ملا تھا۔
میں پکارن سے پوچھتا چاہتا تھا کہ یہ کنٹین پور وہی ہے جس کے بارے میں
ناگن درگا نے مجھے بتایا تھا یا کوئی اور ہے۔ مگر میں اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن
میں نے اب پکارن کے ساتھ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس طرح سے کم از کم میں
بنارس سے تو نکل جاؤں گا۔ پکارن اس لیے وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی کہ اس کی کنیا
میں دو آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ صبح ہوتے ہی سب کو معلوم ہو جائے گا اور
پولیس اسے پکڑ کر لے جائے گی۔ پکارن نے مجھے اپنی سازش کے اندر چھپایا۔ ایک
گھڑی میں اپنے پرانے کپڑے ڈالے۔ گھڑی بھل میں وہاں کی کنیا سے نکل کر دریا
کے کنارے کی سمت رات کے اندھیرے میں تیز تیز چل پڑی۔ وہ کچھ دور تک دریا کے
ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ پھر ایک جگہ دریا سے الگ ہو کر درختوں کے درمیان سے گزرتی
ایک سڑک پر آگئی۔ آگے کوئی بستی تھی۔ بستی کی روشنیوں دور ہی سے نظر آ رہی
تھیں۔ پکارن وہاں سے بھی لایک طرف ہو گئی اور بستی سے دور ہٹ کر آگے نکل
گئی۔

بستی سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریلوے شیش تھا۔ یہ بنارس سے دلی کی
جانب جاتے ہوئے پہلا شیش تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پکارن بنارس کے ریلوے شیش
سے گاڑی میں سوار ہونا نہیں چاہتی۔ اس نے شیش پر آکر کسی جگہ کا ٹکٹ لیا اور
پلیٹ فارم پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے جس جگہ کا ٹکٹ خریدا تھا اس کا نام میں اچھی
طرح سے نہ سن سکا۔ آدھے گھنٹے بعد بنارس کی طرف سے ایک ٹرین آگئی۔ پکارن
گھڑی بھل میں دہائے ٹرین میں سوار ہو گئی۔ ٹرین چل پڑی۔ وہ عورتوں کے ڈبے میں
بیٹھی تھی جو عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اکثر عورتیں بے سادہ ہو کر سو رہی تھیں۔

پکارن نے سر نیچے کر کے مجھے آہستہ سے کہا۔
”مہاراج! ہم بہت جلد کنٹین پور پہنچ جائیں گے۔“

جی کی پوجا پاٹھ میں بسر کروں گی۔

پچارن کی ماسی نے مندر کے بڑے پجاری سے کہہ کر اسے ایک علیحدہ کوشنری لے دی۔ پچارن نے اپنی کوشنری میں آتے ہی مجھے دیوار کے طاق میں بٹھا دیا اور کہل ”سمراج میں کتنی بھاگیاہ دتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ یہاں آگئے ہیں۔ میں آپ کی بڑی سدا کروں گی۔ مجھے معلوم ہے آپ نے ان دونوں بد معاشوں کو ڈس کر میری عزت بچائی تھی۔ میں آپ کا یہ احسن ساری زندگی نہیں اتار سکتی۔ آپ اس رات وہاں نہ ہوتے تو نہ چلے میرا کیا حال ہوتا۔“

وہ کوشنری میں جھاڑو دے رہی تھی۔

اس کوشنری میں مجھے آئے تین دن گزر گئے تھے۔ پچارن صبح شام مجھے ساتھ لے کر ناگ مندر پوجا کرنے جاتی تھی۔ جب تک وہ پوجا کر رہی ہوتی، اس نے مجھے اپنی ساڑھی میں چھپایا ہوا تھا۔ رات کو مجھے پیالی میں دودھ ڈال کر پلاتی۔ صبح مجھے اشٹن کراتی۔ میرے جسم کو کپڑے سے صاف کرتی۔ مجھ سے باتیں کرتی اور بھر مجھے ہاتھ نیچتی اور میرے آگے ادب سے بیٹھ کر اشلوک پڑھتی۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ چوتھے دن شام کے وقت پچارن مجھے اپنی ساڑھی میں چھپائے ناگ مندر پوجا کرنے آئی تو وہاں ایک ایک عورت ملی جو کشمن پور سے آئی تھی۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مندر کے پاس ہی ایک جگہ سے تیل گاڑیاں کشمن پور کو جاتی ہیں۔ جو وہاں سے تین چار کوس کے فاصلے پر ہی ہے۔ مجھے یہی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔

رات گزارنے کے بعد دن کا اجالا ابھی پوری طرح سے نہیں پھیلا تھا کہ میں پچارن کی کوشنری سے رینگتا ہوا نکلا اور ناگ مندر کی طرف چل پڑا۔ مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ کشمن پور کو تیل گاڑیاں صبح بھی چلتی ہیں۔ ناگ مندر کے عقب میں کچھ فاصلے پر ایک لائین جل رہی تھی۔ وہاں دو تین تیل گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ رینگتا وہاں پہنچ گیا۔ ایک تیل گاڑی پر عورتیں اور بچے سوار تھے۔ گاڑی بن گدی پر بیٹھنا ریل پی رہا تھا۔ اس نے آواز لگائی تو معلوم ہوا یہ تیل گاڑی کشمن



دن نکل آیا تھا جب وہ ایک پرانے مندر کے پاس آکر رک گئی۔ میں اس کے کمرہ کے اندر تھا۔ اس نے کہل

”سمراج! یہ ناگ جی کا پرانا مندر ہے۔ میں ان کی بھگتی ہوں۔ یہاں میری ایک ماسی ایک کوشنری میں آگئی رہتی ہے۔ میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔ مجھے وہ ایک دوسری کوشنری لے دے گی۔ پھر میں اور آپ اس کوشنری میں آکے رہیں گے اور میں آپ کی دن رات سدا کروں گی۔“

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہاں سے لٹ پور کہاں ہے۔ جمل و شواہد کا مندر تھا اور جمل ناگن درگا رہتی تھی۔ مگر میری مجبوری یہ تھی کہ میں پچارن سے انسان کی زبان میں کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہاں کے لوگوں کی باتوں سے مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ کشمن پور کس طرف ہے۔ ناگن درگا کے پاس میں زیادہ دیر نہیں رہا تھا اس لیے مجھے اس کے جسم کی بو کی شناخت نہیں تھی۔ اگر مجھے اس کے جسم کی بو کی شناخت ہوتی تو میں اسے تلاش کر سکتا تھا۔ پچارن مجھے مندر کی ایک کوشنری میں لے آئی۔ یہاں ایک بوڑھی عورت باہر بیٹھی دیکھی میں چائے پکا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر پچارن کے گلے لگ کر ملی۔ دونوں عورتیں رونے لگیں۔ یہ پچارن کی ماسی تھی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ پچارن نے اسے ہمارے والی کنیا میں جو حلوہ ہوا تھا اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ یہی کہنا کہ میں اب باقی کی عمر ناگ مندر میں ناگ

تھی اس لیے میں جمونپڑی سے باہر نکل آیا۔ آسمان روشن تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مجھے دور سے ایک عورت جمونپڑی کی طرف آتی دکھائی دی۔ میں نے دور ہی سے اسے پہچان لیا یہ ناگن درگا تھی۔

میں جلدی سے ایک طرف ہو کر گھاس میں چھپ گیا۔ ناگن درگہ نے مجھے انسانی روپ میں دیکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ستپ کے روپ میں نہیں دیکھا تھا۔ یہی خیال آنا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ میں بول کر اسے بتا نہیں سکوں گا۔ میں گھاس میں چھپا رہا اور ناگن درگا میرے قریب سے گزر گئی۔ شاید وہ ندی میں اشیان کر کے آئی تھی۔ اس کے بل کھلے تھے۔ سفید ساڑھی اس نے اس طرح سے باندھ رکھی تھی کہ اس کا ایک بازو شانے تک عریاں تھا۔ میں نے آپ کو ساتپوں کی ایک خصلت بیان کرنی ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ میں نے ناگن درگا کو کیسے پہچان لیا تھا کیونکہ میں نے تو اسے ناگن یعنی ساتپ کی شکل میں دیکھا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ساتپ جس کے پاس سو برس زندہ رہنے کے بعد یہ طاقت آ جاتی ہے کہ وہ ساتپ سے انسان کا روپ بدل لیتا ہے تو اس میں یہ ہفتی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی ایسے دوسرے ساتپ کو جو انسان سے ساتپ بن گیا ہو، اس کی اصل شکل سے پہچان لیتا ہے۔

میں خود بول کر اسے بتا نہیں سکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ناگن درگا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر جا کر چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ پھر واپس مڑی۔ قدم قدم چلتی چلتی جہاں میں گھاس میں چھپا ہوا تھا وہاں سے ایک دو گز دور کھڑی ہو کر فضا کو سونگھنے لگی۔ میرے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ شاید ناگن درگا نے اپنی ہفتی سے میرے جسم کی بو پالی تھی۔ وہ بو سونگھتے سونگھتے میرے قریب آئی اور جھک کر مجھے گھاس میں چھپے ہوئے دیکھا۔

”کرم دا! یہ تم ہو؟“

پور ہی جا رہی ہے۔ ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا۔ میں اندھیرے میں دوسری طرف سے آ کر تیل گاڑی کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا کہ تیل گاڑی لکشمین پور کی طرف چل پڑی۔ دو تین کوس کا فاصلہ کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ تیل گاڑی کی رفتار ست تھی لیکن لکشمین پور پہنچنے زیادہ دیر نہ لگی۔ سورج مشرقی افق پر تھوڑا سا ہی آیا تھا کہ تیل گاڑی لکشمین پور پہنچ گئی۔ دن کی روشنی میں مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ناگن درگہ نے کنا تھا کہ وہ وشواستر کے مندر کے قریب ایک جمونپڑی میں رہتی ہے۔ میں نے اونچی جگہ چڑھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے اسی طرح وشواستر کے مندر کو تلاش کرنا تھا۔ میں کسی سے مندر کا پوچھ نہیں سکا تھا۔ ایک جانب تاڑکے اونچے اونچے ستونوں ایسے درختوں کے درمیان مجھے ایک چھوٹا سا مندر نظر پڑا۔ یہی وشواستر کا مندر ہو سکتا تھا۔ وہاں اور کوئی مندر نہیں تھا۔ میں نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ مندر میں پوجا ہو رہی تھی۔ آرتی اتاری جا رہی تھی۔ بھجن کی ترن کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں مندر کے عقب میں آ گیا۔

میری آنکھیں اس کھنڈ کو تلاش کر رہی تھیں جس کے قریب ناگن درگا کی جمونپڑی تھی۔ آخر میری نگاہوں نے اسے تلاش کر لیا۔ یہ پاس کے ڈنڈوں کو جوڑ کر بنائی گئی جمونپڑی تھی۔ ڈھلانی چھت ناریل کی شاخیں جوڑ کر بنی ہوئی تھی۔ جمونپڑی کے آگے بوریا لٹک رہا تھا۔ باہر ایک طرف مٹی کے دو گھڑے پڑے تھے۔ میں ناگن درگا کے جسم کی بو سے مانوس نہیں تھا کیونکہ میں اس کے پاس زیادہ دن نہیں رہا تھا۔ اگر زیادہ دن رہا ہوتا تو مجھے اس کے جسم کی بو شناخت ہو جاتی۔ اب مجھے اسے تلاش کرنا تھا۔ جمونپڑی پر خاموشی چھائی تھی۔ ہو سکتا ہے ناگن درگا جمونپڑی میں بیٹھی ہو۔ یہ سوچ کر میں بوریے کے نیچے سے گزر کر جمونپڑے میں داخل ہو گیا۔ جمونپڑی خالی تھی۔ اندر چارپائی بچھی تھی۔ دو تین مٹی کے برتن ایک پیتل کی گالگر، ایک چوکی پڑی تھی۔ رسی پر کیڑے رنگ کی دھوئیاں لٹک رہی تھیں۔ ناگن درگا چونکہ وہاں نہیں

پوچھا۔

”تمہاری جتنی کہل ہے؟“

پھر خود ہی بولی۔

”مگر تم تو شہر کا نام نہیں جانتا سکو گے۔ یہ بتاؤ کہ دورہ پڑنے پر سناپ کے روپ میں آنے کے بعد تم پر کس نے منتر پھونک کر تمہاری انسانی آواز ختم کر دی تھی۔“

میں خاموش رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”میں پھر بھول گئی تھی کہ تم تو بول نہیں سکتے۔ خیر کوئی بات نہیں میں تمہارا جلاو اتارنے کی کوشش کروں گی۔ ایک جگہ مجھے معلوم ہے جہاں تم پر کیا گیا جلاو اتار سکتا ہے۔ بس مجھے تھوڑا سا چلہ کرنا پڑے گا۔ تمہاری خاطر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“

اس نے ایک خاص انداز سے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھے اٹھا کر میرا منہ چوم لیا۔ یہ پہلی عورت میں نے دیکھی تھی جو میرا سناپ والا منہ چوم رہی تھی۔ اس کی یہ گرم جوشی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ آگے چل کر مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا کہ ناگن درگا مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ لیکن اس وقت تک اس نے اپنی زبان سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ناگن درگا نے مجھے چوکی پر بٹھا دیا اور گیندے کے پھول جو وہ ندی پر سے لائی تھی، انہیں تھلی میں سجایا اور تھلی میرے آگے رکھ کر ہاتھ جوڑ کر مجھے پرہام کیا اور بولی۔

”کرم دلا! یہاں سے کچھ دور جنگل میں ماما کستی کا مرگھٹ ہے۔ اس مرگھٹ میں ماما کستی کی سلوہ ہے۔ مجھے وہاں سات راتیں تمہیں ساتھ لے کر چلہ کرنا ہو گا۔ بھگوان نے چھاپا تو آٹھویں روز تمہارا جلاو ٹوٹ جائے گا اور تم اپنی انسانی آواز میں بولنے لگو گے۔ اب تم شانت ہو جاؤ۔ میں آج رات ہی سے یہ چلہ شروع کر دوں گی۔“

میں نے گھاس میں سے گردن لوہڑا اٹھائی اور آہستہ آہستہ آگے پیچھے سر ہلانے لگا۔ جیسے اسے کہہ رہا تھا کہ ہاں میں ہی کرم داو ہوں۔ ناگن درگا غور سے مجھے تک رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”کرم دلا! تم بول نہیں سکتے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو ناگن درگا نے مجھے جھک کر اٹھایا اور مجھے اپنے منہ کے قریب لے جا کر ایک بار پھر سو گھٹا۔

”ہاں تم کرم داو ہی ہو، مجھے تمہاری خوشبو آ رہی ہے جو میں نے ناگن کے روپ میں سو گھٹی تھی۔“

میں نے ایک بار پھر انہماک میں سر ہلایا تو ناگن درگا مسکرائی۔ اس نے میرا منہ چوم لیا اور بولی۔

”تمہیں اشارے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ تم کرم داو ہو۔ تم اس لیے نہیں بول سکتے کہ تم پر کسی نے ناگ منی کا منتر پھونکا ہوا ہے۔ فکر نہ کرو میں تم پر کیا ہوا جلاو اتار دوں گی۔ آخر میں بھی پانچ سال تک ناگن بنی رہی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم میرے پاس آ گئے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ ضرور ہوئی ہوگی مگر تم نے کمال کر دیا کہ سناپ ہو کر اتنی دور آ گئے آؤ میرے ساتھ جمونپڑی میں۔ میں تمہیں دودھ پلاتی ہوں۔“

وہ مجھے جمونپڑی میں لے آئی۔ جتنی کی گڑوی میں سے اس نے دودھ نکل کر مٹی کی پیالی میں ڈالا اور میرے آگے رکھ دیا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ دودھ پینے لگا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب ناگن درگا کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ ناگن کے روپ میں تھی تو میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں اور ہندوستان میں کیسے آیا تھا اور میری بیوی کا نام جیلہ ہے جو مجھ سے بچھڑ چکی ہے۔ میں نے دودھ پی لیا تو اس دوران ناگن درگا ہاٹوں میں نکلتی کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے

اپنی گردن میں ڈالا اور بولی۔

”کرم دادا! اب تم میرے ساتھ مانا کستی کے سلوہ پر چلو گے۔“

اس نے پانی کی گڑوی اپنے ساتھ لے لی تھی۔ جمو پڑی سے نکل کر وہ نشیب میں اتر گئی۔ آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جنگل میں سناٹا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ناگن درگا جنگل کے ایک طرف ہو کر چل رہی تھی جہاں کچی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ مجھے اندر سے میں پگڈنڈی صاف نظر آ رہی تھی۔ کوئی ایک میل تک پگڈنڈی پر چلنے کے بعد ناگن درگا پگڈنڈی سے اتر کر بائیں جانب درختوں کی طرف ہو گئی۔ ان درختوں میں مجھے دور سے ایک پرانے کھنڈر کی شکستہ عمارت نظر آئی۔ ناگن درگا نے کہا۔

”کرم دادا! ہم مانا کستی کے سلوہ پر پہنچ گئے ہیں۔ پریشان مت ہونا میں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“

کھنڈر کی ایک طرف چبوترے پر ایک چھوٹی سی سلوہ تھی۔ چبوترے کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا۔ سلوہ کے طاق میں ایک سانپ کی مورتی مجھے اندر سے میں نظر آ گئی۔ ناگن درگا اس مورتی کے آگے بیٹھ گئی۔ مجھے اس نے اپنے قریب ہی بٹھا دیا۔ کہنے لگی۔

”یہ مانا کستی کی بھتیجی ناگن مورتی ہے۔ جب میں سات راٹیں چلہ پورا کر لوں گی تو اس ناگن کی مورتی کے منہ سے پمپکار کی آواز آئے گی۔ اس کے ساتھ ہی تمہارا جلوہ ٹوٹ جائے گا اور تمہاری بولنے کی حقّی واپس آ جائے گی۔ اب میں چلہ شروع کرتی ہوں۔“

اس نے ہاتھ باندھ لیے اور آگے پیچھے ہلتے ہوئے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ ظاہر ہے میں وہاں سوائے بور ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے جا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ناگن درگا صرف میرے لیے یہ چلہ کر رہی تھی اور میرا وہاں موجود ہونا بتول اس کے ضروری تھا۔ وہ ہر پانچ سات منٹ کے بعد اشلوک پڑھتے پڑھتے مجھ پر بھوکہ مار دیتی تھی۔ میرے لیے یہ سب بیکار کی باتیں تھیں۔ لیکن دل میں یہ خیال

شام کو اس نے چلہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ندی پر گئی۔ شام کے چھینٹنے کا وقت تھا۔ اندیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اس نے مجھے کنارے پر بٹھا دیا اور خود ندی میں اتر کر نہالے گئی۔ وہ ایک جوان عورت تھی۔ میں اس کے صحت مند جسم کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کس طرح ایک خلود کے بغیر ساری زندگی بسر کرے گی۔ جس طرف سورج غروب ہو چکا تھا، ناگن درگا نے اس طرف منہ کیا ہوا تھا اور ہاتھوں سے ندی کا پانی اچھال کر اپنے اوپر ڈال رہی تھی اور اشلوک پڑھ رہی تھی۔ میں ندی کے کنارے پر گھاس میں کنڈی مار کر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ میں کس مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے جیلہ کا خیال آ رہا تھا کہ وہ میرے لیے کس قدر پریشان نہیں ہوگی۔ کماؤ مضر خالہ نے اسے بتا دیا ہوگا کہ کرم دادا! ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

اشن کرنے کے بعد ناگن عریاں حالت میں ندی سے نکل آئی۔ اس نے ساڑھی اٹھا کر بھاڑی اور اسے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ پھر مجھے اٹھا کر پیٹنے سے لگایا۔ گڑوی میں ندی کا پانی بھرا اور کہنے لگا۔

”یہ مانا کستی کا خاص اشنان تھا۔ اب میں تمہیں لے کر مانا کستی کے سلوہ پر جاؤں گی اور ساری رات چلہ کروں گی۔ تم میرے پاس ہی رہو گے۔ تم سے الگ ہو کر میں یہ چلہ نہیں کر سکتی۔ تم چلو گے تا میرے ساتھ کرم دادا!“

وہ اس طرح مجھ سے پوچھ رہی تھی جیسے میں انسانی شکل میں اس کے پاس موجود ہوں۔ میں بول نہیں سکتا تھا۔ اگر بول سکتا تو اسے اک ہی بات کہتا کہ اپنے بھگوان کے لیے مجھے کسی طرح بھوپال میری پیوی جیلہ کے پاس پہنچا دو۔ مگر میں یہ بات اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میری قوت گوئی سب ہو چکی تھی۔

آدھی رات تک ناگن درگا مجھے جمو پڑی میں اپنے سامنے چوکی پر بٹھا کر عجیب و غریب زبان میں اشلوک پڑھتی رہی۔ جب کئی رات گزر گئی اور اس نے مجھے اٹھا کر

ضرور آتا تھا کہ مجھ پر جو سخی جلوہ ہوا ہے اس کا توڑ ناگن درگا کا سخی چلہ ہی ہو سکتا ہے۔ باقی کی آدھی رات ناگن درگا اشلوک پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکنی رہی۔ جب پو پھننے لگی تو وہ مجھے لے کر واپس جھونپڑی میں آگئی اور اپنے ساتھ لگا کر سو گئی۔ جب وہ خراٹے لینے لگی تو میں چارپائی سے کھسک کر چارپائی سے نیچے اتر آیا اور جھونپڑی سے نکل گیا۔ باہر خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے پریشان خیالوں میں کھو گیا۔ کبھی سوچتا کہ اس بک بک کو بیس چھوڑ کر یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ لکھن پور پہنچا ہوں تو کسی نہ کسی طرح گرنا پڑتا بھوپال بھی پہنچ جاؤں گا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں بھوپال سے کتنی دور ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ بہت ممکن تھا کہ ناگن درگا کی چلہ کشی سے میری انسانی قوت گریباں واپس آ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں چلہ کشی کے اثر سے پھر سے انسانی شکل اختیار کر جاؤں۔ بس یہی ایک موہوم سی امید تھی جو مجھے ناگن درگا کے پاس روکے ہوئے تھی اور میں اس کے پاس رہنے پر مجبور تھا۔

ناگن درگا کا چلہ سات راتوں تک جاری رہا۔ ہر رات میں اس کے ساتھ مانا کستی کے سلوہ پڑ جاتا اور جب تک وہ چلہ کشی کرتی میں اس کے پہلو میں بیٹھا رہتا۔ جب انھیں رات آتی تو ناگن درگا بڑی خوش تھی۔ اس نے مجھے نڈی پر لے جا کر مجھے بھی شلایا خود بھی ایشن کیا اور کہنے لگی۔

”کرم داد! آج رات کو تم اپنی انسانوں والی آواز میں بولنا شروع کر دو گے۔ تم پر کیا گیا جلوہ لوٹ کر نکھر جائے گا۔ مانا کستی کی ناگن تم پر پھنکار مارے گی اور تم فوراً بولنا شروع کر دو گے۔ اب تو تم خوش ہو ئیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ناگن درگا نے مجھے چوم لیا۔ جس طرح کہ وہ فرط جذبات سے مجھے پہلے بھی چوما کرتی تھی۔ جب رات گری ہو گئی تو وہ ملایا کستی کے سلوہ پر آ کر اتنی پابندی مار کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس نے معمول کے مطابق اپنے ساتھ ہی ایک طرف بیٹھا دیا۔ وہ سامنے والے طاق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں مانا کستی ناگن کی

مورتی رکھی ہوئی تھی۔ جنگل میں چاروں طرف گہری تاریکی اور خاموشی تھی۔ آسمان پر بادل بھی تھے اور کہیں کہیں تارے بھی نظر آ رہے تھے۔ ناگن درگا نے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ دس پندرہ منٹ تک وہ اشلوک پڑھتی رہی۔ پھر خاموش ہو گئی۔ ایک منٹ تک خاموش رہی پھر مانا کستی کی ناگن کو مخاطب کر کے بولی۔

”ہے مانا کستی! ہے مانا ناگن! میں نے تیرا چلہ پورا کر دیا ہے اب مجھے اپنا آئینہ یاد دے اور کرم داد کو بولنے کی ہمتی دے۔“

جیسے ہی اس نے یہ الفاظ ادا کیے جنگل کی طرف سے ایسی چی کی آواز آئی جیسے کسی چڑیل نے آواز بلند کی ہو۔ میں کنڈلی مار کر بیٹھے بیٹھے ڈر گیا۔ ناگن درگا بھی کچھ پریشان سی ہوئی۔ اس نے گردن موڑ کر جنگل کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ باندھ کر ناگن کی مورتی سے کہل۔

”ہے مانا ناگن! مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو تو مجھے شاکر دے“ مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو تو شاکر دے۔“

وہ بار بار یہ جملہ دہرائے لگی۔ جنگل میں ایک بار پھر وہی ہمایاک چی بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جس طاق میں ناگن کی مورتی تھی اس کے پیچھے ایک ڈراؤنی شکل نمودار ہوئی۔ یہ ڈراؤنی شکل ایک عورت کی تھی جس کی سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ سر کے اوپر ایک سانپ پھن کھولے بیٹھا تھا۔ ناگن درگا نے اس شکل کو دیکھا تو اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ خوف سے کانپتے ہوئی آواز میں بولی۔

”مانا مجھے شاکر دے“ مانا مجھے شاکر دے۔“

ڈراؤنی شکل والی عورت کی سرخ زبان اندر چلی گئی۔ تب اس عورت نے اپنی شکل سے زیادہ ڈراؤنی اور گھسی ہوئی آواز میں کہل۔

”درگا! درگا! اگر تیرا نام درگا نہ ہوتا تو میں تمہیں اسی جگہ بھسم کر دیتی۔ پر یہ نام کل مانا کا ایک نام بھی ہے۔ لیکن تو نے جو اپراوہ (جرم) کیا ہے تمہیں اس کی سزا مل کر رہے گی۔“

”کرم دلا! بھگون کی بیوی کیا ہوئی ہے کہ تمہاری انسانی آواز پھر سے واپس آ گئی۔ اگر مجھ پر دیوتوں کا عذاب پڑتا ہے تو کوئی بات نہیں میں اس مصیبت کو جھیل لوں گی لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم پھر سے بولنے لگے ہو۔“

میں نے کہا۔

”لیکن درگا میرے لیے یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ تم پھر سے ناگن بن گئی ہو۔ لیکن تم نگر نہ کرو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا اور جیسے ہی انسانی شکل میں واپس آیا تمہارا منہ چوم کر تمہیں بھی انسانی شکل میں واپس لے آؤں گا۔ لیکن درگا کیا اس طرح کرنے سے تم دوبارہ عورت کے روپ میں واپس آ جاؤ گی؟“

درگا ناگن نے اپنے منہ سے مسکاری سی بھر کر اس لیے میں کہا۔

”ہاں کرم دلا! مانا کستی نے جو کچھ کہا ہے ایسے ہی ہوگا۔ لیکن تم مجھے اپنے ساتھ کہاں لیے چلو گے؟ تم خود سناپ کے روپ میں ہو۔“

میں نے کہا۔

”اس دھرتی پر اور بھی تو ناگ ناگنیں زندہ رہتی ہیں۔ ہم بھی رہ لیں گے۔ تم گھبراؤ نہیں مجھ پر کسی وقت دوبارہ بڑھ سکتا ہے اور میں کسی بھی لیے انسانی شکل میں واپس آ سکتا ہوں۔“

ناگن درگا نے کہا۔

”تم مانا کستی کے شراب (بد دعا) کو نہیں چاہتے۔ وہ اپنے جلدو سے جہیں کبھی انسانی شکل میں واپس نہیں آئے دے گی۔“

میں نے غصے کے ساتھ کہا۔

”اس تمہاری مانا کستی کی ایسی کی تھی۔“

ناگن درگا نے رحم طلب لیے میں کہا۔

”بھگون کے لیے ایسا نہ کرو کرم دلا! مانا کستی شاید ابھی بیٹیں ہوگی۔ چلو۔ یہاں

میں بھی ڈر کر ناگن درگا کے ساتھ لگ گیا تھا کہ یہ سفل جلدو گری کی کارستانی ہیں اور یہ کوئی بدروح ہے جس کے کھٹے میں ناگن درگا پھنس گئی ہے۔ ناگن درگا کی یہ حالت تھی کہ اب اس کے منہ سے لفظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔ وہ رک رک کر ایسی آوازیں نکال رہی تھی جیسے بین کر رہی ہو۔ ڈراؤنی شکل نے ایک بار پھر اپنی وحشت ناک اور غضب آلود آواز میں کہا۔

”درگا! تو نے ایک مسلمان کو میرے سلوہ پر لا کر میرے استھان کو بھڑٹ کر دیا ہے۔ میں تجھے اس کی سزا دوں گی۔ میں تجھے شراب (بد دعا) دیتی ہوں کہ تو ایک بار پھر ناگن کا روپ اختیار کرے گی اور اس وقت تک ناگن ہی رہے گی جب تک کہ یہ وحشت مسلمان جو ناگ بن کر تمہارے پاس بیٹھا ہے اپنی انسانی صورت میں واپس آ کر تیرا منہ نہیں چومتا۔ دفع ہو جا آلوپ ہو جا۔“

اندھیرے میں مجھے اس بدروح کی ڈراؤنی صورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی بد دعا پوری کر کے فوراً ہی عتاب ہو گئی۔ مجھے اپنے پہلو میں جمل ناگن درگا بیٹھی تھی ایک جھکا سا لٹکا محسوس ہوا۔ میں نے ہلٹ کر دیکھا تو خوف سے کلب اٹھل میرے پہلو میں اب درگا نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ ناگن کڈلی مارے بیٹھی تھی اور بار بار اپنا سر زمین پر مار رہی تھی۔ مجھے ناگن درگا کی عورت کی آواز آئی۔

”کرم دلا! مانا کستی نے مجھے دھکا دیا ہے۔ مجھے شراب دیا ہے۔ اب میں اس وقت تک ناگن ہی بنی رہوں گی جب تک کہ تو اپنی انسانی شکل میں واپس آ کر میرا منہ نہیں چومتا۔“

اچانک میرے منہ سے انسانی آواز نکلی۔ میں اپنی آواز پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”خدا مجھے معاف کر دے گا درگا! میری وجہ سے تمہیں۔“

میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور اپنی آواز سن کر حیران ہونے لگا۔ ناگن درگا بھی سناپ کی شکل میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی عورت کی آواز میں کہا۔

سے چلے چلو۔

جب ہم وہاں آئے تھے تو میں سانپ کے روپ میں تھا اور ناگن درگا عورت کے روپ میں تھی۔ اب جبکہ ہم وہاں سے واپس جا رہے تھے تو دونوں ناگ اور ناگن کے روپ میں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے میں بول نہیں سکتا تھا اب میں بھی اپنی انسانی آواز میں بات کر سکتا تھا۔ خدا جانے یہ درگا کے اشلوکوں کا یا چلے کا اثر تھا یا کیا تھا لیکن میری خوش قسمتی کی یہ ایک بات ہو گئی تھی۔

ہم دونوں اسی طرح رہ گئے ہوئے سلوہ کے چوتھے سے اتر کر ناگن درگا کی جمونپدی کی طرف چل پڑے جس طرح جنگل میں ناگ ناگن کھڑا رات کو میر کیا کرتا ہے۔ ہم ناگ ناگن کا جوڑا ہی بن گئے تھے۔ جمونپدی میں کھینچنے کے بعد ناگن درگا چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے پاس کٹنی مار کر بیٹھ گیا۔ ناگن درگا کے منہ سے جیسے ایک آہ نکل گئی۔ کہنے لگی۔

”کرم دادا! تم میری خاطر اپنی زندگیوں مصیبتوں میں ڈال رہے ہو۔ مجھے میرے حل پر چھوڑ دو اور تم میں سے اپنی پیوی کے پاس واپس چلے جاؤ۔“

میں نے کہا۔

”درگا! تمہاری قسمت مجھ سے جوڑ دی گئی ہے۔ تم اس صورت میں عورت کی شکل میں واپس آ سکتی ہو جب میں انسان کی شکل میں واپس آؤں گا اور تمہارے منہ کو چوم لوں گا تو پھر میں تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ کوئی پتہ نہیں میں کس وقت سانپ سے انسان کی شکل میں واپس آ جاؤں۔ تب تم بھی اپنی اصلی شکل اختیار کر کے واپس میں لکشمی پور میں آ جاؤ۔“

ناگن درگا آہ سی بھر کر خاموش رہی۔

میرا خیال ہے اس وقت رات کے دو ڈھائی بجے کا وقت ہو گا۔ مجھے نیند کی حاجت نہیں تھی۔ سانپ کے روپ میں آنے کے بعد ناگن درگا کو بھی نیند کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”کرم دادا! ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم کبھی بھی انسانی شکل میں واپس نہ آ سکو۔“

میں نے کہا۔

”ایسا نہیں ہو گا میرا انسان اور سانپ کے درمیان کا وقفہ لمبا ہو سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ اگر میں انسان ہوں تو سانپ کے روپ میں اور اگر سانپ ہوں تو انسان کے روپ میں واپس نہ آؤں۔“

ناگن درگا نے مایوس لہجے میں کہا۔

”نہیں کرم دادا! تم مسلمان ہو۔ تم ہندو دیوی دیوتیوں اور بد روحوں کے شراب سے واقف نہیں ہو۔ ان کی بد دعائیں ان کے سامنے والوں کو ضرور لگتی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”لیکن تمہاری ماما کستی کی ذراؤنی بدروح نے یہ بھی تو کہا تھا کہ جب کرم دادا انسان کی شکل میں واپس آ جائے گا تو تمہیں چوہنے کے بعد تم بھی عورت کی شکل اختیار کر لو گی۔“

ناگن درگا بولی۔

”یہ اس نے ویسے ہی کہہ دیا تھا میں ماما کستی کی بدروح کو جانتی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب ہم دونوں میں سے کوئی بھی انسانی شکل میں واپس نہیں آ سکے گا۔“

میں نے بڑے پر احتیاط لہجے میں کہا۔

”اگر تم سمجھتی ہو کہ ایسا یہی ہو گا تو میں تمہیں اسے غلط کر کے دکھا دوں گا۔ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کا اپنے اللہ پر یقین کامل ہوتا ہے وہ اللہ کے سوا اور کسی کو انسانوں کی قسمت کا مالک نہیں سمجھتا۔ ہم یہاں سے بھوپال چلتے ہیں۔ میں اپنے دوست مکھنڈ منظر خالد سے بات کروں گا۔ ہم دونوں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیں گے۔“

ناگن درگا نے کہا۔

”جب تمہاری پیوی جیلہ کو معلوم ہو گا کہ تم اپنے ساتھ ایک ناگن کو بھی لائے ہو

”اگر ہمیں بھول جانا ہی ہے اور رات کے اندھیرے میں ہی یہاں سے نکلنا ہے تو پھر صبح کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی رات باقی ہے“ ابھی یہاں سے نکل جاتے ہیں۔“

ناگن درگاہے کھلا۔

”ابھی نکل چلے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”یہاں سے ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہو گا۔ میں تو ایک ٹرک پر سوار ہو کر آیا تھا۔“

ناگن درگاہ کی آواز میں اب کچھ اچھو سا آتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا اس نے اپنی بد نصیبی کو قبول کر لیا تھا۔ کہنے لگی۔

”یہاں سے ایک نزدیکی راستہ جنگل میں سے ہو کر ریلوے لائن تک جاتا ہے۔ وہاں سے اسٹیشن زیادہ دور نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے صبح ہوئے تک ہمیں کوئی گاڑی مل جائے جو نرمیگ پور کی طرف جا رہی ہو۔“

ناگن درگاہ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ایک نگاہ چاروں طرف جمو پڑی میں ڈالی اور

چارپائی سے اتر کر میرے ساتھ جنگل کی طرف چل پڑی۔ وہ میرے آگے آگے جا رہی تھی۔ چونکہ اب وہ سناپ کے روپ میں تھی اس لیے مجھے اس کے جسم کی بو بڑی

صاف صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اسی طرح اسے بھی میرے جسم کی بو صاف صاف محسوس ہو رہی ہوگی۔ ناگ اور ناگن ایک دوسرے سے چاہے کتنی دور کیوں نہ ہوں

وہ ایک دوسرے کی بو محسوس کر کے ایک دوسرے کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اسے ریلوے لائن تک پہنچنے کے آسمان راستے کا علم تھا۔ جنگل میں رات کی تاریکی بھائی

ہوئی تھی لیکن یہ تاریکی ہمارے راستے میں رکاوٹ نہیں بن رہی تھی۔ ہمیں سناپ یعنی ناگ اور ناگن ہونے کی وجہ سے درخت جھاڑیاں بالکل صاف نظر آ رہی تھیں۔

ناگن درگاہ بڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ ہم بڑی جلدی جنگل کو پار کر گئے۔ آگے

جو حقیقت میں ایک عورت ہے تو تم اسے کیا جواب دو گے؟“

میں نے کہا۔

”میں تمہیں اپنی بیوی سے نہیں ملاؤں گا۔ تم میرے ساتھ کمانڈو خالد کی خفیہ کمپن گاہ میں رہو گی ہم اسے تمہارے بارے میں بتائیں گے بھی نہیں۔“

ناگن درگاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے بھول کتنی دور ہے اور ہم وہاں کس طرح پہنچیں گے؟“

ناگن درگاہ کہنے لگی۔

”بھول یہاں سے کافی دور ہے۔ یہاں سے ہمیں دو بار گاڑیاں بدلنی ہوں گی۔ پہلے ہم نرمیگ پور جائیں گے۔ وہاں سے ساگر پہنچیں گے۔ ساگر کے اسٹیشن سے ہمیں

بھول جانے والی گاڑی ملے گی۔ یہ تو وہ سفر ہے جو انسان کرتے ہیں۔ ہم سناپ ہیں ہم انسانوں کی طرح نہ تو گاڑی میں بیٹھ سکیں گے۔ نہ گاڑیاں راستے میں بدل سکیں گے۔

میں نے اگر کافی زندگی ناگن کی شکل میں گزاری ہے لیکن میں نے یہ سارا وقت جنگلوں میں بسر کیا ہے۔“

میں نے کہا۔

”مجھے شہروں اور ریلوے اسٹیشنوں میں آنے جانے کا کافی تجربہ ہے۔ اگرچہ انسانوں کے درمیان جا کر ہمیں ہر وقت اپنی جان کی فکر رہے گی کیونکہ سناپ کو انسان اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہی اسے مارنے کو دوڑتے ہیں۔ لیکن ہم رات کے وقت

سفر کریں گے اور چھپ چھپ کر اسٹیشن پر پہنچیں گے اور ریل گاڑی کے ڈبے میں بیٹھنے کی بجائے ڈبے کی چھت پر لیٹ کر سفر کریں گے۔“

ناگن درگاہ نے آہ بھر کر کہا۔

”مثالیہ تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ جمو پڑی کے باہر جنگل میں اندھیرا تھا۔ اب ہم دونوں ہی اندھیرے میں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

میں نے اسے کہا۔

”میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

وہ بولی۔

”تمہارا میرے ساتھ جانا بے فائدہ ہے۔ میں ہندی زبان بھی پڑھ لیتی ہوں۔ یہاں ہندی زبان ہی چلتی ہے۔ اگر کسی جگہ ہندی میں گاڑیوں کے آنے جانے کا بورڈ لگا ہوگا تو میں اسے پڑھ سکتی ہوں۔ تم ہمیں چھپ کر بیٹھے رہو میں زیادہ دیر نہیں لگائوں گی۔“ وہ چلی گئی۔ میں سٹال کی لکڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ وہ مجھے اینٹوں کے پلٹ فارم کی دھندلی روشنی میں کچھ دور تک جاتی نظر آتی پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اسی جگہ بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے کئی دیر لگا دی۔ جب واپس آئی تو اس کے ساتھ ہی دور سے ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز بھی آئی۔ ناگن درگا کہنے لگی۔

”یہی گاڑی نرسنگ پور جا رہی ہے۔“

میں سٹال کی اوٹ سے نکل آیا۔ ناگن درگا نے کہا۔
”ہم اسی جگہ چھپ کر ریل گاڑی کا انتظار کریں گے۔“

ہم پلٹ فارم کے آخری سرے پر تھے یہاں سے پلٹ فارم کی ڈھلان اترتی تھی اور ہوٹل نام کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”یہاں تو انجن آکر رکے گا۔ ہمیں دوسری طرف ریلوے لائن پر جا کر مسافروں کے ڈبے کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کرنی ہوگی۔“

وہ بولی۔

”یہ مسافر ٹرین ہے۔ کئی لمبی ہوگی ہم ہمیں سے انجن کے ساتھ والے ڈبے پر چڑھ جائیں گے۔“

ٹرین پلٹ فارم میں داخل ہو گئی تھی اور پلٹ فارم پر اس کی دھمک ہمیں صاف محسوس ہو رہی تھی۔ انجن کی لائٹ روشن تھی۔ یہ روشنی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا

ایک کھلا میدان آ گیا جہاں اونچا گھاس تھا۔ ایک جگہ گزرنے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ ہم اس میں سے ہو کر گزرنے لگے۔ گھاس کا میدان کئی لمبا چوڑا تھا۔ کئی دیر اسے پار کرتے لگ گئی۔ جب باہر نکلے تو دور سے ریلوے سٹل کی سرخ جی دکھائی دی۔ ناگن درگا رک کر کہنے لگی۔

”یہ سٹل کی جی ریلوے لائن کی ہے۔ ہم اسی طرف جائیں گے۔“

تھوڑی دیر میں ہم ریلوے لائن پر تھے اور پنڈی کے ساتھ ساتھ شیل مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ٹرک پہل بھی آیا۔ کئی کشادہ نہر تھی۔ ہم پہل کے اوپر سے رینگتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ یہاں سے ہمیں دور سٹیشن کی روشنیاں جھلماقی نظر آئیں۔ ناگن درگا نے کہا۔

”یہ ہوٹل کا سٹیشن ہے۔ یہاں سے ہمیں نرسنگ پور جانے والی گاڑی مل سکتی ہے لیکن معلوم نہیں کس وقت ملے۔“

میں نے کہا۔

”یہ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ کون سی گاڑی نرسنگ پور جا رہی ہے؟ ہم تو کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے۔“

ناگن درگا میرے ساتھ ریل پر بیٹھی رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”تم فکر نہ کرو۔ یہ میں معلوم کر لوں گی۔“

ہم ریل کی پنڈی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سٹیشن کے پلٹ فارم پر آ گئے۔ پلٹ فارم رات کے وقت خالی خالی تھا۔ یہ معمولی سا سٹیشن تھا۔ قریب قریب کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ دور کسی گاڑی کی اکا دکا روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ پلٹ فارم کے شروع میں ہی ایک جانب کوئی سٹال تھا تو بند پڑا تھا۔ ہم سٹال کی اوٹ میں آ گئے۔ ناگن درگا کہنے لگی۔

”تم اسی جگہ ٹھہرو میں معلوم کر کے آتی ہوں کہ نرسنگ پور جانے والی گاڑی کس وقت آئے گی۔“

رہی تھی۔ پھر وہ ہمارے قریب سے گزر گئی اور تھوڑا آگے جا کر انجن رک گیا۔ ٹرین بھی رک گئی۔ ڈیوں میں روشنی تھی مگر تقریباً "سبھی مسافر سو رہے تھے۔ ناگن درگا نے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ہم پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر انجن کے ساتھ والے ڈبے کی چھت پر چڑھیں گے۔

میں اس کے پیچھے رہینگے لگا۔ ہم بڑی تیزی سے پلیٹ فارم پر سے گزر کر ٹرین کے نیچے ریل کی بنڈیوں میں آ گئے۔ یہاں سے ہم پٹنری کی دوسری طرف گئے اور ایک پینے پر سے ہو کر ڈبے کی عقبی دیوار پر سے رینگ کر ڈبے کی چھت پر آ گئے۔ میں نے ناگن درگا سے پوچھا۔

"ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ نرسنگ پور کا سٹیشن آگیا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں نرسنگ پور کے سٹیشن کو بھی پہچانتی ہوں۔ وہاں کئی بار جا چکی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد انجن نے سٹی بجائی اور ہلکے سے دھچکے کے ساتھ ٹرین چل پڑی۔



ٹرین باقی ساری رات اور دوسرا دن بھی چلتی رہی۔

شام کے وقت جا کر کہیں نرسنگ پور کا سٹیشن آیا۔ اس دوران ہم ڈبے کی چھت پر ہی کبھی بیٹھے اور کبھی لیٹے رہے۔ ہمیں کھانے پینے کی اتنی حاجت بھی نہیں تھی۔ جب ٹرین نرسنگ پور شہر کے قریب پہنچی تو ناگن درگا نے اس کی عمارتوں کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"کرم داتا نرسنگ پور کا شہر آگیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے اب یہاں سے ہمیں کوئی گاڑی پکڑنی ہوگی؟"

وہ کہنے لگی۔

"ساگر جانے والی گاڑی پکڑنی پڑے گی۔ نرسنگ پور کا سٹیشن بڑا سٹیشن ہے۔ یہاں سے بڑی جلدی معلوم ہو جائے گا کہ ساگر جانے والی گاڑی کون سی ہے۔"

نرسنگ پور کے سٹیشن پر ٹرین کھڑی ہوئی تو ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے رینگ کر ڈبے کی دوسری جانب یعنی جس طرف دوسرا ریلوے ٹریک تھا اتر گئے۔ ٹرین یہی تھی اور ہمارا ڈبہ انجن کے ساتھ والا ڈبہ تھا جو پلیٹ فارم کے سرے پر جا کر رکا تھا۔ یہاں اکا دکا مسافر ہی تھے۔ ہم دوسری طرف والے ریلوے ٹریک میں کچھ دور تک گئے۔ ناگن درگا اس سٹیشن کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ وہ

نے میری مشکل آسان کر دی۔ وہ ایک قلی سے پوچھ رہا تھا کہ ساگر جانے والی گاڑی کس پلیٹ فارم پر آئے گی۔ قلی نے کہا۔ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر آئے گی۔ اب ہمیں پلیٹ فارم نمبر ۲ پر جا کر کسی جگہ چھپ کر بیٹھنا ہوگا۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں یہ گاڑی کب آئے گی۔ ہو سکتا ہے ابھی آجائے۔

میں نے پوچھا۔

”یہ پلیٹ فارم نمبر ۲ کہاں پر ہے؟“

وہ بولی۔

”میرے ساتھ آؤ مجھے معلوم ہے۔“

ہم خلی ڈبے سے اتر گئے۔ ریل کی پٹریوں میں سے گزرتے ہوئے پلیٹ فارم نمبر ۲ کے سرے پر آ کر ایک کھڑی کے کنارے کے چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہ بڑی قیمت کی بات تھی کہ میری طرح ناگن درگا کا منہ پر اندھیرے میں آسانی سے نہیں اور اس کا رنگ بھی خاستری تھا۔ ہمیں خاص طور پر اندھیرے میں آسانی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہمیں وہاں سے نمبر دو پلیٹ فارم نظر آ رہا تھا۔ جب وہاں ایک گاڑی آ کر رکی تو ناگن درگا نے کہا۔

”یہی گاڑی ساگر کو جانے گی۔ ہمیں اس کی پچھلی طرف سے چھت پر چڑھنا ہوگا۔“

اگرچہ پلیٹ فارم پر کافی رویشیاں تھیں۔ یہ بڑے شر کا نشین تھا اس کے باوجود پلیٹ فارم کی ریلوے لائنوں میں کہیں کہیں اندھیرا تھا اور ہم اس اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ادھر ادھر سے ریلک کر نمبر دو پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین کے نیچے آ گئے۔ یہ ٹرین کا پچھلا ڈبہ تھا۔ ہم اس کی دیوار پر سے ہو کر چھت پر چڑھ کر لیٹ گئے۔ بیٹھے سے ہم اوپر پل پر سے گزرنے والے مسافروں کو نظر آ سکتے تھے۔ میں نے ناگن درگا سے کہا۔

”کہیں یہ گاڑی کسی دوسرے شر کو تو نہیں جا رہی؟“

اوپر سے ہو کر دوسرے پلیٹ فارم کے عقب میں آ گئی۔ یہاں اندھیرا تھا اور ایک خلی ڈبہ لائن پر کھڑا تھا۔ ناگن نے مجھے کہا۔

”کرم دوا! تم اس خلی ڈبے میں بیٹھو میں ساگر جانے والی گاڑی کا پتہ کر کے آتی ہوں۔“

وہ چلی گئی۔ میں خلی ڈبے میں آ کر سیٹ کے نیچے چھپنے کی بجائے سیٹ کی کھڑکی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں باہر کا نظارہ دیکھ سکتا تھا۔ میرے سامنے ریلوے لائن تھی۔ اس کے آگے پلیٹ فارم تھا جو بالکل خالی تھا۔ اس کے آگے پھر ایک ریلوے لائن تھی اور آگے ایک اور پلیٹ فارم تھا جس پر ہماری گاڑی آ کر رکی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ ناگن درگا واپس نہ آئی۔ میں بھی فکر مند ہو گیا کہیں اسے کسی نے پھل کر مار نہ ڈالا ہو۔ کہیں وہ کسی شیش کرتے انجن یا ڈبے کے نیچے نہ آ گئی ہو۔ میرے دل میں طرح طرح کے دوسرے پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے فضا میں سو گھٹا ناگن درگا کی بو ایک جلیب سے برابر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ریلوے سٹیشن کی حدود میں ہی ہے۔ اس بو سے میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ناگن درگا زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ کیونکہ منہ پر جب مر جاتا ہے تو اس کے جسم سے اس وقت تک تیز بو نکلتی رہتی ہے جب تک کہ اس کا جسم بالکل مٹی نہیں بن جاتا۔ آخر مجھے اس کی بو تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ میری طرف آ رہی تھی۔ بو تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں نے اسے سامنے والے خلی پلیٹ فارم پر تیزی سے رینگتے اور نیچے لائنوں میں اترتے دیکھ لیا۔

کچھ دیر بعد وہ میرے ڈبے میں پہنچی۔ میں نے کہا۔

”تم نے بہت دیر لگا دی۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“

وہ کہنے لگی۔

”جس پلیٹ فارم پر گاڑیوں کے آنے جانے کا کھسا ہوا تھا وہاں کافی لوگ تھے۔

میں انتظار کرتی رہی کہ لوگ وہاں سے نہیں تو میں جا کر بورڈ پر دھوں۔ آخر ایک مسافر

وایں چھت پر چلے جائیں گے۔“

ہم سیٹ کے نیچے گھس کر بڑے آرام سے بیٹھ گئے۔ وہاں تو ایک ہلکا اندھیرا تھا دوسرے کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ٹرین پوری رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس علاقے میں سڑکیوں کا موسم نہیں تھا لیکن اتنی گرمی بھی نہیں تھی جس کی وجہ سے ڈبہ انکرنڈیشنٹ نہیں تھا۔ یا انکرنڈیشننگ ان دونوں نے بند کر دی تھی۔ دونوں نوجوان تھے اور میاں بیوی لگتے ہیں۔ یہ دو سیٹوں والا کونپے تھا۔ دونوں سیٹوں کے درمیان دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر عورت کا سنگھار بکس، قہر مس اور شیشے کے دو گلاس اور ایک کپ پڑا تھا۔ سامنے والی سیٹ کے نیچے ایک چڑے کا بڑا اور ایک چھوٹا سوٹ کیس بھی نظر آ رہا تھا۔ چھت پر کھڑی ہوئی بارش شور مچا رہی تھی۔ کوئی شیشہ آیا۔ ٹرین پوری رفتار کے ساتھ ہنسیوں کو جھنجھٹاتی ہوئی وہاں رکے بغیر گزر گئی۔ بہت دیر تک ٹرین تیز رفتاری سے چلتی رہی۔ پھر اس کی رفتار کم ہونے لگی۔ میں نے ناگن سے سرگوشی کی۔

”میرا خیال ہے کوئی شیشہ آ رہا ہے۔“

وہ بولی۔

”ہاں مگر یہ بھوپال نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے بھوپال کا شیشہ کل دوپہر کے وقت کہیں جا کر آئے گا۔“

یہ کوئی اہم شیشہ تھا۔ ٹرین آہستہ ہو گئی اور پھر رک گئی۔ رکنے سے ٹرین کو ہلکا سا دھچکا لگا تو نوجوان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ہم اس نوجوان کی سیٹ کے نیچے تھے۔ ہمیں سیٹ کے چڑھانے کی آواز آئی۔ پھر اس کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ سیٹ پر سے اٹھ کر دوسری سیٹ پر سوئی ہوئی عورت کے پاس گیا اور کندھے کو ہلا کر بولا۔

”بھلا! بھلا۔“

نوجوان عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کہا۔

”یہ بھوپال ہی کو جا رہی ہے۔ مجھے پورا وشواس ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔

سارے بھوپال بہت دور ہے۔ رات بھر ٹرین سفر کرتی رہی۔ راستے میں شیشہ آئے۔ کسی شیشہ پر ٹرین ٹھہرتی اور پھر چل پڑتی۔ رات کے پچھلے پیر بارش شروع ہو گئی۔ ہم بارش میں بھینکنے لگے تو ناگن درگاہ لگا۔

”شاید یہ گاڑ کا ڈبہ ہے۔ میں نیچے اتر کر دیکھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس ڈبے میں ہمیں بارش سے بچنے کے لیے کوئی چکر مل جائے۔“

میں نے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ آتا ہوں۔“

”تو پھر میرے پیچھے پیچھے آنا۔“

یہ کہہ کر ناگن درگاہ ڈبے کی کھڑکی کی طرف نیچے چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے اپنا سٹاپ والا سر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگا کر اندر دیکھا۔ ڈبے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے سراپا کر لیا اور کہنے لگی۔

”یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ لگتا ہے۔ اندر ایک عورت سیٹ پر سو رہی ہے۔ دوسری سیٹ پر کوئی مرد سو رہا ہے۔ ڈبے میں صرف دونوں ہی ہیں۔“

بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”یہ کھڑکی بند ہے تو دوسری کھڑکی دیکھتے ہیں۔“

ہم ڈبے کے باہر رینگ رہے تھے۔ دوسری کھڑکی کھلی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ یہ بڑا آرام دہ فرسٹ کلاس کیمپارٹمنٹ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ عورت اور مرد الگ الگ سیٹوں پر سو رہے تھے۔ عورت نے سفید چادر اوپر کی ہوئی تھی۔ میں نے ناگن درگاہ کو سرگوشی میں کہا۔

”مرد والی سیٹ کے نیچے گھس جاتے ہیں۔ جب بارش ختم جائے گی تو موقع پا کر

کھڑی کے پیشے کو دیکھ رہا تھا جس میں کپار ٹمنٹ کی روشنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ میں اپنے انسانی ذہن سے سوچ رہا تھا کہ بھوپال ہم دن کی روشنی میں پہنچیں گے۔ مجھے اور ناگن درگا کو کسی جگہ چھپ کر رات ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ تاکہ رات کے اندھیرے میں میں اسے لے کر مکائنڈو خلد کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچوں۔ دن کی روشنی میں ہمیں لوگوں سے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ میں اپنی سوچ میں غم تھا کہ مجھے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے باہر کی طرف سے دروازے کو زور سے اندر کی طرف کھول کر دھکیلا ہو۔ گاڑی کے پیوں کے شور میں یہ آواز صاف سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مرد کی کرخت آواز آئی۔

”آ جاؤ دھنیا“ آ جاؤ۔ سالے سو رہے ہیں۔“

ناگن درگانے سر اٹھالیا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”کوئی ڈاکو گتے ہیں۔“

ہمیں سیٹ کے نیچے سے دو آدمیوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ ان کی آواز سے

نوجوان راکیش اٹھ بیٹھا۔

”کون ہو تم؟“

اس نے رعب سے پوچھا۔

اس کی آواز پر بلا بھی اٹھ بیٹھی اور بھرا کر پولی۔

”کون ہو؟“

اتنی دیر میں دونوں ڈاکو ان کے سروں پر پہنچ گئے تھے۔ میں اور درگا تیزی سے ریک کر سیٹ کے آخری کنارے پر آ گئے جہاں سے اپنے سر نکل کر ڈبے کا جائزہ لیا۔ دونوں ڈاکو دیمائی لباس میں تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپا رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں دو ٹلی بندوقیں تھیں۔ ایک نے بندوق بلا کے سر کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ دوسرے نے نوجوان لڑکے کی گردن سے بندوق لگائی تھی۔

”نہیچر کھینچنے کی کوشش کی تو بمون کر رکھ دوں گا۔ زیور پیسہ جو کچھ بھی ہے نکل

”راکیش جی! کون سا شیٹن ہے؟“

راکیش نے باہر بھاگتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے لائن کی مرمت ہو رہی ہے یہ کوئی شیٹن نہیں ہے۔“

بلا نے کہا۔

”پانی دینا تھوڑا۔“

اور وہ پاؤں کو درست کرنے لگی، نوجوان اور خوبصورت عورت تھی۔ اس نے شب خوابی کا ریشمی گلڈن پہنا ہوا تھا۔ لڑکا بھی شب خوابی کے لباس میں تھا۔ دونوں کسی پردے لکھے اچھے گھرانے کے لگتے تھے۔ راکیش نے حرمس میں سے پانی گلاس میں ڈال کر بلا کو دیا۔ میں اور ناگن درگا سیٹ کے نیچے چھپے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ ڈبے کی چیمٹ پر بارش کی ٹپ ٹپ جاری تھی مگر موسلا دھار بارش نہیں تھی۔ انجی کے دسل کی آواز آئی اور ٹرین چل پڑی۔ نوجوان کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا۔

”دربائے زبدا کا جنگل لگتا ہے۔“

اس نے کھڑکی بند کر دی اور بیلا بے کلمہ۔

”تم آرام کرو“ میں بھی سو جاتا ہوں۔ بھوپال ابھی بہت دور ہے۔“

اس کے اس جملے سے میری وحاس بندھی اور خوشی بھی ہوئی کہ ہم غلط ٹرین میں نہیں بیٹھ گئے۔ یہ ٹرین بھوپال ہی جا رہی تھی مگر ابھی تک مجھے اپنی بیوی بھیلہ اور مکائنڈو خلد میں سے کسی کی بو نہیں آئی تھی۔ شاید ہم ابھی بھوپال سے کلنی دور تھے۔ باہر سے سوائے ٹرین کے چلتے پیوں کی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ٹرین کسی دیران جنگل میں سے گزر رہی تھی۔

نوجوان راکیش بھی اپنی سیٹ پر آ کر لیٹ گیا۔ لڑکی بلا نے بھی چادر اوپر کر کے پہلو بدل لیا تھا۔ ابھی ٹرین نے پوری رفتار نہیں پکڑی تھی۔ ناگن درگا میرے پاس ہی اپنا سر کنڈل میں چھپائے بیٹھی تھی۔ میں نے سر ذرا سا اٹھا رکھا تھا اور سامنے والی

دہشت زدہ نوجوان نے عاجزی سے کہا۔

”اصلی ہیں۔ ہم کو معاف کر دو۔ یہ زیور میری ماما جی کے ہیں۔“

ڈاکو نے اسے گھلی دی اور بولا۔

”ہم معاف نہیں کیا کرتے۔ تیرے بھاگ اچھے ہیں کہ زیور نکل آیا۔ نہیں تو

تیری لونیڈا کو اٹھا کر لے جاتے۔“

دونوں ڈاکو سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جہاں بے چاری لڑکی بلا سٹ کر بیٹھی

خوف کے مارے کلپ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ناگن درگا کسی طرح دوسری سیٹ

کے نیچے پہنچ چکی تھی۔ وہ تیزی سے رینگتی ہوئی ایک ڈاکو کی ٹانگ کے پاس آئی اور

اس نے لپک کر اس کے پنڈلی پر ڈس دیا۔ ناگن درگا کا زہر مجھ سے زیادہ ہلاکت خیز

ثابت ہوا۔ ڈاکو آگے کو لڑھک کر گر گیا۔ دوسرے ڈاکو نے بدوقت ایک طرف رکھ کر

گھبراہٹ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کی تو اس دوران ناگن درگانے دوسرے ڈاکو کو

بھی ڈس دیا۔ وہ بھی پہلے ڈاکو کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر لڑکی ہلا اور لڑکا

رائیش کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ گاڑی شور مچاتی بھاگی جا رہی تھی۔

لڑکے نے اپنے حواس کو ٹھیک کیا اور ہلا سے کہا۔

”ان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔“

ہلا رونے لگی۔

”ہے رام! ہے رام!“

لڑکے نے کہا۔

”رام نے تو ہماری سائینا کر دی ہے ہلا۔ کسی طرح میرے ہاتھ پاؤں کھول دو میں

زنجیر کھینچوں گا۔“

ہلا بولی۔

”میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں کیا کروں؟“

رائیش بولا۔

کر رکھ دو۔ ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔“

لڑکی بے چاری خوف کے مارے کلپ رہی تھی۔ اس کے خلود کا بھی برا حال ہو

رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑائی زبان میں کہا۔

”سنگھار بکس میں زیور پڑا ہے۔ لے جاؤ۔ ہمیں کچھ نہ کو۔“

ایک ڈاکو نے دوسرے سے کہا۔

”ارے دھیلا! دیکھ بے کسے میں زیور سونا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“

دوسرے ڈاکو نے سنگھار بکس کو پکڑ کر الٹ دیا۔ اندر سے سونے کے کچھ

زیورات نکلے۔

”ارے کیسہ رام بڑا زیور ہے۔“

اور وہ سونے کے زیوروں کو اپنی صدر کی جیب میں ٹھونسنے لگا۔ دوسرے ڈاکو

نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا اور بولا۔

”بندھیلا کا شیٹن آ رہا ہے۔“

پہلا ڈاکو بولا۔

”گاڑی ہولے ہوگی تو کوہد جائیں گے۔“

انہوں نے جیب سے رہی نکل کر لڑکے اور لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھے اور بیٹھ کر

باتیں کرنے لگے۔ میں نے ناگن درگا کے سر کے قریب منہ لے کر سرگوشی میں کہا۔

”میں چھوڑنا نہیں چاہیے۔“

ناگن درگانے ہلکی سی پشیمار کی آواز کے ساتھ سرگوشی میں کہا۔

”یہ خوفی لوگ ہیں۔ میں ادھر والے کو پکارتی ہوں۔“

چلتی گاڑی کے شور میں ہماری آوازیں سننا ناممکن تھا۔ دونوں ڈاکو اب بیڑیاں پی

رہے تھے اور زیوروں کو نکال کر دیکھ رہے تھے۔ ایک نے ہلا اور اس کے خلود کی

طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اے سادو! یہ نقلی تو نہیں ہیں؟“

ہمارے ساتھ ریلوے پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔ آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“
جب نوجوان نے انہیں بتایا کہ بلا مدھیہ پردیش کے کسی وزیر گردشاری لال کی
بھانجی ہے تو تینوں سنتریوں کے لیے بدل گئے۔ پہلے والا سنتری بولا۔
”آپ چنانہ کریں جی۔ ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔ یہ دونوں تو بڑے خوبی ڈاکو
تھے۔ اچھا ہوا کہ دل کا دورہ پڑا اور مر گئے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“
نوجوان لڑکے نے کہا۔

”بھوپال جا رہے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ سنتری بولا۔ ”آپ کو ہم تکلیف نہیں دے سکتے۔ ضرورت
پڑی تو آپ کے پاس خود بھوپال پہنچ جائیں گے۔ اپنا پتہ نوٹ کروادیں۔“
نوجوان نے انہیں اپنا بھوپال کا پتہ لکھوا دیا۔ تینوں سنتری لاشوں کے پاس بیٹھ
گئے۔ گاڑی باہر نکل گیا۔ گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ناگن درگا ابھی تک سامنے والی
سیٹ کے نیچے ہی تھی۔ میں اسے ایک طرف چھپ کر بیٹھ دیکھ رہا تھا۔ گاڑی کے شور
میں سنتری نوجوان راکش سے اس علاقے کے ڈاکوؤں کے بارے میں اونچی آواز میں
باتیں کر رہے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ٹرین دولت آباد کے سٹیشن پر ٹھہر گئی۔ اس
وقت ایک سنتری ڈبے سے اتر کر عیاں اور اپنے ساتھ دو اور سنتری لے آیا۔ انہوں نے
مل کر دونوں ڈاکوؤں کی لاشوں کو تھپتھپ کر ڈبے سے باہر ڈال دیا۔ ایک سنتری گاڑی
کے ساتھ ڈبے میں آیا۔ گاڑی نے کہا۔

”آپ کے زیور وغیرہ تو محفوظ ہیں ناں سہرا“

اس دوران نوجوان لڑکے نے سارے زیور ڈاکو کی جیب سے نکال کر سنگھار بکس
میں منبھال لیے تھے۔ اس نے کہا۔

”جی ہاں! سارے زیورے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔“

گاڑی نے ایک پرچہ نوجوان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

”پلیز! میبل دستخط کر دیں کہ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ باقی کام ریلوے پولیس

”کوئی بات نہیں۔ کوئی سٹیشن آ رہا ہے۔ شاید گاڑی کھڑی ہو جائے۔ پھر شور مچا
کر گاڑی کو بلائیں گے۔“

ناگن درگا ابھی تک سامنے والی سیٹ کے نیچے ہی تھی۔ دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں
ایک دوسری کے اوپر درمیان میں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ ہندو قیں پاس ہی گری ہوئی
تھیں۔ ٹرین کی پیٹ کیم ہونے لگی۔ پھر ٹرین رک گئی۔ یہ فرسٹ کلاس کا کوپے تھا۔
کوئی اس طرف نہ آیا۔ سٹیشن بھی غیر اہم تھا۔ باہر سے مسافروں کی آواز بھی نہیں آ
رہی تھی۔ لڑکے نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ بار بار گاڑی کو آواز دیتا تھا۔ پھر اس نے
اپنا کندھا کھڑکی کے شیشے پر ٹکراتا شروع کر دیا۔ لیکن شیشہ نہ ٹوٹ سکا۔ اتنے میں پلیٹ
فارم کی چاب سے کسی نے شیشے میں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ نوجوان لڑکے نے زور
زور سے پکارنا شروع کیا۔ اس کے بعد ایک گاڑی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

”مانی! کیا ہوا سر؟“

لڑکے راکش نے جلدی جلدی گاڑی کو بتایا کہ دو ڈاکو اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے
ہندو قیں دکھا کر ہمارے زیور لوٹے۔ پھر انہیں دل کا دورہ پڑا اور مر گئے۔ گاڑی نے
جلدی سے دونوں کی رسیاں کھولیں اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”سر! میں پولیس کو بلاتا ہوں۔ لاشوں کو ہاتھ نہ لگائیں۔ میں پولیس کو بلاتا
ہوں۔“

پولیس شاید ٹرین کے ساتھ ہی تھی۔ گاڑی فوراً ”پولیس کے تین سپاہیوں کو لے کر
آ گیا۔ انہوں نے لاشوں کو دیکھا۔ ایک سپاہی نے پوچھا۔

”انہیں کس نے مارا ہے؟“

لڑکے نے کہا۔

”یہ تو ہمیں مارنے آئے تھے۔ ہم انہیں کیسے مار سکتے تھے؟“

دوسرے سنتری نے کہا۔

”لاشیں اسی جگہ رہیں گی، آگے دولت آباد کا سٹیشن آ رہا ہے۔ وہاں آپ لوگوں کو

خود کرے گی۔"

نوجوان راکیش نے کلنڈ کو ہاتھ میں لے کر پڑھا اور پھر اس پر دستخط کر کے گاڑ کو واپس کر دیا۔ ہم اس سارے ڈرامے کو بڑے سکون کے ساتھ اپنی اپنی طرف سیٹ کے نیچے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ شیشن ماسٹر بھی ڈبے میں ایک ٹی ٹی کے ساتھ آیا۔ نوجوان راکیش سے کچھ باتیں پوچھیں اور انہیں تسلی دے کر اور ایک کلنڈ پر دستخط کروا کر چلا گیا۔ خدا خدا کر کے یہ کاروائی ختم ہو گئی۔ گاڑ نے سٹی بجائی۔ انجن نے دسل دیا اور ٹرین دولت آباد کے شیشن سے چل پڑی۔

نوجوان لڑکا اپنی بیوی کی سیٹ پر آ گیا تھا اور اس کو تسلیاں دے رہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بنگلوان کی بڑی کہانی کہ ہم ڈاکوؤں سے بچ گئے۔ لڑکی ابھی تک دہشت زدہ تھی۔ ناگن درگا ساننے والی سیٹ سے نکل کر میرے پاس آ گئی تھی۔ گاڑی کے شور میں ہم ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں تھوڑی تھوڑی بات کر لیتے تھے۔ شیشن آتے رہے، گزرتے رہے۔ دن نکل آیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا ریلوے شیشن آیا۔ وہاں گاڑی دیر تک کھڑی رہی۔ لڑکے نے ناشتہ بنگوا لیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ناشتہ کرتے رہے۔ ہم سیٹ کے نیچے خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں سے گاڑی چلی تو بنگلوں، دریاؤں، میدانوں میں سے گزرتی چلی گئی۔ کافی دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ اس نے تین چار چھوٹے چھوٹے شیشن بھی چھوڑے۔ میں نے ناگن درگا سے پوچھا۔

"تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ بھوپال یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں بھوپال پہنچنے والے ہیں۔"

آخر بھوپال آ گیا۔

ٹرین زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ پلیٹ فارم میں داخل ہونے کے بعد رک گئی۔ نوجوان جوڑا ڈبے سے اتر گیا۔ ناگن درگا نے کہا۔

"یہاں گاڑی کافی دیر رکتی ہے۔ ذرا لوگوں کا رش کم ہوگا تو ہم پچھلی طرف سے

ہو کر شیشن سے باہر نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے نفا کو سونگھا تو مجھے سب سے پہلے اپنی بیوی جیلہ کی خوشبو آئی۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں جیلہ کے پاس بیٹھا ہوں۔ میں نے بے اختیار ہو کر ناگن درگا سے کہا۔

"درگا! مجھے اپنی بیوی جیلہ کی خوشبو آ رہی ہے۔"

ناگن درگا نے آہستہ سے کہا۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کرم دادا"

اس کے بعد ناگن درگا نے کوئی بات نہ کی۔ جب باہر پلیٹ فارم پر لوگوں کا شور ذرا کم ہوا تو وہ بولی۔

"ہم ریل کی لائن کی طرف سے باہر نکلیں گے۔"

ہم سیٹ کے نیچے سے نکل آئے۔ ڈبہ خالی تھا۔ ایک طرف پلیٹ فارم تھا دوسری طرف ریل کی پنڑی تھی اور لوہے کے جھنگے کی دیوار تھی۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہم ڈبے کی دیوار کے ساتھ لگ کر نیچے گاڑی کے پینے پر سے ہوتے ہوئے ریلوے ٹریک پر آ گئے اور ریل کی پنڑی کے بالکل ساتھ لگ کر پیچھے کی طرف تیزی سے رینگنے لگے۔ ناگن درگا مجھ سے زیادہ اس شہر سے واقف تھی۔ وہ میرے آگے آگے بڑی تیز تیز جا رہی تھی۔ ایک جگہ پر آ کر ساننے والے پلیٹ فارم کی دیوار ختم ہو گئی۔ ہم پنڑی چھوڑ کر اس طرف رینگنے لگے جہاں ریلوے شیشن کا یارڈ تھا اور لائنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف سے انجن کے شنفٹ کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر ناگن درگا سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کس طرف جا رہی ہو؟"

اس نے تیزی سے رینگتے ہوئے کہا۔

"تم میرے پیچھے پیچھے آتے جاؤ۔"

بھوپال کا ریلوے یارڈ کافی بڑا تھا۔ ہمیں اس کو پار کرتے کافی وقت لگ گیا۔ اس

وہ بولی۔

”تمہیں اپنی بیوی کی خوشبو آ رہی ہے نا؟“

میں نے فوراً ”جھوٹ بول دیا اور کہا۔

”پہلے آتی تھی اب بالکل نہیں آتی مگر میں کوشش کر کے اس مکان تک پہنچ سکتا ہوں۔“

ناگن درگا بولی۔

”اس طرح تو ہم کسی نہ کسی جگہ پھنس جائیں گے۔“

میں نے فوراً کہا۔

”پھر ایسا کرتے ہیں کہ تم کسی جگہ بیٹھ کر کچھ دیر میرا انتظار کرو میں اکیلا اپنی بیوی کے مکان پر جاتا ہوں۔ اگر وہ وہاں مجھے مل گئی تو میں تمہیں بھی آکر لے جاؤں گا۔ اگر راستے میں لوگوں نے مجھے دیکھ کر مار ڈالنے کی کوشش کی تو میں اکیلا کسی نہ کسی طرف نکل کر اپنی جان بچاؤں گا۔ تم بھی میرے ساتھ ہو نہیں تو ہمیں اپنی اپنی جان کے ساتھ ایک دوسرے کی فکر بھی پڑ جائے گی۔“

ناگن درگا بھی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھی۔ میرے بغیر وہ اپنی عورت کی انسانی شکل میں واپس نہیں آ سکتی تھی۔ کتنے گلی۔

”ٹھیک ہے کرم دلو! آگے پل کے پار بھیروں جی کا مندر ہے۔ میں وہاں تالاب کے پیچھے جھاڑیوں میں تمہارا انتظار کروں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔“

ہم اوپر کی طرف جانے کی بجائے ریلوے پل کے نیچے سے ہو کر سڑک کی دوسری طرف آگئے۔ سڑک پر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ ہم جلدی سے سڑک پار کر گئے۔ اب ہم ایک چھوٹے سے میدان میں آگے ہوئی جھاڑیوں اور گھاس میں سے گزر رہے تھے۔ ناگن درگا نے مجھے دور سے درختوں کے درمیان ایک مندر کا ٹکونی دیکھا۔ کہنے لگی۔

”وہ بھیروں جی کا مندر ہے۔ اس کے پیچھے ایک تالاب ہے۔ میں تمہیں وہیں

اس دوران ایک اور ٹرین دلی کی طرف سے آئی اور سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ ہم سٹیل کین کے پاس آگئے۔ یہاں دو تین جھاڑیاں تھیں۔ ناگن درگا ایک جھاڑی میں گھس گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے جھاڑی میں آگیا۔ وہ کہنے لگی۔

”سامنے مال گودام کی دیوار ہے۔ ہم اس دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف جائیں گے۔ اس طرف زیادہ لوگ نہیں ہوتے۔ دوسری طرف ایک گندا ٹالہ بستا ہے۔ ہم ٹالے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں گے۔“

یہ کہہ کر ناگن درگا جھاڑی سے نکلی اور تیزی کے ساتھ مال گودام کی دیوار پر چڑھ گئی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ دیوار کی دوسری طرف گندا ٹالہ بستا تھا۔ ہم نیچے اتر کر اس کے کنارے سے ذرا نیچے ہو کر آگے کو چل پڑے۔ آگے ٹالے کے دوپل آئے۔ ایک جگہ ٹالہ پائیں جھبڑا تھا۔ ناگن درگا وہاں سے باہر نکل آئی۔ سامنے ریلوے پل تھا۔ ناگن درگا کہنے لگی۔

”اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں جانا ہے اور تمہاری بیوی بھوپال کے کس محلے میں رہتی ہے۔“

تب مجھے خیال آیا کہ مجھے ناگن درگا کو کمائڈو منظر خالد کے خفیہ ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے۔ وہ بھوپال کے سرخوش محللوں کی خفیہ کمین گاہ ہے جو بھارت میں مسلمانوں کے جائز حقوق کے لیے ہندو حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اور بھوپال کی پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کل کو ناگن درگا انسانی شکل میں آگئی اور میں اس سے الگ ہو گیا تو ممکن ہے وہ کسی کو اس خفیہ ٹھکانے کے بارے میں بتا دے اور پولیس چھاپے مار کر بھوپال کے ان گناہ محللوں کو گرفتار کر لے۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اسے کسی جگہ پر بیٹھنے کو کہہ کر اکیلا ہی کمائڈو خالد کے ٹھکانے پر جاتا ہوں۔ مجھے سٹیشن سے اس ٹیلے تک کا راستہ معلوم تھا جس کے دامن میں کمائڈو خالد کی خفیہ کمین گاہ تھی۔ میں نے یہ سوچنے کے بعد ناگن درگا سے کہا۔

”مجھے جگہ پوری طرح سے یاد نہیں ہے۔“

اور کچھ نہ سوجھا میں تبوت کے اندر داخل ہو گیا۔ تبوت میں کسی کی لاش پڑی تھی۔
مجھے اپنی جان کی پڑی تھی۔ لاش مجھے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں
تیزی سے لاش کے نیچے گھس گیا۔ باہر لوگ کھڑے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے
کہ سانپ اسی طرف گیا تھا۔ وہ ضرور وہیں میں گھس گیا ہے۔ اتنے میں مجھے وہیں کا
دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کسی نے کہا۔

”جناب وہیں میں ابھی ابھی ایک سانپ گھس گیا ہے۔“

کسی دوسرے شخص نے جواب دیا۔

”وہیں چاروں طرف سے بند ہوتی ہے۔ اس کے اندر سانپ کہاں سے آئے گا۔“

جاؤ دوسری جگہ اسے تلاش کرو۔“

مجھے اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد وہیں میں دو تین آدمیوں کے چڑھنے اور باتیں
کرنے کی آوازیں آئیں۔ میں لاش کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ
لوگ لاش کے تبوت کو ہسپتال سے مرنے والے کے گھر لے جا رہے ہیں۔ میں راستے
میں یا مرحوم کے گھر پہنچ کر موقع پاتے ہی تبوت سے نکل کر فرار ہو جاؤں گا۔

مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ قدرت میرے ساتھ کس قدر عجیب و غریب کھیل کھیلنے
والی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے تبوت کا ڈھکنا بند کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہتھوڑی
سے کیل ٹھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا گیا۔ اگر تبوت کو کیل ٹھونک کر بند
کر دیا گیا تو میں تبوت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جب تک کہ وہ قبر کے اندر لاش
کے ساتھ گل سڑ کر مٹی نہیں ہو جاتا۔ میں لکڑی کی دیوار میں سوراخ کر کے باہر نہیں
نکل سکتا تھا۔ میں گھبرا کر لاش کے نیچے سے نکل آیا۔ تبوت پر ڈھکنا چڑھا ہوا تھا اور
تبوت میں ہتھوڑی کی ضربوں سے دھک پیدا ہو رہی تھی۔

یقین کریں اس وقت ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔
میں ایک ایسے ڈبے میں ایک مڑے کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا جس سے میرا فرار ہونا
ناممکن تھا۔ تبوت بند کرنے کے بعد آدمی باہر نکل گئے۔ ایبولینس کا دروازہ بند ہو گیا

جماڑیوں میں ملوں گی۔ ویسے بھی میری خوشبو تمہیں مجھ تک پہنچا دے گی مگر زیادہ دیر
نہ لگتا۔“

میں نے کہا۔

”نکر نہ کرو۔ میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔“

اس کے بعد ناگن درگامندر کی طرف چل دی اور میں وہاں سے نکل کر ایک
بڑی سڑک کی طرف چل دیا جس کو میں پہچانتا تھا۔ اس سڑک کے دوسرے چوک سے
مجھے ایک نشیب میں اتر جانا تھا۔ جہاں سے وہ ٹیلا صاف دکھائی دیتا تھا جس کے اندر
مجاہدوں کی خفیہ کیمپ گاہ تھی۔ مجھے کمانڈو خالد کی بو بھی اسی طرف سے آرہی تھی۔
مجھے یہ بھی تسلی تھی کہ اگر میں راستہ بھول گیا تو کمانڈو خالد کی بو میری راہ نمائی کرے
گی۔ میں میدان میں ایک طرف کو چل پڑا۔ آگے لڑکے گیند بلا کھیل رہے تھے۔ میں
”فورا“ دوسری طرف ہو گیا۔ بد قسمتی سے ایک لڑکے کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ یہ بارہ بارہ
چودہ چودہ سال کے لڑکے تھے۔ انہوں نے سانپ سانپ کا شور مچا دیا اور مجھے مارنے
کے لیے میری طرف دوڑے۔ میں نے اپنی سپیڈ تیز کر دی۔ ایک بار رک کر پھینکا مار
کر انہیں ڈرایا۔ لڑکے جلدی سے پیچھے کی طرف بھاگے۔ جب میں آگے کو دوڑا تو
دوبارہ شور مچاتے میرے پیچھے لگ گئے۔

ان کا سانپ سانپ کا شور سن کر ادھر ادھر سے کچھ اور لوگ بھی آ گئے اور وہ بھی
مجھ پر پتھر پھینکنے لگے۔ میرے ارد گرد پتھر گر رہے تھے۔ موت کا سخت خطرہ تھا۔ میں
گھبرا کر اس طرف نکل گیا جہاں سڑک تھی۔ لوگ مجھ پر پتھر انہیں پھینکتے برابر میرے
پیچھے آرہے تھے۔ سامنے ایک سفید رنگ کی دیوار تھی جس پر صلیب کا سرخ
نشان بنا ہوا تھا۔ یہ ایبولینس کی گاڑی تھی۔ میں جلدی سے اس گاڑی کے نیچے گھس
گیا اور اس کے پیچھے کے اوپر سے گزر کر ایبولینس کی اگلی چھوٹی سی کھڑکی میں سے
وہیں کے اندر آ گیا۔ وہیں میں اندھیرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہیں میں ایک تبوت پڑا
تھا جس کا ڈھکنا ایک طرف سے ہٹا ہوا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اپنی جان بچانی تھی مجھے

ہوا تھا۔ کانوں میں سفید موتیوں کے بندے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید اس انگریز لڑکی کا بیاہ ہو رہا تھا کہ دل کا دورہ پڑنے سے مر گئی اور اسے دلوں والے لباس میں ہی دفنایا جا رہا تھا۔ میں اس کے سینے سے اتر کر اس کے پہلو میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ قسمت نے میرے ساتھ جو مذاق کیا ہے اس کا کیا انجام ہوگا۔ لاش پر ڈالی گئی تیز دواؤں کے اثر سے مجھ پر غنودگی یا بے ہوشی سی طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میں تابوت سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے ہوش و حواس جواب دیتے گئے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا۔ کتنا وقت گزر گیا میں تو تابوت میں لاش کے ساتھ لاش کی طرح بند تھا۔ ہوش آیا تو انجن کے پٹلے کی آواز آرہی تھی۔ پہلے میں نے یہی خیال کیا کہ یہ ایسپرینس کی گاڑی کے انجن کی آواز ہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ آواز موٹر کے انجن کی آواز سے مختلف ہے۔ میں نے غور کیا تو یہ آواز ہلکی ہلکی گونج کی طرح تھی جس میں کسی وقت بھی کسی سی آواز بھی آتی تھی اور تابوت کسی وقت اوپر نیچے بھی ہو جاتا تھا اور اسے ہلکے ہلکے جھٹکے بھی لگتے تھے۔ اچانک ایک خیال آیا اور میرے روکنے کوڑے ہو گئے۔ کہیں میں کسی ہوائی جہاز میں تو نہیں ہوں؟ میرے خدا! اگر میں کسی ہوائی جہاز میں ہوں تو خدا جانے یہ جہاز مجھے کہاں کس شہر میں پہنچا دے گا۔ تابوت کے دائیں بائیں ڈولنے اور ہلکی ہلکی تھر تھراہٹ سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں ہوائی جہاز میں ہی ہوں اور یہ لاش ہوائی جہاز کے ذریعے مرحومہ کے لواحقین کے پاس پہنچائی جا رہی ہے جہاں اسے دفن کیا جائے گا۔ تابوت میں سروری بھی بہت ہو گئی تھی۔ لاش جہاز کی کسی انزکندیشن جگہ پر رکھی گئی تھی۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ یہ جہاز ہندوستان کے کس شہر میں جا کر اترتا ہے۔ کتنا وقت گزر گیا اور جہاز کب سے پرواز کر رہا ہے اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ لاش کی دوائیوں کی بو نے ایک بار مجھے بے ہوش کرنے کے بعد اپنا عادی بنا لیا تھا۔ اب مجھے ان کی تیز بو کچھ نہیں کہتی تھی۔ لیکن میری آواز ابھی تک خرخر کی طرح سے نکلتی تھی۔ میں نے ایک

اور ویگن سارٹ ہو کر تیزی سے کسی طرف روانہ ہو گئی۔ اس گھبراہٹ میں مجھے خیال آیا کہ انسانی آواز میں شور مچا کر باہر نکل سکتا ہوں لیکن خدا جانے یہ میری گھبراہٹ کی وجہ تھی یا تابوت کے اندر لاش پر لگائی گئی تیز دواؤں کا اثر تھا کہ میری آواز حلق میں بند ہو کر رہ گئی۔ میں نے ایک دو بار آواز نکالی لیکن وہ ایسے نکلی جیسے میں ہچکی لے رہا ہوں۔ پھر یہ ہچکی بھی بند ہو گئی اور میری قوت گویائی ایک بار پھر جاتی رہی۔ لاش پر ہسپتال والوں نے ایسی تیز دوائیں لگائی ہوئی تھیں کہ ان کی وجہ سے میرا سر پکڑانے لگا تھا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور کوشش کے بعد حلق سے آواز کی بجائے خرخر خرخر کی آواز نکلتی تھی۔

بے اختیار میرے دل نے کہا۔

”اے خدا! میرے گناہ معاف فرما دے۔ مجھے پر رحم فرما اور مجھے اس نئے عذاب

سے چھٹکارا دلا۔“

لیکن اس نئے عذاب نے آگے چل کر میرے ساتھ بہت کچھ کرنا تھا۔ میرے ساتھ ایسے ایسے واقعات پیش آئے والے تھے کہ جن کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایسپرینس بڑی تیز رفتاری سے بھاگتی جا رہی تھی۔ مجھے لاش کی تیز دواؤں کی وجہ سے اب نہ کمائڈ خالد کی بو آرہی تھی اور نہ اپنی بیوی جیلہ کے جسم کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ لاش پر لگی ہوئی تیز دواؤں سے میرے حواس بھی جواب دینے لگے تھے۔ تابوت میں گھپ اندھیرا تھا۔ اگر میں سانپ نہ ہوتا تو مجھے کچھ نظر نہ آتا۔ لیکن میں سانپ ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا۔ میں ابھی تک تابوت کی دیوار سے چمٹا ہوا تھا۔ میں نیچے لاش پر اتر آیا۔

میں نے لاش کو غور سے دیکھا۔

یہ لاش کسی گوری جیٹی سرخ پلاں والی لڑکی کی لاش تھی جو انگریزی لڑکی لگتی تھی۔ اس نے دلوں والا سفید ریشمی لباس پہنا ہوا تھا۔ سر کے بال سفید ریشمی فیتے سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں نازک ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ ناخنوں پر نیل پاش لگا

اس کے اندر مغل مل گئی ہوئی تھی۔ جبکہ اس تابوت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی بالکل سادہ لکڑی کا تابوت تھا۔ بس جہاں یہ تابوت کھولا جائے گا میں تیزی سے نکل کر بھاگ جاؤں گا۔

جہاز رک گیا تھا معلوم نہیں یہ کس شر کا ہوائی اڈہ تھا۔ تابوت کارگو کے حصے میں تھا۔ یہاں تک لوگوں کی آوازیں بھی بڑی مدہم مدہم آ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ تابوت کو یہاں اتار لیا جائے گا مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی اور جہاز ایک بار پھر وہاں سے بھی پرواز کر گیا۔ یا خدا! میں کہاں جا رہا ہوں مجھے لڑکی کی لاش کے ساتھ کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ لاش کا جسم بھی ٹھنڈا تھا۔ سانپ زیادہ سردی برداشت نہیں کر سکتا مجھے بھی سردی زیادہ لگنے لگی تھی۔ میں لڑکی کی لاش کے نیچے گھس گیا لڑکی کے کپڑے بھی ٹھنڈے تھے لیکن پھر بھی وہاں تو تھوڑا سکون محسوس ہوا۔ جہاز ایک بار پھر خاص بلندی پر آ کر اپنے طے شدہ راستے پر مقررہ رفتار کے ساتھ سو پرواز تھا۔ کسی وقت خیال آیا کہ کہیں یہ لاش ہندوستان سے باہر کسی ملک میں تو نہیں لے جاتی جا رہی۔ پھر سوچا کہ میں انڈیا کبھی بڑا ملک ہے اس کے شہروں کا فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے انگریز لڑکی کی یہ لاش بھوپال سے مدراس لے جاتی جا رہی ہو جو بھوپال سے کافی دور ہے اور ہوائی جہاز میں چار پانچ گھنٹے ضرور لگ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے راستے میں جہاز ناگ پور کا ہو۔ بس اسی طرح میں اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا اور جہاز ایسے پرواز کر رہا تھا جیسے وہ اب کہیں بھی نہیں رکے گا۔

ایک بار پھر جہاز نے جیسے ایک پتھر کا اڈا اڈا مجھے ایسا لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ نیچے ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی انزپورٹ آ گیا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ہندوستان کا انزپورٹ ہی ہے یا کسی دوسرے ملک یعنی سری لنکا کا انزپورٹ ہے۔ جہاز کے پیچھے کھلنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جہاز زمین سے لگ کر دوڑنے لگا۔ مجھے صرف ایک بار کا ڈر تھا کہ کہیں جہاز یہاں سے بھی آگے پرواز نہ کر جائے۔ ابھی تک تو مجھے یہی امید تھی کہ جہاز ہندوستان کے ملک میں

دو بار اپنے آپ کو کرم داد کرم داد کہہ کر پکارتا چلا لیکن میرے حلق سے خراہٹ ایسی آواز ہی نکلی۔ خدا جانے یہ کس قسم کی تیز دوائیاں تھیں کہ جو لاش کو کچھ عرصے تک محفوظ کرنے کے واسطے لگائی گئی تھیں لیکن انہوں نے میری آواز بند کر دی تھی۔ اتنا اطمینان مجھے ضرور تھا کہ جیسے ہی میں تابوت سے باہر آیا میری آواز بحال ہو جائے گی۔

جہاز مسلسل پرواز کر رہا تھا۔ اپنی آرمی سروس میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہمیں ہوائی جہاز میں بٹھا کر کافی بلند پر لے جایا جاتا تھا اور پھر وہاں سے ہم پیرا شوٹوں کے ساتھ چھلانگ لگایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی میں نے ڈھاکہ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے ڈھاکہ تک کئی بار سفر کیا تھا۔ جہاز میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کے انجن کی آواز اور ڈولنے سے فوراً سمجھ گیا تھا کہ میں جیٹ ہوائی جہاز میں ہوں۔ جہاز ایک ہی رفتار پر ایک ہی آواز کے ساتھ مسلسل چلا جا رہا تھا۔ پھر ایسے محسوس ہوا کہ جہاز نے ایک پتھر لگایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نیچے کی طرف اترنا شروع کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب کوئی شر آگیا ہے۔ لیکن میں اپنی مرضی سے نہیں اتر سکتا تھا۔ مجھے تو وہیں اترنا تھا جہاں لاش والے تابوت کو اتارا جاتا تھا۔ میں تو لاش کے ساتھ نفی کر دیا گیا تھا۔

جہاز کے پیچھے کھلنے کی زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر اس کے پیچھے پیچوں کے رن وے پر ٹکرانے کی آواز آئی اور جہاز کی رفتار کم ہونے لگی۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یا خدا یہ تابوت اسی شہر میں اتارا جائے۔ ایک بار جہاز تابوت سے اتر جائے اس کے بعد میں اس میں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔ ایک ہلکی سی امید میرے دل میں باقی تھی کہ ہو سکتا ہے تابوت جو عارضی طور پر بند کیا گیا ہو اور جب یہ تابوت لاش کے لواحقین تک پہنچے تو وہ مرحومہ کے آخری دیدار کے لیے اس کو دوبارہ کھولیں یا ہو سکتا ہے اسے کسی دوسرے تابوت میں منتقل کیا جائے کیونکہ یہ تابوت لکڑی کے کھوکھے کی طرح تھا۔ میں نے گرجا گھر میں ایک بار جو تابوت دیکھا تھا

تبوت والی گاڑی دیر تک چلتی رہی۔ تبوت میں اب وہ جہاز والی سرور نہیں رہی تھی۔ بلکہ ہلکی ہلکی گرمی ہو گئی تھی۔ اس گرمائش نے میرے سنپ والے جسم کی توانائی کافی محل کر دی تھی۔ اب مجھے یہ خطرہ تھا کہ اس تبوت کو اسی طرح قبر میں دفن نہ کر دیا جائے۔ اگر لاش کے لواحقین نے ایسا کیا تو میں بھی لاش کے ساتھ زندہ درگور ہو جاؤں گا۔ اگر قبر میں تبوت سے باہر ہوتا تو میں مٹی میں سوراخ کر کے قبر سے باہر نکل سکتا تھا لیکن تبوت کی لکڑی کی دیواروں میں سوراخ کرنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس بات کا امکان کم ہی نظر آتا تھا کہ تبوت کو کھولا جائے گا۔ یقین کریں اس وقت میں بھی ایک طرح سے موت و حیات کی کشش میں مبتلا تھا اور دل میں خداوند کرم سے اپنی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ تبوت والی گاڑی مختلف سڑکوں کے موڑ گھومتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے تبوت کے اندر سمندر کی ہوا کی نمی کو محسوس کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی ساحل سمندر کے قریب کسی طرف جا رہی ہے۔ پھر ایک چھوٹا سا پتھر کٹ کر گاڑی رک گئی۔

باہر سے لوگوں کی دھیمی آواز میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کسی نے تال زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کسی نے انگریزی زبان میں کسی سے کہا۔

”شام ہو رہی ہے فلور۔ میت کو دوسرے تبوت میں رکھ دیا جائے۔“

یہ سنا تھا کہ میری جان میں جان آ گئی۔ یہ میرے لیے تبوت سے نجات حاصل کرنے کا سنہری موقع تھا۔ چاہے لوگ مجھے مارنے کو دوڑیں لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیسے ہی تبوت سے لاش نکل کر دوسرے تبوت میں رکھی جائے گی میں چھلانگ لگا کر بھاگ جاؤں گا۔ میرے بچنے کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار تو لوگ سنپ کو دیکھ کر ادھر ادھر دوڑ پڑیں گے کیونکہ سنپ کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔

پادری کے دھیمی زبان میں بائبل پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر میرے والے

ہی ہو گا۔ اگر یہاں سے بھی پرواز کر جاتا ہے تو یقینی بات تھی کہ جہاز کسی دوسرے ملک میں جا رہا ہے۔ جہاز رک گیا تھا۔ باہر سے لوگوں کی اور گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب کافی دیر گزر گئی تو میں سمجھ گیا کہ جہاز کی منزل یہی انزپورٹ ہے۔ پھر مجھے دروازہ کھلنے اور آدمیوں کے اندر آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کان ان کی آوازوں پر لگا دیے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس زبان میں بات کر رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ وہ کسی ہندوستانی زبان میں ہی بات کر رہے تھے۔ یہ مجھے تال زبان لگتی تھی۔ ڈھاکہ میں ایک مدراس ایجنٹ مال خریدنے کلکتہ سے آیا کرتا تھا۔ وہ یہی زبان بولتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جنوبی ہند کے تال گاؤں صوبے میں تال زبان بولی جاتی ہے۔

یہ بات میرے لیے بڑے سکون کا باعث تھی کہ میں بھارت میں ہی تھا۔ اگر یہ جہاز مجھے کسی دوسرے ملک لے جاتا تو میرے لیے مشکل حالات پیدا ہو سکتے تھے اور میرا وہاں سے واپس بھوپال اپنی بیوی حیلہ کے پاس آنا تقریباً ناممکن تھا۔ جہاں تبوت پڑا تھا وہاں سے سلمان باہر نکلے جانے کی آوازیں آئے لگیں۔ پھر انزپورٹ کے پورٹوں نے میرے تبوت کو بھی اٹھایا اور وہاں سے لے جانے لگے۔ پھر ایسا لگا جیسے تبوت ایک گاڑی میں رکھ دیا گیا ہے۔ مجھے ایک آدمی کے انگریزی میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں زیادہ نہیں لیکن تھوڑی بہت انگریزی سمجھ لیتا تھا۔ وہ کسی کو صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے سسکیں بھرنے کی آواز آئی۔ یہ مرنے والی انگریز لڑکی کے ماں باپ ہی ہو سکتے تھے جو انزپورٹ پر لاش کا تبوت وصول کرنے آئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ چل پڑی۔ میں تبوت کے اندر انگریزی لڑکی کی لاش کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ دوانیوں کی تیز بول لاش سے اسی طرح اٹھ رہی تھی۔ اگرچہ یہ تیز بول میں اب برداشت کرنے لگا تھا لیکن میرا گلا خشک ہو چکا تھا اور میری آواز بالکل نہیں نکلتی تھی۔ اگر نکلتی تھی تو خراہٹ ایسی آواز نکلتی تھی۔ میں اپنی آواز میں ایک لفظ بھی بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

تھ۔ چونکہ میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا اس لیے بے دریغ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں لوگوں کی دسترس سے باہر ہو گیا ہوں تو میں گھاس میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر تک تیز دوائیوں والے تابوت میں لاش کے ساتھ بند رہنے کے بعد تازہ ہوا نے مجھے پھر سے تازہ دم کر دیا تھا۔ مجھے اپنے قریب سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک موٹا چوڑا ڈر کر ایک طرف کو بھاگا تھا۔ یونہی میں نے اسے ڈرانے کے لیے پھنکار ماری تو مجھے احساس ہوا کہ میرے گلے کی خراہٹ دور ہو چکی ہے۔ میں نے فوراً "حلق سے آواز نکلی اور کہا۔

"یا اللہ مدد!"

میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ جب میں نے اپنی انسانی آواز سنی۔ لاش پر لگائی گئی تیز دوائیوں کا اثر ختم ہو چکا تھا اور میری قوت گویائی یعنی بولنے کی طاقت پھر سے واپس آگئی تھی۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی جیسے کسی فقیر کو اچانک کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ میں نے شوق میں آکر اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیں۔

"کریم دلہ! خدا کے اپنے گناہوں کی معافی مانگ، وہی بخشے والا میرا ہے۔ تجھ سے بڑے گناہ ہوئے ہیں۔ یا اللہ میرے گناہ معاف فرما دے۔"

پھر جیلہ سے تصور میں ہی باتیں کرنے لگا۔

"جیلہ! تو مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے تجھے بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں۔

مجھے معاف کر دینا۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب میں پھر تم سے آن لوں گا۔ ہم دونوں پاکستان اپنے گھر واپس پہنچ جائیں گے اور داتا صاحب دیک چڑھائیں گے اور پھر سے ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ وہاں کوئی میری آواز سن نہ رہا ہو۔ گھاس اونچی تھی۔ میں نے پوری گردن اوپر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ بھارت کا کون سا شہر ہے اور میں کس جگہ پر ہوں۔ میں تیزی سے گھاس کے میدان کو پار کر کے دوسری طرف آگیا۔ یہاں کھیت تھا جس کی مینڈھ پر ناریل اور تاڑ

تابوت کے کیل اکھاڑے جانے لگے۔ میں لاش کے نیچے ہو گیا۔ ایک طرف کے کیل اکھاڑنے کے بعد اس کے ڈسکن کو دوسری طرف کر دیا گیا۔ اس وقت مجھے باہر کی تازہ ہوا محسوس ہوئی۔ میں نے لاش کے نیچے سے ذرا سی گردن باہر نکال کر اوپر دیکھا۔ یہ کوئی گرجا گھر تھا۔ اس کی مخروطی چمٹ اونچی تھی۔ کچھ گورے مرد اور گوری عورتیں تابوت میں جبک کر لاش کو دیکھنے لگیں۔ ایک عورت سسکیں بھر رہی تھی۔ باہر بجلی کے بلب کی روشنی تھی۔ میں ریک کر لاش کے پاؤں کی طرف آگیا کیونکہ اس طرف کوئی عورت یا مرد نہیں تھا۔ پادری صاحب بلند آواز میں مناجات پڑھ رہے تھے اور لاش پر مقدس پانی چھڑکا جا رہا تھا۔

اب میرے لیے انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں کسی قسم کی احتیاط کا خیال رکھے بغیر لاش کے درمیان سے نکلا اور تابوت کی دیوار پر جتنی تیزی سے ریک سکتا تھا ریک کر اچھل کر تابوت سے باہر جا کر اب وہاں سانپ سانپ کا شور مچ گیا۔ اس کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہوا اور لوگ کس طرف کو بھاگے۔ میرا منہ جس طرف کو اٹھا میں نے وہی طرف بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ میں دیوانہ وار اور پوری شدت اور پوری طاقت کے ساتھ رینگتا ہوا اس میں سے نکل گیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا محن تھا جہاں روشنی ہو رہی تھی محن بغیر گھاس کے تھا۔ پکٹنے فرش پر میں زیادہ تیزی سے نہیں دوڑ سکا تھا لیکن مٹی کے محن میں آتے ہی میری رفتار اور تیز ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے مجھے مارنے کے لیے نہیں دوڑے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ میں محن میں سے نکل گیا۔ آگے جھاڑیوں کی دیوار تھی۔ میرے لیے یہ بہترین پناہ گاہ تھی۔ کیونکہ وہاں اندھیرا بھی تھا۔ میں جھاڑیوں میں گھس گیا اور دوسری طرف سے باہر آگیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی کچی سڑک تھی جس کی دونوں جانب ناریل کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ یہ جنوبی ہند کا علاقہ ہی تھا۔ کیونکہ جنوبی بھارت کے شہروں میں ناریل کے درخت بہت ہوتے ہیں۔

میں سڑک پار کر گیا۔ اس کے آگے پھر ایک میدان تھا جس میں کافی گھاس اگا ہوا

آ رہی تھی، نہ جیلہ کے جسم کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ سامنے دور جو روشنی دکھائی دے رہی ہیں ان کی طرف چلتا چاہیے اور معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی ریلوے سٹیشن ہی ہو اور مجھے اس شہر کا نام معلوم ہو جائے۔

میں نے کھیت کی مینڈھ پر روشنیوں کی طرف رنگنا شروع کر دیا۔ ایک کھیت کے بعد دوسرا کھیت آیا تو مجھے کسی سانپ کی بو آئی۔ میں وہیں رک گیا۔ اندھیرے میں ایک کلفتی موٹا تازہ سانپ کھیت میں سے نکل کر مینڈھ پر آ گیا۔ اس نے بھی میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گزر جائے گا لیکن اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنا پھن کھول لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے پھنکارنے لگا۔ میں نے بھی پھن کھول لیا۔ میرا پھن اس کی نسبت کلفتی چھوٹا تھا۔ کالے سانپ نے اتنی زور سے میری طرف جھک کر پھنکار ماری کہ مجھے اس کی پھنکار کی گرمی محسوس ہوئی۔ میں بھی جواب میں زور سے پھنکارا مگر سانپ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آخر انسانی جبلت سے مجبور ہو کر میں نے انسانی آواز میں اسے واسنٹے ہوئے کہا۔

”تو میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں انسان ہوں تو صرف سانپ ہے بھاگ جا یہاں سے۔“

کالے سانپ پر میری آواز کا عجیب اثر ہوا۔ میری انسانی آواز سننے ہی اس نے اپنا پھن سکیڑ لیا اور میرے ارد گرد دائرے کی شکل میں پھر لگانے شروع کر دیے۔ میں پریشان ہو گیا میں نے اسے ایک بار پھر ڈانٹ کر کہا۔

”کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں دیوتا شوجی کا سانپ ہوں؟ دفع ہو جا، نہیں تو میں تجھے ایسی بد دعا دوں گا کہ تو زندہ بھی نہیں رہے گا اور مرے گا بھی نہیں۔“

یہ سننے ہی سانپ نے میرے آگے اپنا سر جھکیا اور جلدی سے کھیت کی طرف بھاگ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری انسانی آواز سمجھ رہا تھا مگر میں اس کے پیچھے کیا کرنے جا تا۔ کیونکہ وہ خود تو انسانی آواز میں مجھ سے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال

کہ درخت تھے۔ ان درختوں کے ستونوں جیسے تنوں کے درمیان میں سے دور کچھ روشنی بھللا رہی تھیں۔ میری دائیں جانب سے سمندر کی تیز ہوا آ رہی تھی۔ سانپ ہونے کی وجہ سے میں سمندر کی ہوا کی نفی فوراً محسوس کر سکتا تھا۔ اس ہوا میں مچھلیوں کی بو بھی کسی وقت آ جاتی تھی۔ سمندر کی طرف جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میرا مقصد کسی طرح واپس بھوپال پہنچنا تھا۔ بھوپال ہی میرا اس وقت ٹارگٹ تھا۔ مجھے ناگن درگا کا بھی خیال آیا کہ وہ میرے جانے کے بعد بھیمپوں جی کے مندر میں میرا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوگی۔ رات ہو گئی ہے اب تک وہ وہاں کہاں بیٹھی ہوگی۔ وہ بھی سانپ کے روپ میں تھی۔ ہو سکتا ہے وہیں کسی جگہ چھپ کر میرا انتظار کرتی رہے۔ لیکن ہم ایک دوسرے سے پھنچ چکے تھے۔ میں کتنی بھی کوشش کرتا ہفتہ دس دن سے پہلے میں بھوپال نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پہلے تو مجھے اس شہر کا ریلوے سٹیشن معلوم کرنا تھا۔ پھر یہ معلوم کرنا تھا کہ یہاں سے بھوپال کی طرف کون سی گاڑی جاتی ہے۔ پھر اس گاڑی میں سوار ہونے کی تک و دو کرنی تھی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اتنی دور جنوبی بھارت کے اس شہر سے کوئی بھی گاڑی سیدھی بھوپال نہیں جاتی ہوگی۔ خدا جانے راستے میں کتنی بار گاڑی بدلتی پڑے۔

مجھے ناگن درگا پر بھی ترس آ رہا تھا۔ قسمت کے کھیل زالے ہوتے ہیں۔ تقدیر نے اسے میرے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ جب تک میں انسانی شکل میں واپس آ کر اس کا ناگن والا منہ نہیں چوم لیتا وہ اپنی عورت کی شکل میں واپس نہیں آ سکتی تھی۔ اس کو ہر حالت میں مجھے تلاش کرنا تھا اور میرے پاس پہنچنا تھا۔ اتنی دور سے ہمیں ایک دوسرے کی بو بھی نہیں آ رہی تھی۔ خدا جانے دن نکلنے پر ناگن درگا کیا کرے، کس طرف نکل جائے۔ میری تلاش میں کہاں کہاں ماری ماری پھرتی رہے۔ تقدیر نے ہمیں ایک دوسرے سے عجیب حالات میں جدا کر دیا تھا۔ ہوائی جہاز نبوت کے ساتھ مجھے بھارت کے جنوب میں کلفتی دور لے آیا تھا۔ یہاں مجھے نہ اپنے دوست کمانڈو خالد کی بو

میری انسانی آواز واپس آگئی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں سناپ سے واپس انسانی روپ میں آگیا ہوں۔ اگرچہ میرا جسم اب بھی سناپ کا جسم تھا لیکن کم از کم میں انسان کی آواز میں بول تو سکتا تھا۔ اپنی آواز سن تو سکتا تھا۔ میں نے دور نظر آنے والی جملہ لائق روشنیوں کی طرف اپنا سفر جاری رکھ دیا۔ کھیت ختم ہو گئی۔ پھر ایک چھوٹی سی تکیا آئی۔ میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔ روشنیوں قریب آتی جا رہی تھیں۔ گنگا تھا کہ یہ ساتھ ساتھ بہتے ہوئے تین چار کوارٹر ہیں۔ ذرا آگے گیا تو سمندر کی ایک کھاڑی دکھائی دی جہاں ایک سینئر کھڑا تھا۔ یہ روشنی اسی سینئر کی تھیں جنہیں میں کسی عمارت کی روشنیوں سمجھ رہا تھا۔ کھاڑی اسے کہتے ہیں جہاں سمندر کنارے کو لٹک کر ایک بہت بڑے تالاب یا جیل کی شکل میں اندر آگیا ہوتا ہو۔

ایک طرف اندھیری رات میں سمندر بھی دیکھا جس میں کہیں کہیں نیلے سے ابھرے ہوئے تھے اور ان کے اوپر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی بندرگاہ لگتی تھی۔ میں کھاڑی کے کنارے کنارے رہتا سینئر سے پانچ چھ سو گز کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ سینئر جہاں کھڑا تھا اس کے سامنے ایک اونچی بستی سی بنی ہوئی تھی۔ اتنی دور سے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہاں کوئی مزدور یا پورٹر وغیرہ ہے یا نہیں۔ بستی کے ایک طرف تین چار کوارٹر تھے جہاں اندھیرا چھایا تھا۔ صرف ایک کونے والے کوارٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہاں میرا کوئی کام نہیں تھا کیونکہ مجھے ریلوے اسٹیشن کی تلاش تھی اور یہ کوئی گھاٹ تھا جہاں سے شاید مال بردار سینئر ساحل کی ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک چلتے ہوں گے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں گردن اٹھا کر اپنی بائیں جانب دیکھا۔ اوپر کئی فاصلے پر جگہ جگہ روشنیوں کے نقطے روشن تھے۔ میں واقعی مایوس ہو گیا تھا۔ آدمی کی شکل میں ہوتا تو کسی سے اسٹیشن کا راستہ بھی پوچھ سکتا تھا اور کسی جگہ سے کوئی سواری لے کر یا پیدل ہی چل کر اسٹیشن تک پہنچ سکتا تھا لیکن میں ایک چھوٹے سے سناپ کی شکل میں تھا اور میری رفتار بھی بہت سست تھی۔ مجھے راستوں کا بھی علم نہیں تھا۔

وہاں ایک جھاڑی کی لوٹ میں بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کس طرف جانا چاہیے اور یہ کس طرح معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کون سا شہر ہے اور اس کا ریلوے اسٹیشن کس طرف ہے۔ کیونکہ ریل گاڑی بھی مجھے بھوپال پہنچا سکتی تھی۔ کئی دیر تک میں سناپ کی شکل میں بیٹھا آدمی کے ذہن سے سوچتا رہا۔ سوچ سوچ کر آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کھاڑی میں جو سینئر کھڑا ہے اس میں کہیں چھپ جاتا ہوں۔ رات کو نہیں تو صبح یہ سینئر چل پڑے گا اور اس میں اس شہر کی کسی بندرگاہ پر پہنچ جاؤں گا۔ اس طرح شہر سے خدا جانے کتنے میل دور میں کب تک بیٹھا رہوں گا۔ صبح ہو گئی تو لوگ یہاں بھی مجھے مارنے کے لیے دوڑیں گے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں سینئر کی طرف چل پڑا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ سینئر کئی پڑا تھا اور دو آدمی لکڑی کی چٹان ایسی گودی پر کھڑے تھے۔ انہوں نے فونی دوڑیاں پھنی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں شین گھنٹیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یا تو یہ انڈین نیوی کا سینئر ہے اور یا پھر اس میں فونی سہان کسی دوسری بندرگاہ کو لے جایا جا رہا ہے۔ سینئر میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا تھا کیونکہ اتنے بڑے سینئر میں میرے چھپنے کے لیے کوئی بھی اچانک نکل سکتی تھی۔ سینئر کے دو ڈیک تھے۔ ایک اپر ڈیک تھا۔ ایک لوئر ڈیک تھا۔ دونوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ اپر ڈیک کا جھنگہ خالی تھا۔ لوئر ڈیک کے جھنگے کے ساتھ ایک آدمی کھڑا گودی میں کھڑے فونیوں کو اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ سینئر کے لوئر ڈیک سے گودی کی چٹان تک ایک تختہ لگایا گیا تھا۔ دونوں فونیوں میں سے ایک ڈیک کی طرف گیا۔ اس نے ڈیک کے جھنگے کے پاس کھڑے دوسرے آدمی سے کوئی بات کی اور دوڑ کر واپس آگیا اور اپنے ساتھی فونی سے کچھ کہا۔

وہ فونی ایک طرف دوڑ کر گیا۔ میں نے غور سے دیکھا وہ سینئر کا رستہ کھول رہا ہے جو کسی جگہ بندھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے صرف اس لیے دکھائی دے رہی تھی کہ میں سناپ ہونے کے ناطے اندھیرے میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ سینئر کا رستہ کھولا جا رہا ہے تو میں تیزی سے ریک کر لکڑی کے تختے کے نیچے ہو گیا اور تختے

کے آنے جانے کے لیے بنایا تھا۔ میں نے سر سوراخ کے اندر ڈال کر دیکھا۔ اندر سے میں مجھے کتابیں اور فائلیں ایک دوسرے کے اوپر لگی ہوئی نظر آئیں۔ میں نیچے اتر آیا۔

ان کتابوں اور فائلوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس وقت ہنگامی حالات بھی نہیں تھے کہ میں سوراخ میں گھس کر چھپ جاؤں۔ میں اپنی جگہ پر کرسیوں کے درمیان آرام سے بیٹھا رہا۔ سیٹر ساری رات چلتا رہا۔ کسی کسی وقت اس کے دسل دینے کی آواز آ جاتی یا کبھی کبھی کوئی دوسرا سیٹر کچھ فاصلے پر سے دسل دیتا ہوا گزر جاتا۔ اوپر والے ڈیک پر سے ملاخوں کے قتلے لگانے کی آواز آ جاتی، پھر خاموشی چھا جاتی۔ رات گزر گئی دن کی روشنی ہو گئی۔ لکڑی کے کرسیوں کے درمیان سے دن کی روشنی مجھ تک بھی پہنچ رہی تھی۔ مجھے صرف اس صورت میں وہاں سے باہر نکلنا تھا جب سیٹر کسی بندرگاہ پر جا کر رکتا۔ سیٹر ابھی تک چل رہا تھا۔ پھر اس کی رفتار ایسا لگا جیسی ہو گئی ہے۔

وہ ایک طرف کو محوم رہا تھا۔ ڈیک پر ملاخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تہل یا تلیگو زبان میں ایک دوسرے کو کچھ کہہ سن رہے تھے۔ جو فوجی اس سالن کے آگے پہرہ دے رہا تھا اس کی جگہ رات کو ایک دوسرا آدمی آ گیا تھا اور وہ برابر ٹہل رہا تھا۔ لکڑی کے فرش پر اس کے بھاری بوتلوں کی ٹھک ٹھک صاف سنائی دے رہی تھی۔ سیٹر کے انجن بند ہو گئے۔ وہ کسی بندرگاہ کی گودی سے جا کر لگ گیا تھا۔ گودی کی طرف سے بھی لوگوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دوسرے سیٹروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی بڑی بندرگاہ ہے۔ میں کرسیوں سے باہر نکلنے کی ترکیب یا موقع دیکھ رہا تھا کہ بہت سے بھاری بوتلوں کی ٹھک ٹھک وہاں آ کر رک گئی۔ جہاں میں بسوں کے پیچھے چھا ہوا تھا۔ لگتا تھا چار پانچ فوجی وہاں آ گئے ہیں۔ اتنے میں کسی نے میرے آگے کا جو کرسی تھا اس کو اپنی طرف کھینچا۔ میں گھبرا گیا کیونکہ کرسی کے ہٹ جانے کی صورت میں میں انہیں نظر آ سکتا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوچا میں

کے اوپر جانے کی بجائے تختے کے نیچے رہتا ہوا سیٹر کے لوڑ ڈیک کی دیوار کے ساتھ چسٹ گیا اور پھر پچھلی طرف چلا گیا۔ سیٹر کی لوہے کی چادر والی دیوار زنگ آلود تھی۔ میں جلدی جلدی رہتا ہوا سیٹر کے عقب میں لوڑ ڈیک کے جنگلے کے پاس آ گیا اور میں نے گردن ذرا سی باہر نکل کر دیکھا۔

لوڑ ڈیک کی گیلری یا راہ داری یہاں آ کر سیٹر کی دوسری جانب مڑ گئی تھی۔ دونوں گیلریوں میں بھی روشنی تھی اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ اتنے میں سیٹر کے انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ سیٹر کی دیوار جس کے ساتھ میں لگا ہوا تھا تھرتھراتے لگی۔ میں جنگلے کے درمیان سے ہو کر گیلری میں اتر گیا۔ جگہ جگہ لکڑی کے کھوکھوں اور بڑے بڑے بورڈوں اور لوہے کی جیشوں کی شکل میں سالن لدا ہوا تھا۔ میں وہیں سالن کے نیچے گھس کر بیٹھ گیا۔ سیٹر کنارے سے آہستہ آہستہ ہٹ رہا تھا۔ پھر اس نے کھاڑی میں کسی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں لکڑی کے کرسیوں کے درمیان ایک جگہ سمٹ کر بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھیں یہ سیٹر بھارت کے کس دوسرے شہر کی بندرگاہ پر پہنچا ہے یا اسی شہر کی کسی دوسری گودی پر جاتا ہے۔ مجھے لوڑ ڈیک پر فوجی بوتلوں کی آواز آئی۔ میں غور سے سننے لگا۔ کوئی فوجی ان لکڑی کے کرسیوں کے پاس جا کر پھر کر جیسے پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ یہ فوجی سیٹر تھا۔ رات کو اس پر پہرہ تو ہوتا ہی ہے۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں لکڑی کے لیوٹرے اور چوڑائی میں چھوٹے بکے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ رسیوں کے پنڈل لگے ہوئے تھے۔ یہ آفیسرز کرہٹ تھے۔

میں آری میں رہ چکا تھا اور ان کرسیوں کو پچھتا تھا۔ اس قسم کے ایجنسی کیس نمائگر ذرا لیوٹرے لکڑی کے کرسیوں میں آفیسرز اپنی فائلیں اور ضروری کلنڈرات یا کتابیں وغیرہ لے کر ایک شہر سے دوسرے شہر جایا کرتے تھے۔ میں بیکار بیٹھا تھا۔ سوچا کوئی مصروفیت ہونی چاہیے۔ میں ایک کرہٹ پر اوپر کی طرف رینگ کر گیا۔ وہاں رسی کے پنڈل کے پاس ہی ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔ شاید یہ کریک ہونے سے بن گیا تھا یا اندر ہوا



میں ایک بار پھر بچس گیا تھا۔

آفسرز کرٹ کے اندر فائیلوں، کتابوں اور کھنڈات کے پلندوں کے درمیان میں سمٹ کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جہاں یہ فوجی ٹرک جا کر رکے وہاں کرٹ کے سوراخ میں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے ایک بار پھر سوراخ میں سے بھٹاک کر دیکھا۔ فوجی ٹرک میں جی جی جی اور دو نوں انڈین فوجی سپاہی میرے بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ اس وقت باہر نکلتا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ ٹرک جنوبی ہندوستان کے اس ساحلی شہر کی سڑکوں پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کئی سڑکوں کے موڑ گھومتا ہوا فوجی ٹرک ایک طرف مڑا اور رک گیا۔ دو نوں سپاہیوں نے جلدی سے کرٹ کو اٹھا کر ٹرک سے باہر نکالا اور ایک کمرے میں لے جا کر رکھ دیا۔ یہ کام انہوں نے اتنی جلدی کیا کہ مجھے راستے میں باہر نکلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ جس کمرے میں انہوں نے لکڑی کے آفسرز کرٹ کو لے جا کر رکھا، میں نے سوراخ میں سے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ درمیان میں میز بھی تھی۔ میز کے اوپر ایک بلب روشن تھا۔ دو نوں انڈین سپاہی باہر جانے کی بجائے وہیں کرٹ کے پاس کھڑے رہے۔ میرے لیے باہر نکلتا مشکل ہو گیا تھا۔

اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ اس آفسرز کرٹ میں کوئی اہم فوجی دستاویزات ہیں جن کی اتنی حفاظت کی جا رہی ہے۔ دو انڈین فوجی آفسرز کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں

تیزی سے آفسرز کرٹ کے اوپر چڑھا اور سوراخ میں سے کرٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ میں اگر ایک دو سیکنڈ کی دیر کر دیتا تو میرا مارا جانا یقینی تھا کیونکہ جیسے ہی میں آفسرز کرٹ کے اندر گیا اس کرٹ کو گھیسٹ کر باہر نکل لیا گیا۔ پھر ایسے لگا جیسے کرٹ کو کسی لوڈر پر لا دیا گیا ہے۔ لوڈر میٹر کے ڈیک پر سے ہوتا ہوا لکڑی کے تختے کے ذریعے نیچے اتار دیا گیا۔ اب میں بندرگاہ کی بیٹی پر تھا۔ بیٹی کے فرش پر بھی لوڈر دیر تک کسی طرف چلتا رہا۔ دو فوجی جو لوڈر کو دھکیل رہے تھے تامل زبان میں ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ باہر کلفی آوازیں تھیں۔ ان میں گاڑیوں کے ہارن کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں بھی تھیں۔ لوڈر ایک جگہ آکر رک گیا۔ میں نے سوراخ کے پاس سر لا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی اور فوراً سر اندر کر لیا۔ کرٹ کے سوراخ کا رخ دونوں فوجیوں کی جانب تھا۔ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے مگر خدا کا شکر ہے کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ اس سوراخ میں سے دن کی روشنی میں سائب کی شکل نظر آ سکتی تھی۔ جب انہوں نے کرٹ کو لوڈر پر سے اتار کر زمین پر ڈالا تو میں نے سوراخ میں سے باہر دیکھا۔ میرے قریب ہی ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ کرٹ کو اٹھا کر ٹرک میں رکھ دیا گیا اس کے بعد دونوں فوجی بھی ٹرک میں بیٹھ گئے اور ٹرک کسی جانب روانہ ہو گیا۔



پہلے والا انڈین آفیسر کیپٹن ریک کا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا اور بولا۔
 ”میجر صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ ہمارا یہ خفیہ پرائیکٹ کامیاب ثابت ہوگا؟“
 دوسرا فوجی آفیسر میجر ریک کا تھا۔ اس نے فائل پر نظریں جمائیں تھیں۔ کہنے لگا۔

”کیپٹن پانڈے! یہ پرائیکٹ نہ صرف پاکستانی سمندر میں ان کے سارے کے سارے بحری بیڑے کو تباہ و برباد کر دے گا بلکہ اس کی مار کر اپنی بندرگاہ تک بھی ہو سکتی ہے۔“

یہ سنتا تھا کہ کریٹ کے سوراخ میں سے میں ان دونوں انڈین آرمی افسروں کو دیکھنے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ پاکستان کے خلاف کسی خفیہ آرمی منصوبے کی سیکرٹ فائل تھی۔ یہ پاکستانی بحریہ اور کراچی کی بندرگاہ پر زبردست تباہی پھیلانے کا پلان یا بلو پرنٹ تھا۔ اب میرے وہاں سے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ہر حالت میں بلکہ اپنی جان کی بازی لگا کر اس خفیہ منصوبے کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ انڈین کیپٹن نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”سرا! اگر وہاں کی ٹیل رپورٹ سے ہم کراچی کی بندرگاہ پر ایک کر سکتے ہیں تو پھر ہم اس خفیہ پرائیکٹ کی مدد سے امرتسرے لاہور پر بھی ایک کر سکتے ہیں۔“
 انڈین میجر بولا۔

”اس بار ایسا ہی ہوگا۔ سن ۶۵ء میں پاک آرمی کا ڈیفنس ناقابل شکست تھا۔ ہمارے پاس بھی روایتی ہتھیار تھے لیکن اس بار حالات بدل چکے ہیں۔ ہمارے سامنے دانوں نے جو خفیہ ہتھیار ہمیں تیار کر کے دیا ہے اور جس کا ہم راجستھان کے صحرائوں میں تجربہ کر چکے ہیں، یہ پاک آرمی اور نیوی کے ڈیفنس کو پہلے ہی ایک میں تس تس کر کے رکھ دے گا۔ اس بار بھگوان نے چاہا تو ہم لاہور میں داخل ہو جائیں گے۔“

انڈین کیپٹن نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا اور بولا۔

سپاہیوں نے انہیں سیلوٹ کیا۔ میں سوراخ کے ساتھ آنکھیں لگائے دیکھ رہا تھا۔ دونوں انڈین فوجی میز پر آنے سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے بریف کیس میز پر رکھ دیے۔ کیپٹن یا میجر ریک کے گتے تھے۔ دونوں جنوبی ہند کی کسی رجمنٹ کے آفیسرز تھے۔ رنگ گہرے ساوے تھے۔ ایک کی مونچھیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک آفیسر نے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا۔
 ”کریٹ میں سے بریف کیس نکالو۔“

”ییس سرا!“

جس کریٹ میں میں چھپا ہوا تھا وہ کھولا جانے والا تھا۔ میرے لیے یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ میں کریٹ کے اندر ہی ریک کر کوٹے میں فائلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ کریٹ کا تالا کھول کر اس میں سے بریف کیس نکالا گیا۔ کریٹ دوبارہ بند کر دیا گیا۔ کریٹ کے بند ہوتے ہی میں جلدی سے ریک کر سوراخ کے پاس آگیا میرے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ دیکھنا چاہیے کہ اس بریف کیس میں کیا ہے۔ جس کی اتنی زیادہ حفاظت کی جا رہی تھی اور جس کی خاطر انڈین آرمی کے دو اصلی آفیسرات کے وقت یہاں آئے ہیں۔

بریف کیس ٹین کے ایک چوکور ڈبے میں بند تھا۔ ایک انڈین آفیسر نے چابی لگا کر ٹین کا بکس کھولا۔ اس میں سے بریف کیس نکالا اور دونوں سپاہیوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں انڈین سپاہی سیلوٹ مار کر کمرے سے نکل گئے۔ اب کمرے میں دونوں انڈین آرمی آفیسر اکیلے تھے یا میں تھا جو کریٹ کے سوراخ میں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ فوجی آفیسر نے کریٹ والے بریف کیس کو کھول کر اس میں سے سیاہ رنگ کی ایک فائل نکالی اور اس کے کاغذات کو اٹھتے پلٹنے لگا۔ دوسرا فوجی آفیسر فائل کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔
 ”تمام کاغذات اوکے ہوں گے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ییس کیپٹن! ٹ از اوکے۔“

”سرا یہ فائیل اور خفیہ منصوبے کے بلیو پرنٹ کل شام تک دوار کا نیول ہیڈ کوارٹر میں پہنچ جائے چاہیں۔“

انڈین میجر نے فائیل میں سے کچھ چیزیں اپنی نوٹ بک میں درج کیں اور فائیل بند کر کے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔
 ”ڈونٹ وری کیپٹن! آرمی کا ایک ڈیکوٹا صبح سات بجے دوار کا سے ہوتا ہوا بمبئی جا رہا ہے۔ یہ کرٹ اسی جہاز میں جائے گا۔“

انڈین میجر نے خفیہ پرائیکٹ فائیل والا بریف کیس ٹین کے ڈبے میں بند کر کے تالا لگایا اور سپاہیوں کو آواز دی۔ دونوں سپاہی تیز تیز چلتے اندر آ گئے۔ میجر نے انہیں آڑ دیا۔

”دیکھو جوان یہ کرٹ یہاں سے سیدھا آرمی انزپورٹ پر جائے گا۔ تم لوگ اس کو گارڈ کرے گا۔“

دونوں سپاہیوں نے بیک آواز کہا۔

”ٹھیک ہے سرا۔“

”اس کو کرٹ میں ہمارے سامنے بند کرو۔“

سپاہیوں نے فوراً ”حکم کی تعمیل کی اور ٹین کے بکس کو کرٹ میں رکھ کر کرٹ بند کر کے تالا لگا دیا اور چالی انڈین میجر کے حوالے کر دی۔ میجر نے کہا۔

”تم اسے سیدھا آرمی انزپورٹ پر لے جائے گا اور رات کو اس کی گارڈ ڈیوٹی پر رہے گا۔ ہم صبح اوھر آ کر اسے وصول کر لے گا۔“

”لیس سر۔“

دونوں سپاہیوں نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔ دونوں انڈین آرمی آفسرز کمرے سے نکل گئے۔ میرے وہاں سے نکل کر فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ہر حالت میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انڈین آرمی نے پاکستان کے خلاف ایسا کون سا خفیہ ہتھیار بنایا ہے جس کی مدد سے وہ کراچی اور لاہور پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کر چکا

ہے۔ انڈین سپاہیوں نے ٹین کے بکس کو آفسرز کرٹ میں رکھا اور اسے اٹھا کر باہر لائے۔ باہر فوجی ٹرک موجود تھا۔ کرٹ کو ٹرک میں رکھ دیا گیا اور ٹرک اس شہر کے فوجی ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

ساری رات میں کرٹ میں چمپا رہا۔ کرٹ فوجی انزپورٹ کے کسی کمرے میں رکھا گیا تھا۔ دونوں انڈین سپاہی رات بھر اس کے پاس موجود رہے۔ دوسرے دن وہی رات والے انڈین آرمی آفسرز آ گئے۔ میں کرٹ کے سوراخ میں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے کرٹ کو باہر ہی سے چیک کیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ کرٹ لوڈ کیا جائے۔ کرٹ کمرے سے باہر لایا گیا۔ اسے لوڈر پر رکھ کر دور کمرے آرمی کے ایک ڈیکوٹا ہوائی جہاز کے پاس لے جایا گیا۔ وہاں بھی دو آرمی آفسرز موجود تھے۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں کرٹ کو جہاز میں رکھوا دیا گیا۔ جہاز تھوڑی دیر بعد ٹیک آف کر گیا۔ اس جہاز کی منزل دوار کا تھی جہاں جہاز نے پہلے اترنا تھا۔ میرے کرٹ کو دونوں انڈین آرمی افسروں یعنی کیپٹن ہائیڈرے اور میجر نے اپنے پاس ہی رکھوا لیا تھا۔ یہ بھی کافی لمبی فاصلہ تھا۔ آخر جہاز دوار کا کے آرمی انزپورٹ پر اتر گیا۔ انزپورٹ سے ایک فوجی جیپ کرٹ کو لے کر آرمی کے کسی گریڈ میں لے آئی۔ میں کسی کسی وقت کرٹ کے سوراخ میں سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ یہاں فوجی دفتر تھے۔ فوجی گاڑیاں بھی اوھر اوھر کھڑی تھیں۔ کرٹ کو ایک کمرے میں لے جا کر رکھ دیا گیا۔ دونوں آرمی افسر کرٹ کے ساتھ تھے۔ کمرے میں پہلے سے ایک کرنل ریک کا انڈین آرمی افسر موجود تھا۔ دونوں آرمی افسروں نے اسے سیلوٹ کیا۔ کرنل کے کندھے کا فیتہ میں نے دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ وہ کرنل ریک کا افسر تھا۔ اس نے سنہری فریم والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ سر درمیان سے تھوڑا کنبہ تھا۔ رنگ اس کا بھی گہرا سائلا تھا۔ وہ سگار پی رہا تھا۔ اس نے انگریزی میں میجر سے کہا۔

”میجر گو کھلے! میں نے ہائی کمانڈ سے منظوری لے لی ہے۔ تم دونوں مگن پوسٹ پر جا کر آج ہی سے لیزر پرائیکٹ پر کام شروع کر دو گے۔ تمہارے خیال میں تمہیں

جگہ چنل سے نشان لگانے لگے۔ وہ آپس میں انگریزی میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ بھارتی ہائی کمان نے اسرائیل کی فوجی ٹیکنیکل مدد سے ایک ایسی لیزر گن تیار کر لی ہے جس کی مار دووار کا سے کراچی تک ہے اور جو اپنی شعاعوں سے کھلے سمندروں میں پاکستانی جہازوں پر حملہ کر سکتی ہے اور کراچی بندرگاہ پر بھی جاتی چا سکتی ہے۔

مجھے تو محض اتفاق سے انڈین ملٹری کے پاکستان کے خلاف ایک بڑے خطرناک خفیہ منصوبے کا سراغ مل گیا تھا۔ میں نے اسی وقت دل میں طے کر لیا تھا کہ مجھ سے جیسے اور جس طرح سے بھی ہو سکا میں اس پاکستان دشمن منصوبے کو خاک میں ملائے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرا قوی فرض بھی بن گیا تھا۔ افسوس صرف یہ تھا کہ میں انسانی شکل میں نہیں تھا۔ پھر خیال آیا کہ اگر میں سانپ کی شکل میں نہ ہوتا تو اس خفیہ منصوبے کا مجھے کبھی پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میرا سانپ کا روپ ہی میری مدد کا بہت بڑا سبب بن گیا تھا۔ لیکن اس منصوبے کو تباہ کرنے کے لیے کمانڈو انٹیک کی ضرورت تھی اور اس کے لیے نہ صرف مجھے اپنے ساتھیوں کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون کی ضرورت تھی بلکہ میرا واپس انسانی شکل میں آنا بھی ضروری تھا۔

میں اکیلا سانپ بن کر انڈین آرمی کے اسٹے خطرناک اور اہم فوجی منصوبے کو تباہ نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں آرمی افسردہ تک بلیو پرنٹ کا معائنہ کرتے اور نشانات لگاتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میجر گوگلے نے کمریدم می کرتے ہوئے کہا۔

”کیپٹن پانڈے اس وقت کلنی پنے کو جی چاہتا ہے۔“

کیپٹن پانڈے نے کہا۔

”سرا! میں تو ہم کلنی نہیں منگوا سکتے۔ یہ تو ٹاپ سیکرٹ روم ہے۔“

میجر نے چنل میز پر رکھے ہوئے کہا۔

”او! میں میں چل کر پیتے ہیں۔ یہ کھنڈات اس طرح میز پر رہنے دو۔ ہم باہر سے لاک کر جائیں گے دروازے کو۔ ہمیں دس پندرہ منٹ ہی لگیں گے۔“

لیزر گن کی فائصل چیکنگ میں کتنا وقت لگ جائے گا۔“

میجر گوگلے نے کہا۔

”سرا! یہ کام ایک ہفتے کا ہے لیکن ہم اسے جلدی سے جلدی ختم کرنے کی کوشش

کریں گے۔“

انڈین کرنل نے سگار کا ہلکا سا شش لگاتے ہوئے کہا۔

”یہجرا ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کشمیر میں ہماری فوج بری طرح مر رہی ہے۔ ہماری ساری فوجی قوت اس لیزر گن پر ڈیپنڈ کرتی ہے۔ سن پینٹھ کی جنگ میں پاکستان کی نیوی نے ہماری دووار کا گن پوسٹوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ہماری نیوی کو بری طرح شکست ہوئی تھی مگر اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ ہم اگلے مہینے پاکستان پر انٹیک کرنا چاہتے ہیں اور اس بار ہم سمندر کی طرف سے انٹیک کریں گے اور ہماری یہ لیزر گن ہمارے نیول ٹروپس کے لیے کراچی کی بندرگاہ صاف کر دے گی۔“

کیپٹن پانڈے نے کہا۔

”سرا! ہم ایک ہفتے سے پہلے اپنا کام ختم کر لیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔“

”اوکے۔“

انڈین کرنل چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میجر گوگلے نے کیپٹن سے کہا۔

”کیپٹن! سیکرٹ فائصل نکال لاؤ۔ میرا خیال ہے ہمیں اسی جگہ بیٹھ کر کام شروع کر

رنا چاہیے۔“

انڈین کیپٹن کرٹ کی طرف بڑھا تو میں جلدی سے سوراخ سے ہٹ کر کرٹ کی

دوسری طرف فائیلوں اور کتابوں کے پیچھے چھپ گیا۔ جب کیپٹن کرٹ میں سے

سیکرت فائصل نکال کر لے گیا تو میں واپس سوراخ کے پاس آ کر امنیں دیکھنے لگا۔ اس

دفعہ کیپٹن نے ٹین کا بکس کرٹ میں ہی رہنے دیا تھا۔ وہ اس میں سے سیکرٹ فائصل

نکال کر لے گیا تھا۔ فائصل کھول کر دونوں اس کے کھنڈات کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔

ان میں ایک بلیو پرنٹ بھی تھا۔ بلیو پرنٹ کو انہوں نے میز پر پھیلا دیا اور اس پر جبک کر

”ٹھیک ہے سر۔“

میں میز پر سے چلائنگ لگا کر فرش پر آیا اور تیزی سے کرٹ کے سوراخ میں گھس گیا۔ دونوں انڈین آرمی افسر کلائی پی کر واپس آ گئے تھے۔ میں سوراخ کے ساتھ لگ کر بیٹھا اپنے ذہن میں بلیو پرنٹ کے اشاروں اور ڈگریوں کے نشانات کو دہراتے ہوئے پنتہ کر رہا تھا تاکہ وقت آنے پر مجھے سب کچھ یاد رہے۔ کچھ دیر کے بعد دونوں افسروں نے بھی اپنا کام ختم کر لیا اور فائیل کو بند کر کے کرٹ میں رکھ کر کرٹ کو تالا لگا دیا۔ مہر گوگلے نے کہا۔

”یہاں سے ہم گن پوسٹ پر جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے سر!“ کیپٹن پانڈے بولا۔

دونوں سیکرٹ روم سے نکل گئے۔ انہوں نے باہر سے دوبارہ تالا لگا دیا تھا۔ میں کرٹ سے نکل آیا اور کمرے کا جائزہ لیا کہ وہاں باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ میں چھوٹا سا سانپ تھا مجھے باہر نکلنے کے لیے چھوٹا سا سوراخ ہی کافی تھا۔ دیوار کے اوپر چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیوار پر چڑھ کر روشندان کی سلاخوں میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ سامنے فوجی دفنوں کی دو منزلہ عمارت تھی۔ دو چار فوجی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ملٹری پولیس کا ایک جوان عمارت کے باہر گاڑ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ادھر ادھر انڈین فوجی چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ میں دن کے وقت نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے شام ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ میں روشندان سے نیچے اتر آیا اور کرٹ کے اندر جانے کی بجائے اس کے پیچھے چھپ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سانپ بن کر مجھے بہت سے نئے تجربے ہوئے تھے۔ ایک تجربہ یہ بھی تھا کہ سانپ کبھی بور نہیں ہوتا۔ وہ کئی کئی گھنٹے چھپ کر بڑے آرام سے انتظار کر سکتا ہے۔ میں بور تو نہیں ہو رہا تھا مگر مجھے بے چینی ضرور لگی تھی کیونکہ میں وقت ضائع کیے بغیر بھوپال روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ بھوپال جانے کی اہم ترین مہم میرے سامنے تھی۔ یہ ایک مہم ہی تھی۔ جس طرح ایٹمنڈ بلیری کے سامنے مائٹ ایورسٹ فتح کرنے کی مہم تھی۔ تعجب کی بات تھی کہ اتنی مدت گزر جانے کے

اور وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ مجھے دروازہ لاک کرنے کی آواز آئی۔ اس کے فوراً بعد میں کرٹ کے سوراخ میں سے نکل کر فرش پر بیٹھتا ہوا میز کے اوپر آگیا۔ میرے سامنے بھارتی ملٹری کے خطرناک ہتھیار لیزر گن کا بلیو پرنٹ کھلا پڑا تھا۔ سابق آرمی کمانڈر ہونے کی وجہ سے میں کچھ کچھ اس قسم کے پرنٹ سمجھ لیتا تھا۔ میں نے پرنٹ کے نشانات اور آڑھے تریچے زاویوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ ڈی کے اے لکھا تھا، اس کا مطلب دوار کا ہی ہو سکتا تھا۔ اس جگہ ایسے نشان بنے ہوئے تھے جو پہاڑیوں کے نشان ہو سکتے تھے۔ ایک جانب سمندر دکھایا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لیزر گن دوار کا کے سمندری ساحل کی کسی پہاڑی میں لگائی گئی تھی۔ میں نے یہ سارے خفیہ نشانات اور اشارے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیے۔ بلیو پرنٹ کو بار بار دیکھا۔ اس کی بعض ڈگریاں بھی جو میری سمجھ میں آئیں اپنے انسانی ذہن میں محفوظ کر لیں۔ میں نے دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت دن کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ میں وہاں سے اب فرار ہونا چاہتا تھا۔ مجھے پاکستان کے خلاف بھارتی فوج کے ایک خطرناک ترین منصوبے کا راز مل گیا تھا۔ میں وہاں سے نکل کر کسی نہ کسی طرح جلدی سے جلدی بھوپال پہنچ کر کمانڈر خالد کو اس خطرناک پاکستان دشمن منصوبے کی ساری تفصیلات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میری دو مجبوریاں تھیں۔ سانپ ہونے کی وجہ سے میں دن کی روشنی میں وہاں سے باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ دوسری مجبوری یہ تھی کہ میں سانپ کی روپ میں تھا اور میرے لیے اس حالت میں بھوپال پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ میں دوار کا میں آرمی کے ہیڈ کوارٹر یا اس کے کسی گریزن میں ہوں۔ وہاں سے مجھے ٹرین کے ذریعے پہلے بمبئی اور اس کے بعد بھوپال پہنچنا تھا۔ یہ کام پہاڑ کٹ کر دودھ کی سرنگالنے کے برابر تھا۔ مگر مجھے ہر حالت میں یہ پہاڑ کٹنا تھا۔

دروازے کا تالا باہر سے کوئی کھول رہا تھا۔

ہری یا لال بتی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف یہی ایک نشان مجھے ریلوے
سٹیشن تک پہنچا سکتا تھا۔ میں اللہ پر توکل رکھ کر رینگتا چلا جا رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں بمشکل ایک ڈیڑھ سو گز دور گیا ہوں گا کہ میرے جسم کو
ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ میں وہیں رک گیا۔ اللہ کا مجھ پر بہت بڑا کرم ہونے
والا تھا۔ میں سانپ کے روپ سے اپنی انسانی شکل میں واپس آنے والا تھا۔ یہ عمل
شروع ہو گیا تھا۔ میں بے حد خوش تھا اور خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یہ جھٹکے اب
رکیں نہیں۔ لگتے ہی چلے جائیں۔ چندرہ میں سینڈ کے بعد وہی ہونے لگا جو اس سے
پہلے ہوا کرتا تھا۔ یعنی مجھے اپنے جسم کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے مجھ پر کسی
نے بوجھ سا ڈال دیا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر ایک جھٹکا لگا۔ یہ آخری جھٹکا
تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں سانپ سے اپنی انسانی شکل میں واپس آ چکا تھا۔
میرا لباس وہی تھا جو مکائدو خالد سے بچھڑتے وقت میں نے پہنا ہوا تھا۔ یہ ہندوانہ لباس
تھا۔ یعنی کھور کا کرتہ اور پاجامہ۔ پاؤں میں پرانی پٹیل تھی۔ میں نے جلدی سے کرتے
کی جیب ٹٹولی۔ اس میں سے چندرہ روپے نکل آئے لیکن یہ میرے کسی کام کے نہیں
تھے۔ کیونکہ دوا رکاز سے بستی اور پھر وہیں سے بھوپال تک میں بذریعہ ریل گاڑی اتنے
کم پیسوں میں نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا جو
ہوگا دیکھا جائے گا۔

انسان کے روپ میں آنے کے بعد سب سے پہلا فرق یہ پڑا تھا کہ میں اندھیرے
میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دوسرے مجھے اب مکائدو خالد اور جمیلہ کی بو بھی نہیں آ
سکتی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کلمہ شریف پڑھ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو
مجھے احساس ہوا کہ میری شیو کانی بڑھ آئی ہے۔ میں ایک نئے عزم کے ساتھ دور نظر
آنے والی روشنیوں کی طرف چل پڑا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا کہ اچھی طرح دیکھ
بھال کر راستے کو روشنیوں کی طرف نکل سکوں۔ جلد ہی مجھے ایک سڑک مل گئی۔ پھر
ایک موٹر گاڑی کی آواز بھی آئی۔ ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ چپے سے ایک گاڑی آ رہی

ہو جو میں ابھی تک سانپ ہی کے روپ میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس دوران
اپنی انسانی شکل میں واپس نہیں آیا تھا۔
قدرت میرے ساتھ عجیب و غریب مذاق کر رہی تھی۔
کیا اس قدر بڑا رہا ہے۔

مجھے شام کا اندھیرا ہونے تک اسی کمرے میں رہنا تھا۔ میں اسی کمرے میں بیٹھا
رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیوار پر لگے کلاک کو اور روشندان میں سے آنے والی دن
کی روشنی کو دیکھ لیتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب روشندان پر دن کی روشنی ماند
پڑتے پڑتے شام کے اندھیرے میں تبدیل ہو گئی۔ میں فوراً دیوار پر رینگتا روشندان پر
پہنچا۔ سلاخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے والی فوجی عمارت میں روشنی ہو رہی
تھی مگر میرے کمرے والی دیوار اندھیرے میں تھی۔ میں نیچے اتر گیا اور ایک جانب
جھاڑیوں میں آکر گردن نکال کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ کچھ فاصلے پر
اونچی دیوار تھی جس پر خاردار تار لگی تھی۔ اس طرف سے باہر نکلنے میں ہی عافیت
تھی۔ چنانچہ میں اندھیرے میں لہہ کر رینگتے رینگتے دیوار تک آیا۔ دیوار پر چڑھ کر خاردار
تاروں کے نیچے سے گزر کر دیوار کی طرف آ گیا۔ دوسری طرف شیب میں کھائی تھی۔
میں سوچنے لگا کہ مجھے سٹیشن پر کس طرح پہنچنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا مرحلہ تھا۔ مجھے یہ
بھی معلوم نہیں تھا کہ سٹیشن کس طرف ہے۔ میرے پاس ادھر ادھر بھٹکنے کے لیے
وقت بھی نہیں تھا کہ میرے انسانی ذہن پر بایوسی بھی چھانے لگی تھی۔ کسی وقت خیال
آنا کہ میں شاید بھوپال نہ پہنچ سکوں۔

لیکن جب یہ خیال آنا کہ دشمن میرے وطن پاکستان کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنا
چکا ہے تو میرے اندر نئی طاقت آ جاتی۔ میں نے دور سے نظر آنے والی روشنیوں کو اپنا
ٹارگٹ بنایا اور اللہ کا نام لے کر کھائی پار کی اور روشنیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک
چھوٹی سڑک بڑی مشکل سے گاڑیوں سے بچ کر اور لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ کر
پار کی۔ یہ سارا علاقہ اونچا نیچا تھا۔ زمین چٹری چٹری تھی۔ کہیں کہیں کھیت بھی تھے اور
دائیں بائیں ٹاریل اور ٹاؤ کے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مگر ریلوے سگنل کی

رات آگئی۔ رات کے پہلے پھر ٹرین بھوپال کے سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ میں نے فغا کو سو سمجھا مجھے جیل اور ناگن درگا اور کمانڈو خالد میں سے کسی کی بوجھوس نہ ہوئی۔ اگر میں سناپ ہوتا تو یہ بوجھوس آتی۔ میں مین گیٹ کی بجائے لائینوں لائن چل کر سٹیشن سے دور نکل آیا۔ راستے کا مجھے علم تھا۔ چند روپوں میں سے چھ روپے میرے پاس باقی رہ گئے تھے۔ میں نے ایک رکشے والے کو چھ روپے دیے اور کمانڈو خالد کی کین گھگھ والے علاقے میں آکر ایک جگہ اتر گیا۔ وہاں سے پیدل کین گھگھ کے نیلے تک گیا۔ گڑھے میں سے ہو کر خالد میں جانے لگا تو مجھے دو جگہوں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب مجھے پچانا تو ایک جگہ مجھے اندر لے گیا۔ کمانڈو خالد مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گلے لگ کر ملا۔ میں نے سب سے پہلے جیل کا پوچھا۔ کئے لگا۔

”وہ بے چاری تو بس صبر شکر کر کے بیٹھی ہوئی ہے۔ تمہارا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ابھی ہمارے ساتھ ہوتے ہو۔ ابھی غائب ہو جاتے ہو۔“

میں نے پوچھا۔

”میں تم نے اس پاس یا اس حجرے میں کسی سناپ کو تو نہیں دیکھا؟“

میرا خیال تھا کہ شاید ناگن درگا اس طرف آئی ہو۔ خالد بولا۔

”کیوں کیا بات ہے؟ کیا کوئی اور بھی آدمی سناپ کی جون میں ادھر آیا ہوا ہے؟“

میں نے اسے مختصراً ناگن درگا کے بارے میں اور پھر اپنی کہانی سنائی اور کہلا۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کمانڈو۔ انڈین آرمی کی لیڈر گمن دوادار کی ساحلی پہاڑیوں میں کسی جگہ ڈسپلن کر دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے دو گھنٹیں ہوں۔ جیسا کہ میں نے بھارتی فوجی افسروں کو باتیں کرتے سنا ہے اس توپ کی مار کراچی تک ہے اور تم خوب جانتے ہو کہ لیڈر گمن کیا جگہ چا سکتی ہے۔“

کمانڈو خالد بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا۔ کئے لگا۔

”بلیو پرنٹ والے نقشے میں اس گمن پوسٹ کی کوئی خاص جگہ نہیں دکھائی گئی تھی؟ دوادار کی ساحلی پہاڑیاں تو کاٹھیا وار سے لے کر آگے بہت دور تک چلی گئی تھی۔

تھی۔ میں نے ہاتھ دے دیا۔ اس خیال سے کہ شاید رک جائے۔ گاڑی رک گئی۔ یہ ایک پرانی سی ٹار تھی۔ ایک بوڑھا گجراتی اسے چلا رہا تھا۔ اس نے گجراتی میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے سٹیشن کا نام لیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ اندر آ جاؤ۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ہندوستانی میں بولا۔

”تم گجراتی باتیں؟“

میں نے کہلا۔

”ہاں، ہم بنگالی، امرتسر کا ہے۔ رام پر شاد نام ہے۔“

وہ بولا۔

”سٹیشن پر جائے گا؟“

میں نے کہلا۔

”دلی جائے گا۔ دلی والا گاڑی کب جاتا ہے؟“

وہ بولا۔

”ماہوم نہیں۔ ہم تین سٹیشن پر چھوڑ دے گا۔“

اس نے مجھے سٹیشن پر چھوڑ دیا۔ وہاں کلنی روٹی تھی۔ انسانی روپ میں آنے کے بعد اب ایک بار پھر میرے سر پر پولیس اور سی آئی ڈی کا خطرہ منڈلانے لگا۔ لیکن میں جس مشن پر جا رہا تھا اس کی اہمیت اس خطرے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ کلنی پوچھ کچھ کے بعد پتہ چلا کہ بھوپال کو وہاں سے کوئی گاڑی سیدھی نہیں جاتی۔ پہلے بمبئی جانا پڑے گا۔ وہاں سے پھر بھوپال والی گاڑی لے گی۔ میرے پاس کرائے کے پیسے نہیں تھے۔ میں بغیر ٹکٹ کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ساری رات ٹرین چلتی رہی۔ رات ہونے کی وجہ سے کوئی ٹکٹ چیکر نہ آیا۔ صبح بمبئی پہنچ گیا۔ یہاں سے جتنا ایکسپریس میں بھی بغیر ٹکٹ کے بیٹھ گیا اور بھوپال کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں جہل ٹکٹ چیکر کے آنے کا خطرہ ہوتا۔ وہاں ٹرین سے اتر کر کسی دوسرے ڈبے میں بیٹھ جانا۔ اسی طرح سارا دن گزر گیا۔

کمانڈو خالد بولا۔

”ہم یہاں سے زیادہ اسلحہ اپنے ساتھ لے کر وہاں نہیں جاسکتے۔ یہ کسی جنگل کا کمانڈو مشن نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے شہر کا اور بہت اہم فوجی لڑے کو چاہ کرنے کا مشن ہے۔ یہاں چاہنا کمانڈو کی جرأت و دلیری کے ساتھ ساتھ سراغ رسانی کی بھی ضرورت ہے۔ کمانڈو ہارون فوجی اسلحہ کی ٹیکنیکل یارکیوں کی بھی سمجھ بوجھ رکھتا ہے اور بجیس بدلنے میں بھی بڑا ماہر ہے اور پھر ہم پہلے کاٹھیاواڑ جائیں گے۔ کاٹھیاواڑ میں ہمارے جہلہ موجود ہیں۔ وہ بھی ہماری راہ نمائی کریں گے۔“

میں نے کہا۔

”ہمیں صبح یہاں سے کاٹھیاواڑ کی طرف نکل پڑنا چاہیے۔“

کمانڈو خالد نے ہنس کر کہا۔

”کیا جہلہ بھابی سے نہیں ملو گے؟ وہ تو بے چاری ہر روز کسی نہ کسی کو بھجوا کر تمہارا پوچھ لیتی ہے۔“

میں نے کہا۔

”تم اسے ابھی کسی کو بھیج کر بلوا لو۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے انڈین کیپٹن پانڈے اور میجر گوکھلے کی پاکستان کے خلاف جو باتیں سنی ہیں اس سے مجھے بے حد تشویش ہے۔ یقین کرو خالد بھائی بھارت کی ملٹری ہائی کمانڈ کراچی سے پاکستان پر حملے کا فیصلہ کر چکی ہے۔“

کمانڈو خالد کو بھی اب کچھ تشویش ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔

”جو سکتا ہے بھارتی نیوی لیزر گن کی طاقت کے نشے میں اس قسم کی حرکت کر بیٹھے۔ ٹھیک ہے ہم صبح ہی کاٹھیاواڑ چل پڑیں گے۔“

اس نے ایک جہلہ کو شہر میں بھیج کر جہلہ کو بلوا لیا۔ مجھے دیکھ کر جہلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”جہلہ! مجھے معاف کر دو۔ میری وجہ سے تمہیں بے حد مصیبتوں اور پریشانیوں کا

ہیں۔“

میں نے اسے بلیپرٹ پر دیکھے ہوئے اور اپنی یادداشت میں محفوظ کیے ہوئے سارے نکات بتائے اور کہا۔

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ یہ لیزر گن پوسٹ دوآر کا کے شمال مشرق میں سب سے اونچی پہاڑی پر ہے۔ کیا تم اس علاقے میں کبھی گئے ہو؟“

کمانڈو خالد بولا۔

”وہ سارا علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے لیکن یہ یاد نہیں کہ دوآر کا کے ساحل پر سب سے اونچی پہاڑی کون سی ہے؟“

میں نے کہا۔

”یہ تو وہاں چل کر معلوم ہو جائے گا لیکن ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں انڈیا کب ساحل کی طرف سے کراچی پر حملہ کر دے۔“

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

”ایسا بھی کوئی اندھیر نہیں بچ گیا۔ آخر پاکستان کی ملٹری انٹیلی جینس بھی غافل نہیں بیٹھی ہوگی۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ پاکستان کی ہٹا کے ساتھ ساتھ ہم بھارت کے مسلمانوں کی ہٹا کا بھی مسئلہ ہے۔ ہم دوآر کا کی لیزر گن پوسٹ کو ضرور تباہ کریں گے خواہ اس کے لیے ہمیں اپنی جانیں کیوں نہ قربان کرنی پڑیں۔“

میں نے کہا۔

”تمہارے خیال میں ہمیں اپنے ساتھ کتنے کمانڈو لے جانے ہوں گے۔“

کمانڈو خالد نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔

”اس مشن کے لیے زیادہ کمانڈوز کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم کمانڈو ہارون کو ساتھ لے چلیں گے۔ وہ گجراتی کے ساتھ ساتھ تامل زبان بھی سمجھ اور بول لیتا ہے۔“

”ہمیں اسلحہ کی بھی ضرورت ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”یہ بات تو میں نے ان آرمی افسروں کی ذہنی خود سنی تھی کہ یہ لیزر گن اسرائیلی فوجی ہائی کمانڈ کے قلعوں سے تیار کی گئی ہے۔“

بارون بولا۔

”تو پھر یہ اس برعظیم کی سب سے ملک اور خطرناک لیزر گن ہوگی۔ اگر انڈین آرمی کے پاس اس قسم کی ایک اور گن بھی ہے تو وہ دواگہ بارڈر سے لاہور پر بھی اٹیک کر سکتے ہیں۔“

”وہ تو اس ہلاک عزائم کا بھی اظہار کر رہے تھے۔“

اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈو خالد نے کہا۔
”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں دوسری لیزر گن کو تلاش کر کے اسے بھی تباہ کرنا ہوگا تاکہ دواگہ کی جانب سے بھی لاہور کو بچایا جاسکے۔“

کمانڈو بارون بولا۔

”اتنی بڑی لیزر گن تیار کرنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس پر اربوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ انڈین فوجی ہائی کمانڈ نے ایک گن ضرور تیار کر لی ہے اور اسے جیسا کہ کمانڈو کرم واو نے ہمیں بتایا ہے، دواگہ کی ساحلی پہاڑی پر ضرور نصب کر رکھا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اسے تباہ کرنا ہوگا۔“

کمانڈو خالد نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی صبح کی ٹرین سے بمبئی روانہ ہو رہے ہیں۔ فرقیئر میل منہ اندھیرے بھوپال پہنچتی ہے۔ ہم عام قیض چٹون کے لباس میں ہوں گے اور الگ الگ ڈبوں میں سفر کریں گے۔ اوکے؟“

”اوکے۔“ ہم دونوں نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہم وہیں سو گئے۔ رات کے تین بجے ہمیں جگا دیا گیا۔ ہم جلدی جلدی تیار ہو گئے۔ ایک ایک پیالی چائے کی اور خفیہ کیمین گاہ سے الگ الگ کھل کر بھوپال ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ سٹیشن پر ہم ایک طے شدہ جگہ پر آکر مل

سامنا کرنا پڑا ہے لیکن یقین کرو میں نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہا ہوں ایک مسلمان اور پاکستانی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ ہم صبح جس مشن پر روانہ ہو رہے ہیں وہ ہم سب کی سلامتی اور بقا کا مشن ہے۔ شاید انڈیا میں میرا یہ آخری مشن ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد اگر میں زندہ بچ گیا تو تمہیں لے کر فوراً پاکستان چلا جاؤں گا۔“

”خدا تمہیں سلام رکھے۔ تمہاری جگہ میں مر جاؤں۔“

یہ کہہ کر جیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر حوصلہ دیا اور ایک بار پھر کہا کہ ہم اس مشن کی تکمیل کے بعد ضرور پاکستان روانہ ہو جائیں گے۔ جیلہ ایک دو گھنٹے میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ ہم نے وہیں ایک ساتھ کھانا کھایا، چائے پی۔ پھر وہ اپنے ایک مجاہد کے ساتھ شہر کی طرف چل دی۔

اس کے جانے کے بعد کمانڈو خالد نے کمانڈو بارون کو بھی وہاں بلوا لیا۔ اسے دواگہ کا مشن کی ساری تفصیلات سمجھائیں۔ کمانڈو بارون بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ کہنے لگا۔
”کمانڈو! اس مشن کی کامیابی کے لیے ہمیں اپنے کھانا واڑ کے مجاہدوں سے

مشورہ کرنا ضرور ہوگا۔“
”ان سے تو ہم ضرور مشورہ کریں گے۔“ خالد نے کہا۔

میں نے پوچھا۔

”کمانڈو بارون! تم جدید فوجی اسلحہ کو تکنیکی طور پر سمجھتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ایک لیزر گن کی مار کتنی دور تک ہو سکتی ہے اور وہ کتنی جلدی چلا سکتی ہے؟“

کمانڈو بارون کہنے لگا۔

”اگر جیسا کہ تم کہہ رہے ہو انڈین آرمی کے فوجی اس گن کے ذریعے دواگہ سے کراچی پر وار کرنے کی بات کر رہے تھے تو ظاہر ہے یہ بڑی طاقتور لیزر گن ہوگی اور یہ ضرور اسرائیلی ٹیکنالوجی کی مدد سے تیار کی گئی ہے۔“

میں نے کہا۔

بارشوں کی وجہ سے بمبئی اور کاضیادڑ کے درمیان دو تین جگہوں سے ریلوے لائن ٹوٹ گئی تھی۔ وہاں ٹرین کو بار بار کٹنی دیر رکنا پڑا۔ اس طرح ٹرین پانچ چھ گھنٹے لیٹ پہنچی۔ کاضیادڑ میں رات ہو گئی تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ ہمارے لیے اتنا خطرناک نہیں تھا جتنا بھوپال، بمبئی اور دلی کا علاقہ تھا۔ ہم یہاں ایک ساتھ شیشن سے باہر نکلے اور ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بارش کافی زوردار تھی۔ میں پہلی بار اس شہر میں آیا تھا جبکہ کمانڈو ہارون اور کمانڈو خالد وہاں کئی بار آچکے تھے۔ ہارون نے کہا۔

”کیسی پکڑ لیتے ہیں۔“

کمانڈو خالد بڑی گہری نگاہوں سے اوپر ادھر ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ کئے لگے۔
”یہاں سے ہم کیسی نہیں لیں گے۔ بارش ختم جائے تو مندر والے چوک سے کیسی لیں گے۔“

زرا بارش تھی تو ہم شیشن کے احاطے میں سے گزر کر ہو گئے بازار میں چلے گئے۔ یہ علاقہ بھی دو دریاؤں کی طرح اونچا نیچا تھا۔ بازار میں جیل گاڑیاں بھی چل رہی تھیں۔ مندر والا چوک آگیا۔ وہاں ایک جین مندر تھا جس سے شہد کیرتن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں سے کمانڈو خالد نے ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو خالد نے کسی جگہ کا نام بتایا تھا۔ وہ جگہ شہر سے باہر تھی۔ وہاں آکر ٹیکسی ہم نے چھوڑ دی اور پیدل چل پڑے۔ شیشن سے چلے تھے تو پھوار سی پڑی تھی۔ اب وہ بھی رک گئی تھی۔ آسمان پر دور دور بجلی کی ہلکی ہلکی چمک پیدا ہو رہی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد نیم چٹانی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ ایسا علاقہ تھا کہ سڑک کی دونوں جانب بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں تھیں۔ یہاں اندھیرا بھی تھا۔ دونوں کو معلوم تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ ایک جگہ ڈھلانی چھتوں والے کچھ کوارٹر سے بنے ہوئے تھے۔ کمانڈو ہارون اور خالد میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ زمین پتھر ملی ہوئی کی

گئے۔ کمانڈو خالد نے ہارون کو تھوڑا کلاس کے بمبئی تک کے دو ٹکٹ لانے کے لیے بھیج دیا اور مجھ سے کہا۔

”پولیس کی نگاہوں سے بچ کر رہنا۔“

ہم شیشن پر ایک ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ کمانڈو ہارون ٹکٹ لے کر آگیا۔ ہم نے اپنے اپنے ٹکٹ لے لیے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔
”یہ ٹرین بمبئی سنٹرل کے شیشن پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہم آخری ٹرمینل کے پاس ملیں گے۔ اوکے۔ گو۔“

اور ہم الگ الگ ہو کر شیشن کے گیٹ کی طرف چلے گئے۔

بھوپال کافی بارون اور بڑا شیشن تھا۔ رات کے پچھلے پہر بھی پلیٹ فارم پر کافی رونق تھی۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے مسافروں میں کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم اپنے ساتھ کسی قسم کا اسلحہ تو کیا چاقو بھی لے کر نہیں چلے تھے۔ یہ چیزیں ہمیں راستے میں کسی مشکل میں پھنسا سکتی تھیں۔ راستے میں ان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گاڑی آگئی۔ میں بھی ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ ٹرین بھوپال سے روانہ ہو گئی۔

اسی روز رات کے گیارہ بجے کے قریب ٹرین نے ہمیں بمبئی سنٹرل پہنچا دیا۔ ٹرمینل پلیٹ فارم کے آخری سرے پر تھا۔ میں ٹھٹھا وہاں آکر ایک طرف بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون بھی آ گئے۔ ہم وہیں سے ریل کی پٹری میں اتر گئے اور چند لمحوں کے بعد ہم شیشن کے باہر والے مسافر خانے میں تھے۔ یہاں سے ہمیں معلوم ہوا کہ کاضیادڑ کی طرف ٹرین ابھی ابھی نکل کر گئی ہے۔ اب اگلی ٹرین جو پنجر ہے دو گھنٹے بعد جائے گی۔ ہم وہیں مسافر خانے میں بیٹھے رہے۔ وہیں ہم نے کھانا بھی کھایا، چائے پی اور سرجوڑ کر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مسافر خانے میں کافی لوگ تھے۔ بچوں کا شور بھی تھا۔ پولیس کا کوئی سپاہی وہاں نہیں تھا۔ جس وقت کاضیادڑ جانے والی ٹرین آئی تو ہم الگ الگ ہو کر اس میں سوار ہو گئے۔

بھی گریز نہیں کرتا۔ بڑا سرفروش مسلمان ہے۔“

قاسم کھانا لے کر آگیا۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ قاسم نے گیس کا چولہا جلا کر خود چائے پائی۔ ہم بیٹھ کر چائے پینے لگے تو قاسم نے پوچھا۔

”کمانڈو کیا کوئی خاص مشن ہے؟“

کمانڈو خالد نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بیان کر دی۔ قاسم خاموشی سے سنتا اور چائے پیتا رہا۔ کہنے لگا۔

”حیرانی کی بات ہے۔ ہمیں خبری نہیں کہ ہم سے تھوڑی دور دوار کا میں پاکستان پر حملہ کرنے کی ٹپاک سازش ہو رہی ہے اور انڈین آرمی نے طاقتور لیزر گن بھی نصب کر دی ہے۔“

کمانڈو خالد نے مجاہد قاسم سے پوچھا۔

”سب سے پہلے تو ہمیں یہاں سے دوار کا پہنچنا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ دوار کا میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جس کے پاس ہم کچھ دیر چھپ کر رہ سکیں؟“

مجاہد قاسم نے کہا۔

”وہاں اپنا ایک مجاہد موجود ہے۔“

اس مجاہد کا نام قاسم نے ہمیں بتایا مگر میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ میری داستان سن رہے ہیں اب تک آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ میں بھارت میں ان مجاہدوں کے اصلی نام اور اصلی ٹھکانے کیوں نہیں بتاتا۔ اس لیے دوار کا کے مجاہد کا اصلی نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ اسے شیر خان سمجھ لیں۔ شیر خان بھوپال کی خفیہ بھارتی اسلامی تنظیم کا ہی ایک رکن تھا اور دوار کا کی بندرگاہ کے قریب دوار کا کے چھوٹے سے بازار میں شیشی کی دکان کرتا تھا۔ سن ۱۹۷۵ء کی جنگ میں جب پاکستان نیوی کی توپوں نے دوار کا کی ساحلی توپوں کا صفحہ کر دیا تھا اور دوار کا قلعے کے گولہ بارود کے ذخیرے کو اڑا دیا تھا تو شیر خان نے ہی سب سے پہلے آکر مجاہد قاسم کو دوار کا کی چابی کا چشم دید حال سنایا تھا۔ مجاہد قاسم نے ہمیں مجاہد شیر خان کے بارے میں بعض ضروری تفصیل

وجہ سے وہاں بارش سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ مکان کے دو کمرے تھے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ڈھلائی چھت ایک ہی تھی۔ باہر تنگ صحن میں ایک طرف رکشا کھڑا تھا۔ خالد نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اندر سے کسی نے گجراتی میں پوچھا ”کون ہے؟“

خالد نے کہا۔

”بھوپال سے آئے ہیں“

اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ اندر بجلی کے بلب کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک دیبلے پتے نوجوان نے دروازہ کھولا تھا۔ اس نے بنیائیں اور چٹون پختی ہوئی تھی۔ ہتھکڑیاں سیاہ بال بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس نے باری باری خالد اور ہارون کو گلے لگایا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

”یہ کمانڈو کرم داد ہے! پاکستان سے آیا ہے۔“

اس نوجوان نے مجھے بھی گلے لگایا اور بولا۔

”اللہ پاکستان کو سلامت رکھے۔“

اس نے دروازہ بند کر کے چٹنی لگا دی اور ہمیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دوسرا کمرہ پہلے کمرے سے مختلف نہیں تھا۔ چیزیں اور دوسرے کھری ہوئی تھیں۔ کونے میں رکشے کے دو ٹائر پڑے تھے۔ دو ہنس کی چارپائیاں پڑی تھیں۔ وہیں کونے میں گیس کا چولہا دو چار برتن بھی پڑے تھے۔ ہم چارپائیوں پر آئے سائے ہو کر بیٹھ گئے۔ اس مجاہد کا مجھ سے تعارف کر لیا گیا۔ اس کا نام قاسم تھا۔ وہ شہر میں رکشا چلاتا تھا۔ مگر بھوپال کے مجاہدین کی خفیہ تنظیم کا انتہائی سرگرم رکن تھا۔ قاسم نے کہا۔

”میں ابھی ہوٹل سے کھانا لے کر آتا ہوں۔“

ہارون اور خالد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ چلا گیا۔ خالد کہنے لگا۔

”کرم داد! یہ دھڑا چلتا نوجوان بڑا دلیر مجاہد ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو اگر ہندو تنگ کریں تو یہ فوراً ان کی مدد کو پہنچتا ہے اور دشمنوں کو خفیہ طور پر ٹھکانے لگانے سے

کیٹ چلائی چسپا کر رکھ جاتا تھا۔ یہ چلائی صرف بھارتی اسلامی تنظیم کے مجاہدوں کے لیے چھپائی جاتی تھی کہ اگر وہ اوسر آئیں تو انہیں شیر خان کی دکان پر جانے کی ضرورت نہ پڑے اور اس خفیہ جگہ سے چلائی لے کر مکان کھول کر بیٹھ جائیں۔ ہم بھی مکان کھول کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ یہ بالکل ویسا ہی الٹ پلٹ کمرہ تھا جیسا کھلیاواڑ میں مجاہد قاسم کا تھا۔ شیر خان اکیلا ہی وہاں رہتا تھا اور اسے وہاں رہتے ہوئے دس پندرہ سال ہو گئے تھے۔ وہ گجراتی اور مراٹھی زبانیں بڑی روانی سے سمجھ اور بول لیتا تھا۔ قاسم ہمیں وہاں بٹھا کر خود شیر خان کو لینے چلا گیا۔ وہ شیر خان کو اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ شیر خان کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوئی۔ گھسا ہوا بدن تھا، رنگ سانولا تھا۔ چھوٹی چھوٹی شرعی ڈاڑھی تھی۔ خوش شکل آدمی تھا۔ آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ ہم سے گلے لگ کر ملا۔ مجاہد قاسم نے اسے راستے میں ہماری بات بتادی تھی۔

شیر خان نے ہمارے لیے چائے بنائی۔ کھانا ہم نے دوار کا کے شیشن پر ہی کھالیا تھا۔ جب ہماری مکینڈو پارٹی کسی مشن پر روانہ ہوتی تھی تو ہمیں آرڈر دیا جاتا ہے کہ جہاں اور جب تم لوگوں کو کھانا پانی ملے کھانی لو۔ ہم نے بھی ایسے ہی کیا تھا اور دوار کا کے شیشن پر گاڑی سے اترتے ہی ریلوے کینٹین پر کھانا کھلایا تھا۔ مکینڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

”شیر خان! کیا تمہیں انڈین نیوی کی لیزر گن کے بارے میں اس سے پہلے کچھ معلوم تھا؟“

شیر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں“ اور میں حیران ہوں کہ مجھے آج تک پتہ کیوں نہیں چل سکا۔ میں تو میں بڑا چوکس رہتا ہوں۔ جب بھی کوئی انڈین نیوی کا جہاز بندرگاہ پر گلتا ہے تو میرے خاص آدمی مجھے آکر بتا دیتے ہیں کہ اس جہاز سے گولہ بارود اترا ہے یا فوج کی کوئی رجمنٹ اتری ہے۔ لیکن اتنی خطرناک گن پوسٹ میں بن گئی اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔“

بیان کی اور کہا۔

”ہم شیر خان کے گھر پر ہی جا کر ٹھہریں گے۔ دوار کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ صرف سومات کے مندر کی وجہ سے اس کی رونق ہے۔ بندرگاہ پر جہاز بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔“

مکینڈو ہارون نے کہا۔

”قاسم بھائی! ہمیں جتنی جلدی ہو سکے دوار کا پہنچ کر بھارتی نیوی کی لیزر گن پوسٹ کی سہیت تلاش کرنی ہوگی۔ یہ کام کافی وقت لے سکتا ہے اور ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کوئی پتہ نہیں بھارت کب کراچی پر حملہ کر دے۔ ان کے عزائم بڑے خطرناک ہیں کیونکہ کشمیر کے علاقے پر ایک تو بھارت سرکار کا آدھا بجٹ صرف ہو رہا ہے، دوسرے اس کی فوج کٹ رہی ہے۔ وہ پاکستان پر حملہ کر کے بہت سے مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

مجاہد قاسم کہنے لگا۔

”ہم دن کے وقت یہاں سے نکل چلیں گے۔ ایک ٹرین دوپہر کے وقت یہاں سے دوار کا کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ میں اس کے ٹکٹ لے آؤں گا۔“

میری پروگرام ملے ہو گیا۔ دوسرے دن ہم ایک میٹر گینج ٹرین میں سوار ہو کر دوار کا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوار کا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ہم دوار کا پہنچ گئے۔ یہ سارا علاقہ سطح مرتفع کا ساحلہ علاقہ تھا۔ ایک طرف شمال میں خلیج کچھ کا سمندر تھا۔ مغرب میں بحرہ عرب تھا۔ مجاہد قاسم ہمیں دوار کا کے مجاہد شیر خان کے مکان پر لے آیا جو تازہ اور ناریل کے درختوں کے پیچھے ایک چٹان کے قریب تھا۔ دو کمروں والا پرانا بیرک کی طرح کا مکان تھا جس کی دیواریں مین کی تھیں۔ چھت ڈھلوان تھی اور کچہل کی تھی۔ دیواریں زنگ آلود تھیں۔ مکان کے باہر دو لوسہ کی پرانی کرسیاں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔

مجاہد قاسم کو وہ جگہ معلوم تھی جہاں شیر خان دکان پر جاتے ہوئے اپنی ایک ڈپلی

”میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے شیرخان۔ میں اس مم پر کانڈو کرم داو کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

شیرخان نے ہنس کر کہا۔

”قاسم بھائی پھر تو کسی قسم کی فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تم دوادار کا کی پھاڑیوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو لیکن خالد بھائی۔ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی دن کی روشنی میں بھی سمندر کی جانب سے دوادار کی ساحلی پھاڑیوں کا جائزہ لے لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ رات کے وقت آپ کو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ کم از کم میں نے آج تک ان پھاڑیوں میں کبھی مستقل طور پر کوئی روشنی نہیں دیکھی۔ کبھی کبھی کسی ٹرک کے ادھر سے گزرنے کی آواز آ جاتی ہے اور رات کو کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی مدد سے روشنی بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ حیران ہوں کہ انڈین آری اور انڈین نیوی نے اتنی رازداری سے اتنا بڑا فنی پراجیکٹ مکمل کر لیا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔“

کانڈو خالد نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”کرم داو! مجھے شیرخان کی دن کے وقت رہی کرنے کی تجویز پسند آئی ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں اور قاسم کو دن کے وقت علاقے کا جائزہ ضرور لینا چاہیے۔“

کانڈو ہارون کہنے لگا۔ ”مگر اس لباس میں ادھر جانا خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ وہاں تو زبردست سیکورٹی ہوگی اور انڈین آری اور نیوی کے تجربہ کار کانڈو پھاڑیوں میں چھپ کر پھر دے رہے ہوں گے۔“

شیرخان بولا۔

”آپ لوگ جینی سلوہوؤں کا بھیج بدل کر ان پھاڑیوں میں آسانی سے چل پھر سکتے ہیں کیونکہ یہاں کے لوگ جین مت کو ماننے والے ہیں اور جینی سلوہو کبھی کبھی دوادار کی پھاڑیوں میں قہپا کرنے آتے رہتے ہیں۔ وہ سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور دیر تک اسی طرح بیٹھے رہتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

میں نے کہا۔

”یہ احتمالی خفیہ فنی منصوبہ ہے شیرخان! بھارتی فنی ہائی کانڈو نے اس سلسلے میں احتمالی رازداری سے کام لیا ہے اور اسی حساب سے وہاں سیکورٹی کا بھی احتمالی سخت انتظام ہوگا۔“

کانڈو خالد نے کانڈو شیرخان سے کہا۔

”کانڈو ہارون آج رات کو لیڈر مین پوسٹ کی رہی اور سراغ رسائی کی مم پر نکلے گا۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ ہتھیار لا دو۔“

”کس قسم کے ہتھیار آپ لوگوں کو چاہیں؟“

کانڈو خالد نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”اس وقت صرف دو آٹومک مگر پلینر لگے ہوئے پتولوں کی ضرورت ہے۔ ایک ایک کانڈو چاقو بھی چاہیے۔ اس کے بعد جس قسم کے ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی تمہیں بتا دیں گے۔“

شیرخان نے کہا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دونوں آٹومک پتول پلینوں کے ساتھ اور دو کانڈو چاقو آپ کو شام سے پہلے مل جائیں گے۔“

کانڈو خالد نے کہا۔ ”ہمارے دو آدمی سراغ رسائی کی اس مم پر جائیں گے۔ ہمارے پاس اس مم پر جانے کے لیے مناسب لباس نہیں ہے۔ کانڈو لباس نہ سہی لیکن ہمیں نیلے یا سیاہ رنگ کی دو پتلونیں اور اسی رنگ کی دو قمیضیں ضرور چاہیں۔“

شیرخان بولا۔

”یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ کپڑے بھی مل جائیں گے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ جو کانڈو اس مم پر جا رہے ہیں انہیں دوادار کا ساحلی علاقے سے کوئی واقفیت بھی ہے یا نہیں؟“

اس پر مجاہد قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے تو گجراتی زبان نہیں آتی۔ قاسم گجراتی زبان بول لیتا ہے۔“

اس پر شیر خان نے ہنس کر کہا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم مون برت رکھ لیتا۔ یہ ظاہر کرنا کہ تم نے خاموشی کا برت رکھا ہوا ہے۔ جتنی سلوحوں عام طور پر خاموشی کا روزہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں گجرات میں خاموشی کا روزہ یعنی مون برت تو عورتیں اور مرد بچے میں ایک بار اپنے گھروں میں بھی رکھ لیتے ہیں۔“

کمانڈو خالد بولا۔

”یہ اچھی بات ہے۔ کمانڈو کرم داو خاموش رہے گا۔ قاسم ضرورت کے وقت وہاں کسی آرمی یا نیوی کے کشتی سپاہی سے آسنا سامنا ہو گیا تو ان سے گجراتی میں بات کر لے گا۔“

شیر خان نے کہا۔

”جین کے سلوحوں دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو بالکل الف ننگے رہتے ہیں۔ دوسری طرح کے سلوحوں سفید چادر جسم کے گرد لپیٹ لیتے ہیں۔ عام طور پر وہ سلوحوں والے لیے بے باک بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ جین مت کے پیڑھا مملویر نے ہاں نہیں بڑھائے ہوئے تھے۔ میں تم دونوں کے واسطے پرانی سفید چادریں لا دوں گا، جن کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر تم کالے ریشموں کی مالا میں گلے میں ڈال لینا اور پاؤں میں چنل پن لیتا۔ یہ لباس بالکل درست رہے گا۔“

اس کے بعد شیر خان چادریں لانے دکان پر چلا گیا۔ سراغ رسانی کے اس مشن پر صرف میں اور مجاہد قاسم جا رہے تھے۔ مجاہد قاسم کو اس لیے چنا گیا تھا کہ وہ اس علاقے سے بخوبی واقف بھی تھا اور گجراتی مراٹھی زبانیں روانی سے بول لیتا تھا اور میں اس لیے ساتھ جا رہا تھا کہ میں آرمی کا تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے لیڈرگن سائیک کا نقشہ دیکھا ہوا تھا اور بلو پرنٹ پر سب سے اونچی پہاڑی کی ڈگریاں، زاویے اور دوسرے اہم نشانات بھی یاد کر رکھے تھے۔ شیر خان دکان سے

ہمارے لیے دو سفید مگر پرانی چادریں لے کر آگیا۔ وہ ریشموں کی چھ سات مالا میں بھی لایا تھا۔ سفید روغن کی چھوٹی سی ڈبیا اس کے پاس تھی۔ ابھی دن کا وقت تھا۔ ہمیں دن کی روشنی میں ہی یہ سراغ رسانی کرنی تھی۔ میں نے اور مجاہد قاسم نے اپنے کپڑے اتار کر سفید چادریں جین سلوحوں کی طرح لپیٹ لیں۔ اس سلسلے میں شیر خان نے ہماری مدد کی۔ کیونکہ وہ جینی سلوحوں کو ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ اس نے ہمارے ہاتھوں اور بازوؤں پر سفید روغن سے لمبی لمبی تین تین لکیریں بنا دیں۔ یہ جین مت کے سلوحوں کا خاص نشان تھا۔ ہم نے گلے میں کالے ریشموں کی مالا میں بھی پن لیں۔ اس وقت ہمیں اپنے ساتھ آئیونک پتول یا کمانڈو چاقو لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ یہ سراغ رسانی کا مشن تھا۔ جب ہم پوری طرح سے جینی سلوحوں میں گلے تو شیر خان نے ہمارا پوری طرح سے جائزہ لیا اور بولا۔

”اب تم پورے جینی سلوحوں بن گئے ہو۔ ایک بات یاد رکھنا۔ جینی سلوحوں نہ گوشت کھاتے ہیں، نہ پھل، نہ پھل اور نہ کھاتے ہیں۔ جین مت کے پیڑھا کا نام دودھ تھا مگر سب اسے مادیہ کے لقب سے ہی یاد کرتے ہیں۔ دوار کا کہ ان تجربہ ساعلی پہاڑیوں میں کہیں کہیں مزدوروں کی جمو پڑیاں بھی ہیں۔ ان کی عورتوں نے تمہیں کھانے کو دی وغیرہ دیا تو لے لیتا۔ مگر پیڑھا انڈے اور گوشت کو ہاتھ نہ لگاتا۔“

کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

”شیر خان! اب ایسا ہے کہ ان دونوں کو وہ راستہ بتا دو جو یہاں سے دوار کا کی ساعلی پہاڑیوں کی طرف جاتا ہو۔ مجاہد قاسم تو اس علاقے سے واقف ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی ایسا راستہ بتاؤ جو شارت کٹ بھی ہو اور محفوظ بھی ہو۔“

شیر خان قاسم سے مخاطب ہوا۔ کیونکہ قاسم وہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے قاسم کو ایک خاص راستہ بتا دیا۔ قاسم بولا۔

”میں سمجھ گیا ہوں۔ آؤ کرم دادا! ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

میں نے کہا۔

”کیسے ہم ان پہاڑیوں میں راستہ تو نہیں بھول جائیں گے؟ ساری پہاڑی ایک ہی طرح کی لگتی ہیں۔“

مجاہد قاسم ہنستے ہوئے بولا۔

”سہارا لے! آپ اطمینان رکھیں۔ میں ان پہاڑیوں کی لومڑی ہوں، بس تم صرف یہ یاد رکھنا کہ تم نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ اگر کوئی آدمی یا عورت مل گئی تو خاموش رہنا۔ تم کوئی بات نہ کرنا۔“

میں نے کہا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“

”ہم چلتے چلے گئے۔ سارا علاقہ پہاڑی تھا مگر یہ ہمارے پاکستان کی پہاڑی علاقوں کی طرح نہیں تھا۔ یہ سمندری ساحل کا علاقہ تھا۔ پہاڑیاں خشک اور بخر تھیں۔ کہیں کہیں کوئی تازہ کا درخت پھل یا پل پوانچ کی طرح اوپر کو اٹھا ہوا نظر آ جاتا تھا۔ ارد گرد چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ زمین سے چار چار پانچ فٹ باہر کو نکلی ہوئی چٹانیں بھی تھیں۔ ہم کافی لمبا پتھر کٹ کر پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہاں کہیں کہیں گڑھوں میں پانی کھڑا تھا۔ یہ سمندر کا پانی تھا جو جوار بھاتا کے وقت وہاں آ گیا ہوا تھا۔ اب ہم ایک پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگے۔“

مجاہد قاسم کہنے لگے۔

”تھک تو نہیں گئے؟“

میں نے کہا۔

”میں سابق آدمی کلمتوں ہوں قاسم بھائی، تھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

وہ مسکراتے لگے۔ ہم ایک ٹیلے پر سے ہو کر دوسری طرف نشیب میں آ گئے۔

یہاں بھی گڑھوں میں سمندر کا پانی کھڑا تھا جو گندا ہو رہا تھا۔ اس کے آگے پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ اسی طرح ٹیلوں پر اترتے چڑھتے ہم نے ایک ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر

میں اور قاسم شیر خان کے پرانے مکان سے نکلے اور اس کے عقب میں جو چھوٹے چھوٹے پہاڑی بے اور گھٹیاں تھیں ان میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں اونچی نیچی بخر پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ہم جتنی سلوہوں کے لباس میں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ مجاہد قاسم نے پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ دوڑ کا کی ساحلی پہاڑیاں ہیں۔ ان کی دوسری طرف بھرہ عرب کا سمندر اور دوڑ کا کی نیوی کی بندرگاہ ہے۔“

پھر اس نے مجھے دور سے ایک پہاڑی دکھائی جو باقی تمام پہاڑیوں میں سے اونچی تھی۔ کہنے لگے۔

”یہ سب سے اونچی پہاڑی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہی گمن سہایت ہے۔ اسی جگہ لیزر گمن کی پوسٹ ہوگی، تمہارا کیا خیال ہے۔ تم نے تو اس گمن پوسٹ کو نقشے میں ضرور دیکھا ہوگا۔“

میں دن کی روشنی میں پہاڑی کو غور سے دیکھ رہا تھا مگر بیوپر پرنٹ اور اصل سہایت میں بڑا فرق ہوتا ہے اور اسے کوئی انجینئری پہچان سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو پہاڑی کے دامن میں جا کر ہی معلوم ہو سکے گا کہ یہی گمن پوسٹ ہے کیونکہ بیوپر پرنٹ کے نقشے میں جہاں تک میں سمجھ سکا تھا وہاں آئے سائے لال رنگ کے تیر بنائے ہوئے تھے۔ یہ تیرے میرے علم کے مطابق دو پہاڑی کھائیوں کی علامت ہیں۔ یہ کھائیاں سمندر کی جانب ہیں اور یہاں ضرور آدمی نے لیزر گمن کی حفاظت کے لیے یا تو چھوٹی توپیں نصب کر رکھی ہوں گی اور یا وہاں ہوائی حملے سے پہلو کے لیے ایٹمی انزکرافٹ گھسیں لگائی ہوئی ہوں گے۔“

مجاہد قاسم نے کہا۔

”یہ تم نے بڑی کار آمد اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں سمندر کی طرف سے پہاڑی کی طرف جانا چاہیے۔“

جھوپیڑی میں سے ایک پھنسا پڑا بولیا لے کر آگئی۔ بورے کو زمین پر بچھا دیا۔ قاسم نے مجھے بیٹھے کا اشارہ کیا۔ ہم الٹی پالٹی مار کر بیٹھ گئے۔ عورت نے بچے کو ہمارے آگے ڈال دیا اور گجراتی میں قاسم سے کچھ کہہ کر قاسم نے بوسے ملن اور پیچھے ہوئے سلوحوں کی طرح بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گجراتی زبان میں آئیر بلا دی۔ عورت نے کیلے کے پتے صاف کر کے اس پر کچھ دی ڈال کر ہمارے آگے رکھ دی اور خود دو زانو ہو کر سامنے ہاتھ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ قاسم نے مجھے کھانے کا اشارہ کیا۔ ہم کچھ کھانے لگے۔ قاسم گجراتی زبان میں عورت سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ ضرور وہ اس سے علاقے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم اس عورت کے پاس دو تین منٹ بیٹھے۔ پھر اٹھ کر ایک طرف چل پڑے۔ ذرا آگے جا کر میں نے مجاہد قاسم سے پوچھا۔

”عورت سے تم کیا باتیں کر رہے تھے؟“

وہ بولا۔

”اس عورت کا خلائق نیول دودی پر مزدوری کرتا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اوپر والی پہاڑی پر کسی کو جلانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے اسے کہا تھا ہم پہاڑی پر جا کر تپا کرنا چاہتے ہیں، وہ بولی، اوپر سلوحوں ہمارا ج بھی نہیں جلتے۔“

میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ لیزر گن کی پوزیشن اسی پہاڑی میں کسی جگہ پر ہے۔“

وہ بولا۔

”ہاں لیکن ان کہانیوں کا بھی سراغ لگانا ضروری ہے جہاں آرمی کی توپیں یا اسٹی انز کرافٹ گنیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی پوزیشن کی تصدیق کے بغیر ہمارا کسی طرف کو نکلنے چلے جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔

دوسری طرف دیکھا تو سامنے سبز رنگ کا سمندر حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ دور ایک دو جہاز بھی سمندر میں کھڑے تھے۔ قاسم کہنے لگا۔

”یہ بحیرہ عرب کا سمندر ہے۔“

وہ اپنی باتیں جاب دیکھنے لگا۔ ادھر سب سے اونچی پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے اسی پہاڑی کے اندر لیزر گن نصب ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

میں نے پہلے پہاڑی کو دیکھا۔ پھر دائیں بائیں زمین کے پہاڑی نشیب و فراز کا جائزہ لیا اور کہا۔

”مگر مجھے یہاں کہانیاں کہیں دکھائی نہیں دے رہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں بائیں جانب ان ٹیلوں کے ساتھ ساتھ کچھ آگے جانا چاہیے۔“

ہم بائیں جانب چل پڑے۔ ایک جگہ ٹیلوں کے درمیان تھوڑی سی کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں ایک جھوپیڑا تھا۔ جھوپیڑے کے باہر ایک عورت چولہے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی۔ اس کا رنگ دھڑنگ بچہ قریب سی ٹیکل رہا تھا۔ مجاہد قاسم نے مجھے آہستہ سے کہا۔

”تم بالکل نہ بولنا۔“

یہ کہہ کر وہ سلوحوں کی طرح بڑی بے نیازی سے قدم اٹھاتا ہوا جھوپیڑی کی طرف بڑھا۔ ہم جھوپیڑی کے پاس آگئے تو عورت نے لپٹ کر دیکھا اور سلوحوں کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اوپر عمر کی عورت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کے پاؤں چھوئے اور گجراتی میں کچھ کہہ کر اس کے جواب میں مجاہد قاسم نے بھی گجراتی زبان بولنی شروع کر دی۔ مجھے زیادہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ویسے گجراتی زبان کے کچھ لفظ اردو فارسی کے تھے جو میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ قاسم نے میری طرف اشارہ کر کے عورت کو کچھ کہہ کر ظاہر ہے یہی کہا ہو گا کہ میرے ساتھی نے مون برت رکھا ہوا ہے۔ عورت نے ہاتھ جوڑ کر میرے آگے سر جھکا دیا۔ جلدی سے

”لیکن ہم تو جین مت کے سلاحوں کے بھیں میں ہیں۔ کسی نے چپک کیا تو کہہ دیں گے کہ ہم باہر سے آئے ہوئے سلاحوں ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس طرف آنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

مجلد قاسم نے کہا۔

”لیکن تم ایک بات بھول گئے ہو کہ ہم دونوں مسلمان ہیں اور اپنے مسلمان ہونے کی ناقابل تردید نشانی اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ اگر آری یا نیوی کے عسکری سپاہیوں کو ہم پر ذرا سامیہی شک پڑ گیا کہ ہم دشمن کے جاسوس ہیں تو وہ سب سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ ہمارے ہتھے تو نہیں ہوئے اور ایک سیکنڈ میں سارا بھلاڑا پھوٹ جائے گا۔ اس لیے ہمیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور جان بوجھ کر ہمیں اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا ہوگا۔ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

میں یہ بات بھول ہی گیا تھا۔ مجلد قاسم نے عین وقت پر بڑی اہم اور خطرناک بات بتا دی تھی۔ میں نے کہا۔

”پھر کیا کرتے ہیں تم یہاں بیٹھو۔ میں نے یہاں کا نقشہ دیکھا ہوا ہے۔ میں نشیب میں اتر کر آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہاں کھائیاں نظر آجائیں۔“

قاسم کہنے لگا۔ ”لیکن تمہیں بے حد محتاط ہو کر جانا ہوگا اگر نیوی یا آری کے کسی سپاہی سے آمنہ سامنا ہو گیا تو بولنا بالکل نہیں۔ وہیں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں کمانڈر ہوں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

اور میں مجلد قاسم کو وہیں چھوڑ کر پہاڑی نشیب میں اتر گیا۔ سامنے دور تک سمندر ہی سمندر تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں بہت آہستہ آہستہ نشیب میں اتر رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔



میرے آگے پچاس قدموں کے فاصلے پر پہاڑی کی زمین پھر اونچی ہو گئی تھی اور آگے جھاڑیوں کی چھوٹی سی دیوار تھی۔ یہ آواز ان جھاڑیوں کی طرف سے آئی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے بظاہر بے حیازی سے چلا جھاڑیوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے جھاڑیوں میں سے دوسری طرف دیکھا۔ میرے خدا! جس چیز کی ہمیں تلاش تھی وہ میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خندق ٹائپ کی لمبی کھائی ہے جس میں ساتھ ساتھ دو دروازے ہیں۔ انڈین آرمی کے کالے کالے ٹائٹل کے دو تین سپاہی توپوں کے پاس بیٹھے گولوں میں چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ سوچ کر دوسری بار گہری نظر سے کھائی کا جائزہ لیا۔ یہ کھائی چھ سات فٹ گہری تھی اور نصف دائرے کی شکل میں پہاڑی کے ساتھ ساتھ آگے تک چلی گئی تھی۔ توپوں پر جال ڈال کر انہیں کیونفلاج کیا گیا تھا۔ یہ کل چھ توپیں تھیں جن کی ٹائیاں خندق یا کھائی سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور ان کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جس کو نقشے پر تیروں کے نشان سے ظاہر کیا گیا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا وہیں سے واپس آگیا اور مجلد قاسم کو توپوں کے بارے میں بتایا۔

وہ کہنے لگا۔

”تمہارا اندازہ صحیح تھا۔ یہ توپیں ساحل کے دفاع کے لیے ہیں یا اس لیے بھی ہیں کہ اگر لیزر گرن میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو ساحل کی طرف بڑھنے والے جہازوں پر

چار فوجی چڑھائی چڑھتے نظر آئے۔ انہوں نے سروں پر لکڑی کے بکس اٹھا رکھے تھے۔
قاسم نے آہستہ سے کہا۔

”کیس یہ ہماری طرف تو نہیں آرہے؟“

میں نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے، ہم نے لیزر گن سائٹ کا سراغ لگا لیا ہے۔ یہ فوجی سلائی لے کر گن سائٹ کے پیرامیٹر میں جا رہے ہیں۔ آڑ میں ہی رمنٹ کوئی بات نہ کرنا اور اپنے آپ کو چھپائے رکھنا۔“

چٹان کٹنی بڑی تھی جس کی اوٹ میں ہم چھپے ہوئے تھے۔ چاروں فوجی سپاہی بکس سروں پر اٹھائے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ وہ ہم سے زیادہ سے زیادہ سو گز کے فاصلے پر تھے۔ ہم بیٹھنے کی بجائے زمین پر لیٹ گئے تھے اور سر اٹھا کر چٹان کے کنارے پر سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ چاروں انڈین فوجی ہانپتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے جب ہم سے کٹنی اوپر چلے گئے تو ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہماری نگاہیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ چاروں سپاہی ایک قطار کی شکل میں اوپر جا رہے تھے۔ اوپر بھی اب دو سپاہی نظر آئے۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ دونوں فوجی پہاڑی دیوار کے کسی شگاف میں سے نکل کر باہر آئے تھے۔ ان میں سے ایک فوجی نے نیچے سے آنے والے فوجیوں کو جلدی اوپر آنے کا آرڈر دیا تھا۔ سپاہی ہانپتے ہانپتے اوپر پہنچ گئے۔ پھر اوپر والے دونوں فوجیوں کے ساتھ غائب ہو گئے۔ وہ غائب نہیں ہوئے تھے بلکہ پہاڑی کی دیوار میں جو غار یا شگاف تھا اس میں چلے گئے تھے۔ میں نے قاسم سے کہا۔

”قاسم! لیزر گن اسی پہاڑی کی دوسری طرف لگی ہوئی ہے۔ اس طرف غار کا دہانہ ہے۔ یہ غار دوسری طرف سمندر کے رخ پر چلی گئی ہے۔ لیزر گن دوسری جانب کسی بہت بڑی خندق میں نصب کی گئی ہے۔“

پہاڑی کے اوپر مجھے ایک جگہ ٹوٹری سی اوپر کو اٹھی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے قاسم کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”گولہ باری کی جاسکے۔“

میں نے کہا۔

”چھوٹی تو ہیں تو ہم نے تلاش کر لی ہیں۔ اب ہمیں بڑی گن کا سراغ لگانا ہے۔“

وہ کہنے لگا۔

”وہ سامنے والی پہاڑی پر ہی ہوگی لیکن گتا ہے کہ ہم ممنوعہ علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہاں کسی بھی وقت کوئی کسی طرف سے نکل کر ہمیں پکڑ سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔

”سامنے والی پہاڑی زیادہ بلندی پر نہیں ہے اور اس کی ڈھلان پر باہر نکلی ہوئی چٹانیں بھی ہیں جن کی آڑ ہمیں نظروں سے بچا سکتی ہے۔“

”تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ تم فوجی کمانڈر ہو۔“

عجلہ قاسم نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔

”ہم دشمن کی ٹاک کے بالکل نیچے آ گئے ہیں۔ اب ہمیں سراغ رسائی کا مشن مکمل کر کے ہی واپس جانا چاہیے۔ ہم پہاڑی کے اوپر جائیں گے اور اس طرح چڑھائی چڑھیں گے جیسے سلوو پہاڑوں پر بڑی بوٹیاں تلاش کرتے ہیں۔“

”اوکے۔ آ جاؤ مگر یاد رکھنا تم کوئی بات نہیں کرو گے۔“

ہم ایک دوسرے کے درمیان میں چار پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ہم جھک کر چل رہے تھے اور کسی وقت پتھروں کو زمین پر سے اٹھا کر دیکھ بھی لیتے تھے۔ ہم یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ سلوو لوگ ہیں اور بڑی بوٹیوں کی تلاش میں ہیں۔ چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں تھی لیکن وہاں جھانپاں بالکل نہیں تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین سے چٹانیں ضرور نکلی تھیں۔ ہم ان کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ جاتے اور جب دیکھتے کہ چاروں طرف کوئی فوجی نظر نہیں آ رہا تو دوبارہ چڑھائی چڑھنی شروع کر دیتے۔ ہم کٹنی چڑھائی چڑھ آئے تھے۔ ایک جگہ چٹان کے پیچھے چھپ کر سستا رہے تھے اور بائول کا جائزہ لے رہے تھے کہ نیچے سے ہمیں

قاسم نے ایک بار پھر بازو اٹھا کر بلند آواز میں کہا۔

”ہم ملویر کے داس ہیں۔ ان پہاڑیوں میں ہمارے ملویر جی بنگوان کی تہیا کرتے رہے ہیں۔ یہ جگہ ہمارے لیے پوتر ہے۔“

پہلے سپاہی نے کہا۔

”مہاراج! آپ اصر نہیں جاسکتے۔ آپ یہاں سے نیچے دوسری پہاڑیوں میں چلے جائیں وہاں جا کر سلامی لگالیں۔“

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جان چھوٹی۔ میں ایک طرف چل پڑا۔ قاسم جیسے میرے چلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔

”ست بچن، ست بچن۔ ہے ہو ملویر ملویر کی۔“

اور وہ بھی میرے پیچھے چلنے لگے ہم وہاں سے لہجی علاقے میں اتر گئے۔ مجاہد قاسم رک گیا۔ اس نے بازو اٹھا کر بے ملویر بے ملویر کا نعروں لگایا اور پیچھے دیکھنا۔ اصل میں وہ اس بہانے دیکھنا چاہتا تھا کہ سپاہی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہے۔ میں نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سپاہی نیلے کی چڑھائی چڑھتے دکھائی دیے۔ میں نے قاسم سے کہا۔

”تم تو بڑے اچھے اکثر ہو قاسم بھائی!“

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔

”میں نے ساری زندگی گجرات کاٹھیا واڑ میں گزاری ہے۔ ان لوگوں کے ذہن کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ لیکن سوچتا ہوں اگر ان کی جگہ مکھ یا گورکھا فوجی ہوتے تو پھر ہم چھن گئے ہتھے۔ کیونکہ ان پر ملویر جین کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ضرور ہمیں اینٹرو گیشن کے لیے پکڑ کر لے جاتے۔“

اسی طرح آپس میں باتیں کرتے ہم اس علاقے سے نکل کر دواد کا شہر کو جانے والی پتھری سڑک پر آ گئے۔ قاسم کہنے لگا۔

”اب ہمیں یہاں سے سیدھا شیر خان کے مکان پر نہیں جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہو کیونکہ ہم فوج کے ایک انتہائی حساس علاقے سے نکل کر آ رہے

”وہ دیکھو لیزر مگن کا ریڈار پہاڑی کے اوپر لگا ہوا ہے۔“

قاسم نے ریڈار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ ہمارا سراغ رسانی کا مشن مکمل ہو گیا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے“ میں نے سارے علاقے کی اہم جگہوں کو اپنے حسب سے ذہن میں نوٹ کر لیا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔“

اس وقت دن ڈھلنے لگا تھا۔ سورج دواد کا کی ساحلی پہاڑیوں کے اوپر نکلتا چلا جا رہا تھا۔ ہم جس طرف سے آئے تھے اسی طرف سے واپس چل پڑے۔ جب ہم پہاڑی ڈھلان سے اتر کر اس جگہ پر آئے جہاں پتھروں اور چٹانوں کے درمیان سمندری لہروں کا پانی جمع ہو گیا تھا تو ایک طرف سے دو فوجی سپاہی نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے ہمیں روک لیا۔ ایک فوجی نے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہا کرتے پھرتے ہیں۔ میں خاموش رہا کیونکہ میں نے یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں نے خاموشی کا روزہ یعنی مون برت رکھا ہوا ہے۔ مجاہد قاسم نے انہیں منہ نہ لیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ قاسم بڑا اچھا اداکار بھی ہے۔ وہ ہندوؤں کی دیوی دیوتوں اور سلوہو شیاہیوں کے بارے میں اور ان کی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے بازو اوپر اٹھا کر گجراتی زبان میں کوئی اشارہ کر دیا اور کہا۔

”ہم ملویر کے بھگت ہیں۔ دواد کا جی کے مندر کی یا ترا کرنے کے بعد یہاں گیاں دھیان کرنے آئے ہیں۔“

دونوں سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان پر مجاہد قاسم کے اپدیش کا اثر ہو گیا تھا۔ دوسرے سپاہی نے کہا۔

”مہاراج! آپ کو معلوم نہیں اور کسی کو آنے کی پریشان نہیں ہے۔ یہ سولیلین کے لیے آؤٹ آف ہاؤز علاقہ ہے۔“

ہمارے پاس کوئی بیٹھ۔ ہمیں آپس میں باتیں بھی کرنی تھیں۔ قاسم نے اسے گجراتی میں کچھ کہہ وہ آدمی رونے لگا۔ اس نے روتے ہوئے گجراتی میں کوئی جواب دیا اور قاسم کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ ان کے درمیان گجراتی زبان میں کچھ مکالمے ہوئے اور وہ آدمی اٹھ کر اپنے آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔ درمیانی عمر کا دھلا پتلا آدمی تھا۔ رنگ کھٹا ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے مجاہد قاسم سے پوچھا۔

”یہ آدمی کیا کہہ رہا تھا؟“

قاسم نے کہا۔

”کرم داد بھائی! ان دہائی لوگوں کے بڑے مسئلے ہوتے ہیں۔ کتنا تھا میں غریب ہوں۔ روزگار نہیں ملکہ ساہوکار سے قرض لیا تھا اب وہ تنگ کرتا ہے۔ کتنا ہے قرض مع سود واپس کرو یا اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔“

میں نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کی اور اپنے منہ کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ میں نے مجاہد قاسم سے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے ہمیں رات کو کس وقت اس طرف آنا چاہیے۔“

وہ بولا۔

”آدھی رات کے بعد کا وقت ٹھیک رہے گا۔ اس وقت گشت کرنے والے سڑکیوں پر بھی نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور ان سے غفلت ہو سکتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اب کسی دوسرے راستے سے لیزر گن پوسٹ والی پہاڑی پر جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس طرف سیکورٹی زیادہ ہو کیونکہ توپوں کے بکتر بھی اسی طرف ہیں۔“

مجاہد قاسم بولا۔

”پہاڑی کے اوپر جانے کا صرف یہی ایک محفوظ راستہ ہے۔ دوسرا راستہ سمندر کی طرف سے ہے جو اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہاں سیکورٹی بھی سخت ہوگی اور

ہیں۔“

”تو پھر کیا کریں؟“ میں نے پوچھا۔

قاسم بولا۔

”میں قدم قدم پر جین مندر ہیں۔ کسی مندر میں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب اندھیرا ہوگا تو شیر خان کے گھر کی طرف چلے جائیں گے۔“

قاسم ان جگہوں کو خوب جانتا ہے۔ وہ قریب ہی پتیل کے ایک درخت کے پاس لے گیا جس کے نیچے ایک تیل کی مورتی لگی تھی۔ تیل کے اوپر ایک آدمی سوار تھا۔ وہاں صرف ایک بوڑھی عورت جھاڑو دے رہی تھی۔ گائے اور تیل تو میں نے ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں شتر بے ہمار کی طرح سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھتے تھے۔ ہمارے شہر میں اس طرح کوئی لا وارث تیل پھرتا نظر آئے تو دوسرے لمبے وہ بوڑھے خانے پہنچ جائے مگر بھارت کے شہروں میں تو تیل اور گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ گائے کو ہندو گڑ مانا کرتے ہیں۔ تیل پر چونکہ دیوتا شو ساری کرتا تھا اس لیے اسے بھی مقدس سمجھا جاتا ہے۔ جنوبی اور بھارت کے مغربی علاقے میں تو کوئی تیل بازار میں نظر آجائے تو لوگ اسے دودھ پلاتے ہیں۔ لڈو کھاتے ہیں۔ اس پر ہار ڈالتے ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح کے ایک تیل کی مورتی پتیل کے درخت تلے نصب تھی۔ درخت میرے خیال میں پتیل کا ہی تھا۔ اگرچہ اس علاقے میں پتیل تقریباً ختم نہ ہونے کے برابر ہے۔ عورت نے دو جینی سلوہوں کو آتے دیکھا تو جھاڑو چھوڑ کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ مجاہد قاسم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گجراتی زبان میں آشریادی اور ہم تیل کی مورتی کے پاس اتنی پابندی مار کر بیٹھ گئے۔

ہمیں دن ڈوبنے کا انتظار تھا کہ ذرا اندھیرا ہو تو ہم وہاں سے شیر خان کے گھر کی طرف چلیں۔ دو جینی سلوہوں کو تیل کی مورتی کے پاس بیٹھے دیکھ کر دو تین دہائی مزدور ٹائپ کے لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ہمارے پاؤں چھو کر ان میں سے دو تو اٹھ کر چلے گئے۔ ایک وہاں ہاتھ باندھے بڑے ادب سے بیٹھا رہا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ

”یہ علاقہ میرے ذہن میں ہے تم بے فکر رہو۔“

ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ ہم شیرخان کے گھر اندھیرا ہو جانے کے بعد جانا چاہتے تھے۔ یہ سارا علاقہ ایسا تھا کہ کہیں خشکی تھی اور کہیں پانی جمع تھا اور کہیں دلدل سی بنی ہوئی تھی۔ قاسم ایک بت بڑے پتھر کی لوٹ میں مجھے ساتھ لے کر بیٹھ گیا۔ یہاں آس پاس کوئی انسان نہیں تھا۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے اپنے رات والے مشن کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ پھر سورج مغرب کی جانب دوار کا کی ساحلی پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا اور اندھیرا چھانے لگا۔ جب کافی اندھیرا ہو گیا تو ہم اٹھ کر شیرخان کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں شیرخان کے علاوہ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون بھی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔
”مشن کیسا رہا کرم داد؟“
میں نے کہا۔

”سراو کے۔“

پھر ہم نے انہیں ساری روئیدار سنائی اور بتایا کہ جہاں بڑی لیزر گن کی پوسٹ ہے وہاں تک دن کی روشنی میں ہم نہیں جا سکتے۔ کمانڈو خالد نے پوچھا۔
”کھائی میں تو ہیں کس قسم کی تھیں۔ تم آرمی کے آدمی ہو۔ تمہیں تو ان کی شناخت ہوگی۔“

یہ سوال کمانڈو خالد نے مجھ سے کیا تھا۔ میں نے کہا۔

”جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ فیلڈ گنیں ہیں ان کی مار کافی دور تک ہے۔ وہاں دونوں جانب مشین گنتوں کی چوکیاں بھی ہیں۔“

کمانڈو ہارون کہنے لگا۔

”ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ ہم ان توپوں کو بھی اڑا سکیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی ساری توجہ بڑی لیزر گن پوسٹ پر دینی چاہیے۔ کیونکہ یہی ہمارا

وہلان پر ہو سکتا ہے نیوی کی مشین گن چوکیاں بھی ہوں۔ اس لیے ہم اسی راستے سے پہاڑی پر چڑھیں گے۔ آگے چڑھائی زیادہ نہیں ہے۔“
”ہمیں اپنے ساتھ ہتھیار ضرور رکھنے ہوں گے۔“
”ایک ایک چاقو اور آٹھ چمک پتول کافی ہوگا۔“
عجلہ قاسم نے کہا۔

”کیونکہ یہ ہمارا کمانڈو آپریشن نہیں ہے۔ یہ ریکی مشن ہے۔ ہمیں مارگٹ کی نشان دہی کرنی ہے۔“

میں خاموش رہا۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک عورت ہمارے لیے مٹی کے پیالے میں دہی لے کر آئی۔ دہی کا پیالہ اس نے ہمارے آگے رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

”مہاراجا مجھے آئیر ہلڈ دیکھئے۔ میرے بچے کو گودی پر نوکری مل جائے۔“

عجلہ قاسم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
”ہم جاہنگوان مہلو پر تیرے بچے کو روزگار پر لگا دیں گے۔ اب تو جا۔“

عورت چلی گئی۔ قاسم کہنے لگا۔
”یہ لوگ انتہائی توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد ہیں۔ جب تک ہم یہاں بیٹھے رہے یہ کسی نہ کسی طرف سے نکل کر یہاں آتے رہیں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے اور یہاں سے نکل پڑنا چاہیے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تیل کی موتی والے درخت کے قریب سے ایک پتھر پلا رستہ پتھروں اور سوکھی گھاس کے درمیان سے گزرتا کھاڑی کی طرف جاتا تھا۔ ہم اس پر چلنے لگے۔ قاسم بولا۔

”تم ہی اس سارے علاقے کو یاد کر لو۔ کچھ پتہ نہیں رات کس قسم کے حالات بن جائیں اور تمہیں اس طرف اکیلا آنا پڑ جائے۔“
میں نے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”دو آئینک پتول جن پر سلیسز کی ٹاپیاں لگی ہوں اور ایک ایک کمانڈو چاقو کافی رہیں گی۔ کیونکہ ہم دیکھ بھال اور ریکی مہم پر جا رہے ہیں۔ مگن پوسٹ اڑانے کے لیے کس قسم کے اسلحہ کی ضرورت ہوگی۔ یہ مگن پوزیشن دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”میرا خیال ہے رات کے وقت آپ لوگوں کو ساحروں کے بجیس میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ٹارل کمانڈو لباس میں جائیں گے۔“

مجاہد قاسم بولا۔

”ہاں کمانڈو لباس کی سیاہ چٹول اور جیکٹ ہمیں اندھیرے میں چھپائے رکھی گی، جتنی ساحروں والا سفید لباس دور سے نظر آ سکتا ہے۔“

”تو پھر تیاریاں شروع کر دو۔“ خالد نے کہا۔

ہارون بولا۔

”پہلے کچھ کھانی اور تم کس وقت یہاں سے نکلتا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آدھی رات کے بعد یہاں سے نکلیں۔ وہ وقت نیند کے غلبے کا وقت ہوتا ہے اور سیکورٹی گارڈز کسی حد تک غافل ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ جنگی صورت حال نہیں ہے۔ ابھی حالات ٹارل ہیں۔“

شیر خان اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں کھانے کا بندوبست بھی کرتا ہوں اور ہتھیاروں کا بھی انتظام کرتا ہوں۔“

شیر خان مکان سے باہر چلا گیا۔ میں ہارون، خالد اور قاسم سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور رات کی سراسر مانی مہم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

”تم لوگوں کو وہاں کوئی مشتبہ شخص تو نہیں ملا؟“

ٹارگٹ ہے۔ کیونکہ یہ ہمارا کمانڈو مشن ہے ہم کسی فوجی کیمپ پر فوجی حملہ نہیں کرنے جا رہے۔“

کمانڈو خالد نے ہارون کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اس کے واسطے ہمیں بڑی لیزر مگن پوسٹ کی پوری پوزیشن کا علم ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا۔

”یہ پوزیشن ہم انشاء اللہ آج رات معلوم کر کے ہی آئیں گے۔ دن کی روشنی میں مگن پوسٹ کی پہاڑی کی طرف جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ وہاں سیکورٹی بڑی سخت ہونے کا امکان ہے۔“

کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

”کرم داد! تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ اس صورت حال میں ہمیں کس قسم کا اسلحہ ساتھ لے کر جانا ہوگا؟“

میں نے کہا۔

”کمانڈو! اس کا فیصلہ تو مگن پوزیشن اور وہاں کی سیکورٹی اور حالات کو دیکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ کمانڈو خالد بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے تم دونوں رات کے اندھیرے میں مگن پوزیشن کا درست اندازہ لگا سکو گے؟“

میں نے کہا۔

”میں آرمی کا آدمی ہوں۔ توپوں کے ڈیپلے سسٹم کی شناخت کر سکتا ہوں۔ لیکن ہمیں رات کے وقت اس مہم پر جاتے ہوئے ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی۔“

شیر خان بولا۔

”جو اسلحہ ہمیں یہاں میسر ہے وہ ہم آپ لوگوں کو دے دیں گے۔ تم نے کہا تھا کہ ہمیں آئینک پتولوں کی ضرورت ہوگی۔“

میرے پستول کے اور بارہ رائونڈ قاسم کے پستول کے بت کافی ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کمائڈو چاقو بھی ہوں گے۔ ہماری یہی کوشش ہوگی کہ کمائڈو چاقو سے کام لیا جائے پستول کا فائر وہاں ہوگا جہاں ضروری ہوگا۔

کمائڈو خالد میری بات کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب میں اپنی بات مکمل کر چکا تو اس نے کہا۔

”کیا خیال ہے کرم دادا! تمہارے ساتھ ہارون نہ چلا جائے؟“

میں نے کہا۔

”کمائڈو! میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارا کمائڈو آپریشن نہیں ہے۔ صرف رکئی مشن ہے اور اس وقت صرف میں اور قاسم ہی دو ایسے کمائڈو ہیں جو علاقے کی پہاڑیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہارون کے لیے علاقہ ایٹمی ہوگا اس لیے ابھی ہم دونوں ہی کافی ہیں۔ ہاں کمائڈو آپریشن کے وقت وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگا اور آپ بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔“

ہارون بولا۔

”کرم دادا! ٹھیک کہتا ہے کمائڈو! ابھی ان دونوں کو ہی جانا چاہیے۔“

”اوکے۔ اوکے۔“ خالد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کے بعد ہم کھانا کھانے لگے۔ اس دوران شیر خان نے چائے تیار کر لی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور شروع ہو گیا۔ ہم چائے بھی پیتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ رات گزرتی چلی گئی۔ پھر رات کے بارہ بج گئے۔ تب کمائڈو خالد نے کہا۔

”تم لوگ تیار ہو جاؤ وقت ہو گیا ہے۔“

ہم نے منہ ہاتھ دھویا۔ ماتھے پر گے ہوئے عین مت کے سفید نشانوں کو اچھی طرح سے صاف کیا۔ وضو کر کے دو نفل ادا کیے۔ اللہ کے حضور مم کی کامیابی کی دعا مانگی اور سیاہ پتلون اور سیاہ جیکٹیں پہن لیں۔ کمائڈو چاقو ہم نے پتلون کی جیبوں میں

کمائڈو قاسم نے کہا۔

”کوئی نہیں۔ ایک عورت ملی تھی۔ دو تین آدمی ملے تھے اور ہاں یاد آ گیا۔“

جیرانی کی بات ہے کہ ہم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ جب ہم کھائی والی توپوں کی پوزیشن سے واپس آ رہے تھے تو ہمارا دو ایڈمن سپاہیوں سے آمنہ سامنا ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ نہ مجھے یاد رہا تھا نہ قاسم کو ہی اس کا خیال آیا تھا۔ دراصل وہاں دوسری اہم باتوں پر اتنی جلدی جلدی بحث ہونے لگی تھی کہ یہ واقعہ ذہن سے نکل گیا تھا۔ جب ہم نے اس کا ذکر کیا تو کمائڈو خالد نے کہا۔

”اب تمہیں زیادہ جھگڑا دینے کی ضرورت ہے۔ تمہیں رات کو اس طرف سے نہیں جانا ہوگا۔“

پھر اس نے قاسم سے پوچھا۔

”قاسم! کیا پہاڑی پر جانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی ایسا راستہ جو توپوں والے بکرے سے بچ کر ہو؟“

قاسم بولا۔

”کمائڈو! دوسرا راستہ سمندر کی طرف سے ہے۔ جہاں میں سمجھتا ہوں کہ سیکورٹی زیادہ سخت ہوگی اور مشین گنوں کے خفیہ مورچے بھی ہو سکتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو میں اور کمائڈو کرم دادا توپوں سے کافی دور ہو کر پہاڑی پر جائیں گے۔ میں ان پہاڑیوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور دن کے وقت بھی انہیں اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔“

”اگر تم سمجھو ہو تو ٹھیک ہے۔“ خالد نے آہستہ سے کہا۔

شیر خان ایک گھنٹے بعد آیا۔ وہ تیلی میں ہمارے لیے کھانا بھی لایا تھا اور ہتھیار بھی لایا تھا۔ میں نے آٹومیک پستولوں کو چیک کیا۔ بارہ رائونڈ کے پستول تھے۔ سلیسر کی ٹالی کو کھول کر دوبارہ فٹ کیا۔ فائو میگزین کے چار بیک بھی تھے۔ میں نے کہا۔

”فائو میگزین کی ہمیں شاید ضرورت نہ پڑے۔ یہ بیک بیٹیں رہنے دو۔ بارہ رائونڈ

سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر مجھے دو دروازوں کی ساحلی پہاڑیاں نیم روشن آسمان کے پس منظر میں دکھائی دینے لگیں۔ ہمارا رخ بھی اسی طرف ہو گیا۔ ہمیں پہاڑیوں کے دامن میں پہنچنے پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ہماری نگاہیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ علاقہ بھی میرا جانا پہچانا تھا۔

ایک جگہ سے زمین بلند ہو رہی تھی۔ دائیں جانب پتھروں کے درمیان سمندری لہروں کا چھوڑا ہوا پانی بھی وسندلا وسندلا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجاہد قاسم رک گیا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں علاقے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”سامنے والے ٹیلے کا راستہ کھائی میں لگی ہوئی توپوں کی طرف جاتا ہے۔ ہمیں یہاں سے دائیں جانب چلنا ہوگا۔“
 میں نے آہستہ سے پوچھا۔
 ”تم اپنے حسب سے ٹھیک راستے پر چل رہے ہو ناں؟“
 ”انشاء اللہ۔“

یہ کہہ کر قاسم دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ پہاڑیوں کے دامن کا علاقہ تھا۔ ہم چھوٹے بڑے پتھروں اور چٹانوں میں سے گزر رہے تھے۔ اندھیرے میں ہم دیر تک چلتے رہے۔ قاسم ایک جگہ ٹیلے کی چڑھائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

”تھوڑی سی چڑھائی کے بعد گرن پوسٹ والی پہاڑی شروع ہو جائے گی۔ اب ہمیں بڑی احتیاط کرنی ہوگی۔ ہمیں کھائی سے آگے روکنا ہوگا۔ چھینک آئے تو اسے بھی دہانا ہوگا۔ ہم انتہائی ضرورت کے وقت صرف سرگوشی میں بات کریں گے۔“
 اوکے؟

”اوکے“ میں نے جواب دیا۔

مجاہد قاسم نے آہستہ سے بسم اللہ پڑھی اور چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔ چڑھائی

رکھ لیے اور پتھروں جیکٹ کی جیبوں میں اس طرح رکھ لیے کہ وقت پڑنے پر انہیں بڑی آسانی سے نکالا جا سکا تھا۔ ہم نے چپیلیں اتار کر ریو کے نواہری رنگ کے جوگر شوڈ پہن لیے تھے۔ میں نے اور کمانڈو قاسم نے اپنی اپنی گھڑیوں پر وقت ملا لیا۔ رات کے ٹھیک بارہ بج کر دس منٹ پر ہم شیرخان کے مکان سے نکل کر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میں سناپ کے روپ میں ہوتا تو اس اندھیرے میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں میں سناپ کی شکل نہ اختیار کر لوں۔ اس وقت اس امر کی ضرورت تھی کہ انسانی شکل میں ہی رہوں۔ کیونکہ بڑی لیڈر گن پوزیشن کی ایک ایک تفصیل کو دیکھنا اور ازبر کرنا تھا۔ سناپ کے روپ کی ضرورت کمانڈو مشن پر جاتے ہوئے پڑ سکتی تھی۔ لیکن میرے جسم کی حالت بالکل نارمل تھی۔ اور لگتا تھا کہ اب میں کلنی عرصے تک انسانی شکل میں ہی رہوں گا۔ مجھے ناگن درگا کا خیال آنے لگا۔ اسے میری اشد ضرورت تھی مگر میں اس سے دور تھا۔ خدا جانے وہ سناپ کی شکل میں کبھی پچھی ہوئی ہوگی۔ واپس ککشن پور جانا اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ میں اس سے بچوٹیل شہر کے نواح میں بھیروں جی کے مندر کے پاس جدا ہوا تھا۔ وہاں سے ککشن پور کئی دنوں کے سفر پر تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بھیروں جی کے مندر میں ہی کسی جگہ میرے انتظار میں چھپ کر بیٹھ گئی ہو۔ اسے میری بوجھ نہیں آ رہی ہوگی کیونکہ میں اس سے کلنی دور تھا۔ سناپ دوسرے سناپ کی بوتلاتی دور سے سو گھنٹے لیتا ہے مگر انسان کی بو ہزار میل سے محسوس نہیں کر سکتا۔

میں یہی سوچتا ہوا مجاہد قاسم کے ساتھ اندھیرے میں چلا جا رہا تھا۔ ہم اندھیرے میں بہت دیکھ بھل کر چل رہے تھے۔ مجاہد قاسم اسی راستے سے مجھے لے جا رہا تھا جس راستے سے ہم دن کے وقت گئے تھے۔ ایک گھنٹے تک ہم چلتے رہے۔ آسمان بلوں سے خالی تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ ستاروں کی دھیمی سی روشنی آسمان پر مشرق

میں پانچ چھ قدم کے فاصلے پر تھا اور ہم اس طرح اوپر چڑھ رہے تھے جس طرح کبھی میں سلاپ کی طرح رینگ کر چڑھائی چڑھا کرتا تھا۔

میں اوپر کو اٹھی ہوئی چھوٹی چھوٹی چٹائیں، پتھر اور نشیب تھے۔ ایک جگہ قاسم رینگتے ہوئے رک گیا۔ میں بھی رک گیا۔ اس نے بازو کے خاص اشارے سے ایک چٹان مجھے دکھائی اور خاص اشارے کا سٹل دیا۔ میں پیچھے سے ہو کر رہنگتا ہوا اس کی دائیں جانب آگیا۔ دس قدم کے فاصلے پر ایک اونچی جگہ تھی۔ مجاہد قاسم نے میرے کان کے قریب منہ لاکر سرگوشی کی۔

”یہ مشین گن پوسٹ ہے۔ اس کو ذہن میں یاد رکھنا۔“

ہم بھی آگے گئے تو وہاں بھی دائیں بائیں ہمیں دو اسی طرح کی مشین گن پوسٹیں نظر آئیں۔ ہم کیڑے کوڑوں کی طرح دم مارتے رینگتے ہوئے ان کے درمیان سے گزر گئے۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں یہاں انڈین آرمی نے بارودی سرنگیں نہ بچھائی ہوئی ہوں۔ انہیں ایسا کرنا چاہیے تھا مگر شاید انہوں نے اس خیال سے ایسا نہیں کیا تھا کہ وہاں تک ساحلی فوجوں کی وجہ سے کوئی جنگی جہاز اپنی انفنٹری لے کر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہم ’دوخی سلاپ‘ کی طرح سانس روکے مشین گن پوسٹ کی تین فٹ اونچی دیوار کے بالکل قریب سے ہو کر نکل گئے۔ یہ بڑی خطرناک گھڑی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر ہم پر قیامت ٹوٹ سکتی تھی۔

مشین گن پوسٹ کی دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر رینگتے ہوئے مجھے پوسٹ کے اندر سے گریٹ کے دھوئیں کی بو بھی آ رہی تھی۔ ہم رینگتے ہوئے آگے نکل گئے۔ قاسم بالکل زگ زبگ سا ہاتھ تھا آگے لے جا رہا تھا۔ ہم پہاڑی کی چوٹی کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ ابھی تک ہم اس لیے سیکورٹی گارڈز کی نگاہوں سے بچے ہوئے تھے کہ ایک تو رات کی تاریکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی دوسرے پہاڑی ڈھلان پر پتھروں کی آڑیں اور گمرائیاں بہت تھیں۔ جھاڑیاں نہیں کہیں ہی تھیں۔ قاسم ایک پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس دیک کر بیٹھ گیا۔

سیدھی نہیں تھی۔ پھر بھی ہمیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ مجاہد قاسم ایک بار پھر رک گیا اور میرے کان میں کہنے لگا۔

”پاؤں اس طرح رکھنا کہ کوئی پتھر نیچے نہ لڑھک جائے۔ پتھروں پر چلنے کی آواز بھی نہیں آنی چاہیے۔“

میں نے اس کے کان میں کہا۔
”فکر نہیں۔“

ہم سنبھل سنبھل کر دبا دبا کر پاؤں رکھتے ٹیلے کی چڑھائی چڑھ گئے۔ ہمارے سامنے ایک پیالے کی طرح کا چھوٹا سا نشیب تھا۔ ہم وہیں ٹیلے کے کنارے بیٹھ گئے۔ قاسم کی نگاہیں سامنے والی پہاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔
”یہ سامنے والی پہاڑی ہمارا ٹارگٹ ہے۔ پستول تیار رکھو لیکن ہاتھ میں چاقو پکڑو۔“

ہم نے بیٹیکوں کی جیبوں میں سے اپنے اپنے پستول نکل کر اپنے حلق سے انہیں بغیر آواز پیدا کیے چمک کیا۔ انہیں والیں جیبوں میں رکھا اور کمانڈو چاقو کھول کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ مجاہد قاسم نے میرے کان کے پاس آ کر کہا۔
”تم میری بائیں جانب پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر ساتھ ساتھ چلو گے۔ تم ٹریڈ بیری کمانڈو ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ کیسے چلنا ہوگا۔ یہ سمجھ لو کہ ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔“

ہم نے اپنے درمیان میں چھ قدم کا فاصلہ ڈال لیا اور نشیب میں اتر کر اندر سے اور رات کے سانے میں چوکنے ہو کر جھک کر چلنے لگے۔ پہاڑی کی ڈھلان پر ہم نہ اوپر چڑھ رہے تھے نہ نیچے اتر رہے تھے۔ ہم ہلو کی طرف سے ہو کر سیدھے چل رہے تھے۔ یہ رستہ قاسم کا بنانا چھپانا لگتا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں ستاروں کی روشنی میں سامنے پھیلا ہوا بحیرہ عرب کا سمندر نظر آنے لگا۔ ہم پہاڑی کی سمندر والی سلائیڈ پر آگے تھے۔ یہاں سے قاسم آہستہ آہستہ پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ میں اس کے پہلو

تھے کیونکہ ہم سرراغ رسانی کے مشن پر تھے۔ مکائنڈو آپریشن کے لیے نہیں آئے تھے۔ اگر عسکری سفارتوں میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بھی ہلاک کر دیتے تو ہمیں تو کوئی فائدہ نہ پہنچتا تھا مگر ان کی لاشیں ملنے پر پوسٹ کی کارڈ الرٹ ہو جاتی اور سیکورٹی بھی انتہائی سخت کر دی جاتی۔ اور ہمارا مکائنڈو آپریشن کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔

دونوں سفارتوں ایک دوسرے سے دہلی آواز میں باتیں کرتے ہمارے بالکل اوپر سے گزر گئے۔ اوپر سے مراد یہ ہے کہ جس پتھری آڑ میں ہم چھپے ہوئے تھے وہ اس کے بالکل قریب سے گزر گئے۔ وہاں ڈھلان پر چھوٹی سی پلینڈری بنی ہوئی تھی۔ جب وہ دور چلے گئے تو میں نے مجاہد قاسم کے کان میں کہا۔

”یہ سفارتی واپس بھی آئیں گے ہمیں ان سے خبردار رہنا ہوگا۔“

قاسم اوپر پہاڑی شگاف کو دیکھ رہا تھا جہاں روشنی تھی۔ کہنے لگا۔

”ہمیں یہاں سے دوسری طرف رینگ کر اوپر جانا ہے۔ لیزر گن کو دیکھ کر نشان

دہی ضروری ہے۔“

میں بھی اوپر دیکھ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”دوسری طرف مشین گن کے مورچے ضرور ہوں گے۔“

اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”ہم چوکس ہو کر جائیں گے۔ لیزر گن کی نشان دہی ضروری ہے۔ ہم اللہ پڑھ

کر آجائے۔“

ہم اپنی دائیں جانب پہاڑی ڈھلان کے متوازی رینگنے لگے۔ ابھی تک ہم صرف اس لیے بچے ہوئے تھے کہ یہ جگہ پاکستان سے بہت دور تھی اور سمندر میں انڈین نیوی کے جنگی جہاز بھی موجود تھے اور آج تک وہاں مکائنڈو آپریشن کی کوئی واردات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہاں اتنی سخت اور گنجان سیکورٹی نہیں تھی۔ انڈین نیوی اور آرمی نے بڑی گن پوسٹ کے آس پاس سیکورٹی کی خاطر چند ایک مشین گن پوسٹیں ہی کافی سمجھی تھیں۔ ان کے علاوہ نیچے شیش یا کھائی میں نصب توپیں اور چوٹی پر طیارہ

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اوپر اشارہ کیا۔

میں نے اوپر دیکھا وہاں ایک شگاف میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آرہی تھی۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”یہاں لیزر گن نصب ہے، یہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔“

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”اس پوسٹ کے عسکری سفارتی ضرور ہوں گے۔ وہ یہاں دکھائی نہیں دے

رہے۔“

مجاہد قاسم اس بات کو زیادہ نہ سمجھ سکا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے کان میں سرگوشی کر کے سمجھایا کہ دفاعی مورچوں کی گن پوسٹوں پر رات کو سپاہی دو دو تین تین کی ٹولیاں میں پھڑول کرتے ہیں۔ ان کو عسکری پھڑول کہا جاتا ہے۔ ابھی یہ بات میرے منہ میں ہی تھی کہ ہمیں اپنے دائیں جانب کسی کے ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی۔ میں نے مجاہد قاسم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دیں نیچے کیا اور خود بھی زمین کے ساتھ اونڈھا ہو کر لگ گیا۔ میری نظریں اپنی دائیں جانب لگی ہوئی تھیں، چدر پہاڑی ڈھلان پر ستاروں کی دھندلا روشنی میں دو آدمی چلے آ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ وہ سیدھے ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں پریشان ہوا میں نے قاسم کے کان میں صرف اتنی سرگوشی کی۔

”ان پر حملہ نہ کرنا۔“

مجھے ذرہ تھا کہ جوش میں آکر قاسم ان پر اس خیال سے چاقو سے حملہ نہ کر دے کہ ایک کو وہ سنبھال لے گا اور دوسرے کو میں ہلاک کر دوں گا۔ بعد میں قاسم نے مجھے بتایا کہ اگر تم مجھے منع نہ کرتے تو میں نے یہی طے کر لیا تھا کہ ایک فوجی کو میں دبوچ کر ہلاک کر دوں گا اور دوسرے کو تم جہنم رسید کر دو گے۔ جب دونوں آدمی قریب آئے تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ دونوں انڈین سپاہی تھے جو رات کے وقت عسکری ڈیوٹی پر تھے۔ اس وقت کسی بھی بھارتی فوجی کو ہلاک کرنے کی پوزیشن میں نہیں

کن بڑی لیزر گن کی قلعہ بندی کے دہانے پر پہنچ کر ایک بار میں بھی خوف زدہ ہو گیا تھا۔

میں چونکہ آرمی کا سابق کمانڈو تھا لیکن یہ خوف ایک لمحے کے لیے اس لیے بھی طاری ہو گیا تھا کہ مجھے فوج کو چھوڑے کی سال ہو گئے تھے اور فوجی زندگی کی مجھے عادت نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے دوسرے ہی لمحے اپنے آپ پر قابو پایا۔ ڈر خوف کو دل سے نکل کر ہیٹنگ دیا اور اللہ کا نام لے کر دہانے میں سے سر ذرا سا اوپر کر کے شگاف میں دیکھا۔ یہاں پہاڑی کھود کر ایک غار بنا دیا گیا تھا۔ شگاف سے پانچ سات فٹ کے فاصلے پر ایک بہت بڑی مشین ٹائپ کی گن نصب تھی۔ گن کی ٹنلی چمک رہی تھی۔ ٹنلی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ دیواروں پر بلب کی روشنی میں مختلف ڈائریکٹریں نظر آ رہے تھے۔ ایک فوجی جوان گن کے اوپر لگے ہوئے ایک ڈائریکٹری کو سفید کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ برین گن اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ میری نگاہ شگاف کے سامنے والے دہانے پر پڑی تو مجھے مجاہد قاسم کا سر دکھائی دیا۔ وہ بھی سر اوپر کیے فوجی کو دیکھ رہا تھا۔ یہی بھارتی فوجی ہائی کلن کا وہ خطرناک ترین ہتھیار یعنی لیزر گن تھی کہ جس کے بل بوتے پر بھارت کراچی پر حملہ کرنے کے منصوبے تیار کر چکا تھا۔

ایک اور فوجی دوسری طرف سے اندر آ گیا۔ اس نے پہلے فوجی سے شاید مراعاتی زبان میں کوئی مذاق کیا جس کے جواب میں پہلے فوجی نے ہنس کر اسے کوئی جواب دیا۔ میں نے دہانے کی دوسری طرف قاسم کو دیکھا۔ اس نے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ ہم دونوں وہیں سے نیچے ہو کر دیک گئے۔ اب ہمیں واپس جانا تھا۔ ہم نے ٹارگٹ دیکھ لیا تھا۔ ہمارا سراسر مالی کامشن مکمل ہو چکا تھا۔ واپسی کی مہم زیادہ خطرناک تھی۔ آتی دفعہ تو ہم پہاڑی پر پیٹ کے بل ریٹکتے ہوئے آتے تھے۔ جاتی دفعہ ہم ریک کر نہیں جا سکتے تھے۔ اترائی پر ہمیں بیٹھ کر ہی واپس جانا تھا۔ یہ خطرناک عمل تھا لیکن راستے کی نشان دہی چونکہ ہم کر چکے تھے اس وجہ سے ہمیں ٹھوڑی سی سہولت میسر تھی۔ لیکن ہماری کمانڈو تربیت نے ہمارا ساتھ دیا اور اللہ نے ہماری مدد کی اور ہم کسی نہ کسی طرح

شکن گئیں بھی دفاعی مقاصد کے لیے کافی تھیں۔ مجاہد قاسم اور میں اوپر کو ہو گئے۔ ہم پہاڑی ڈھلان کے ساتھ پیٹ کے بل چپے زمین سے نکلے ہوئے پتھروں اور بھجڑیوں کی سوکھی جڑوں کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جا رہے تھے۔

یہاں مجھے پہلی بار ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں ریڈار کا ایریل دکھائی دیا۔ قاسم میرے آگے تھا۔ وہ پندرہ بیس گز ریٹکتا اور پھر ذرا دائیں جانب کو ہو جاتا۔ اسی طرح ریٹکتے ہوئے ہم ایک ہموار جگہ پر آ کر اوندھے لیٹ گئے۔ یہاں سے ہمیں شگاف کا روشن دہانہ صاف نظر آ رہا تھا۔ گہری خاموشی تھی، کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کسی کسی وقت دور نیچے سمندری لہروں کے ساحلی پتھروں سے ٹکرانے کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے جاتا تھا۔ قاسم نے میرا کندھا خاص انداز میں دھپایا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ دائیں جانب سے اور میں بائیں جانب سے اوپر جاؤں گا۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ چڑھائی خطرناک نہیں تھی۔ جگہ بڑی خطرناک تھی۔ کسی بھی وقت ہم پر کسی مشین گن پوسٹ سے گولیوں کی بوچھاڑ آ سکتی تھی۔ ڈرا سی آہٹ پر روشنی کا گولا فائر ہو سکتا تھا اور وہاں دن کی طرح روشنی پھیل سکتی تھی اور کوئٹن نہیں دیکھ کر وہیں بھون سکتا تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں بائیں جانب اوپر کی طرف ریک رہا تھا۔ ہم ٹارگٹ کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دشمن کے مورچے کے اندر آ گئے تھے۔

پہاڑی شگاف کے دہانے کی روشنی قریب ہو رہی تھی۔ ہم چونکہ سمندر کی جانب سے چڑھائی چڑھ رہے تھے اس لیے ابھی تک محفوظ تھے کیونکہ اس طرف سیکورٹی اتنی سخت نہیں تھی اور صرف تین چار مشین گن مورچے ہی تھے جس کے توپچی شاید سو گئے ہوئے تھے۔ اگر جاگ رہے تھے تو ہم ان کے مورچوں کے قریب سے اس قدر محتاط ہو کر گزرے تھے کہ انہیں ہماری ہلکی سی آہٹ تک بھی نہیں آتی تھی۔ یقین کریں جب میں شگاف کے بالکل قریب آ گیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے میں لاکھ کھوں کہ میرے اندر ایمان کا جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ میں بڑا ہموار تھا۔ میں بڑا تربیت یافتہ کمانڈو تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس خطرناک تباہ

اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم نے تمام حساس مقامات نوٹ کر لیے ہیں یاں؟“

میں نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ ایک ایک تفصیل میرے ذہن میں محفوظ ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے

میں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔“

”آ جاؤ۔“

قاسم اٹھ کھڑا ہوا اور ہم سڑک پار کر کے ایک نشیب سے اتر کر اس جگہ پر آ گئے جہاں سے دور دوار کا شرکی روشنیاں ہمیں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ ہمیں شیر خان کے مکان تک پہنچتے مزید آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ وہ لوگ یعنی مکناؤ ہارون، مکناؤ خالد اور شیر خان جاگ رہے تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ چائے کی نہ جانے کتنی پیالیاں پی چکے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر رونق آ گئی۔ شیر خان نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں صرف ایک بجلی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ شیر خان نے چٹیک میں سے ہمیں چائے پیالیوں میں ڈال کر دی۔ گرم گرم چائے نے ہمارے اعصاب کو بڑا سکون دیا۔ ہم نے انہیں اپنے سرانصرسانی کے مشن کی پوری تفصیل بیان کر دی۔ مکناؤ خالد، مکناؤ ہارون اور شیر خان بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب ہم سب کچھ بیان کر چکے تو مکناؤ خالد نے ہماری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ اب تم ایک کام کرو جو بہت ضروری ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”حکم کریں مکناؤ را!“

وہ بولا۔

”ساتھ والے کمرے میں زمین پر بستر لگا دیے گئے ہیں، فوراً وہاں جا کر سو جاؤ۔“

شیر خان اور مکناؤ ہارون بھی مسکرا رہے تھے۔ ہم نے پستول اور چاقو شیر خان کے حوالے کیے اور ساتھ والے کمرے میں جا کر بستروں پر گر پڑے۔ تھوڑی دیر میں

بڑی گن پوسٹ کی اترائی خیریت سے اتر گئے۔ آگے راستہ اتنا مشکل نہیں تھا لیکن ہمیں ڈھلان اترتے ہوئے ایک گھنٹہ لگ گیا۔

ہم مشین گن کے مورچوں کے قریب سے بھی خیریت سے نکل آئے۔ کہیں ہم پاؤں کے بل بیٹھ کر خرگوشوں کی طرح چلتے، کہیں گھٹنوں کی بل ہو کر لومڑیوں کی طرح چلتے رہے تھے۔ آخر ہم اس مقام پر آ گئے جہاں گڑھوں میں سمندر کا گدلا پانی بھرا ہوا تھا اور چڑھائی اترائی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ ہم واقعی تھک گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر ہم ایک دوسرے کے قریب ہو گئے اور بیٹھ گئے۔ مجاہد قاسم نے آہستہ سے یا اللہ تیرا شکر ہے کہا اور اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔ میں خاموش تھا۔ میرا ذہن ان تمام نازک اور حساس مقامات کو محفوظ کر رہا تھا جہاں سے ہم دوبار گزر کر آئے تھے اور جہاں سے ایک بار ہمیں گزر کر مکناؤ آپریشن کر کے دشمن کی لیزر گن پوسٹ کو تباہ کرنا تھا۔ قاسم آس پاس پھیلے ہوئے اندھیرے میں غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”چلو۔“

ہم وہاں سے اٹھے اور تیز تیز واپس چل پڑے۔ یہاں بھی اگرچہ ہم ایک دوسرے کے درمیان تین چار قدموں کا فاصلہ رکھ کر چل رہے تھے لیکن ہم خطرے کے علاقے سے نکل آئے تھے۔ ہمیں اس علاقے سے نکلنے سے بھی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جب ہم اس درخت کے پاس آ گئے جہاں تیل کی موڑتی لگی ہوئی تھی تو قاسم رک گیا اور مجھے ساتھ لے کر درخت کی دائیں جانب سے آگے نکل گیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد چھوٹی سی سڑک آ گئی۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ قاسم نے کلائی والی گھڑی کو غور سے دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔

”رات کے تین بجنے والے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے کہ ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہو گیا۔“

دونوں ساتھی کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون بڑے غور سے نقشے کا جائزہ لیتے رہے۔ حساس مقلات پر اٹھیاں رکھ کر ان کی نشاندہی بھی کرتے رہے۔ جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے اور نقشے کی ایک ایک تفصیل کو انہوں نے اپنے ذہن میں نقش کر لیا تو کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

”شیر خان! میرے بھائی چائے کی ایک ایک گرام گرم پیالی اور ہو جائے۔“

شیر خان بولا۔

”ابھی بنا کر لاتا ہوں۔“

اور وہ چپک چپک اٹھا کر کچن کی طرف چلا گیا۔ کمانڈو منظر خالد کئے لگا۔

”یہ مشن اتنا آسان نہیں ہے۔ مجھے یہ خیال پریشان نہیں کر رہا کہ اس مشن سے ہمارے زندہ واپس آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ پریشانی صرف اس بات کی ہے کہ کیا ہم دشمن کی لیڈر گن چاہ کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے؟“

سب پر خاموشی چھائی۔ میں بھی سوچ رہا تھا کیونکہ ٹیکنیکل نقطہ نظر سے یہ مشن خالص موت کا مشن تھا۔ ہم تو سراسر غریبی کے مشن پر گئے تھے۔ ہم دشمن کے کسی ایک فوجی کو ہلاک کرنے اور قاتل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسرے ہم رات کے اندھیرے میں صرف تین چار مشین گن مورچے ہی دیکھ سکے تھے۔ یقینی طور پر وہاں اور مورچے بھی تھے جنہیں ہم نہیں دیکھ سکے تھے اور جو ہماری ٹیکنک کی راہ میں نہیں آئے تھے۔ اب ہمیں ایکشن مشن پر جانا تھا اور ہمارے ساتھ دو کمانڈو اور

جانے والے تھے یعنی خالد اور کمانڈو ہارون۔ ان لوگوں نے لیڈر گن پوسٹ پر جانے والے راستے کو صرف نقشے پر ہی دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم چاروں ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ ہمیں بکھر کر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رہ کر اپنے اپنے راستوں پر چلنا تھا اور کمانڈو ہارون اور کمانڈو خالد ان کو ان راستوں کا تجربہ نہیں تھا۔ وہ چوکس ہو کر چوکنے رہ کر ضرور چلتے مگر اس طرف مشین گن پوزیشن بھی ہو سکتی تھیں اور کچھ تعجب نہیں کہ وہاں دشمن نے بارودی سرنگیں بھی بچھا رکھی ہوں۔ دوسری اہم بات یہ تھی

ہم گہری نیند سو رہے تھے۔

اگلے روز ہم دن کے ایک بجے اٹھے، غسل کیا اور اسی کمرے میں کمانڈو خالد کمانڈو ہارون اور شیر خان بھی آگئے۔ شیر خان کئے لگا۔

”میں نے آج دکان سے چھٹی کی ہے، نوکر کو چھوڑ آیا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں پہلے کھانا کھا لیتا چاہیے۔“

شیر خان نے خود مچھلی اور چاول تیار کیے تھے۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر چائے کے دور پر اہم ترین گفتگو کا آغاز ہوا۔ کمانڈو ہارون پہلے ہی سے پنل اور کاپی لے آیا تھا۔ اس نے کاپی اور پنل میری طرف بڑھائی تو کمانڈو خالد نے کہا۔

”کرم داد! رات تم نے جو کچھ دیکھا ہے اور جہاں جہاں سے گزرے ہو وہاں کا نقشہ بنا دو اور حساس اور نازک مقلات کی نشان دہی بھی کر دو۔“

میں کاپی کھول کر اس پر اپنی یادداشت سے آؤس می ترچھی لکیریں بنانے لگا۔ قاسم میرے پاس ہی بیٹھا تھا، مجھے نقشہ بناتے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جہاں میں بھول جاتا وہ مجھے یاد دلاتا کہ یہاں بائیں جانب مشین گن پوسٹ تھی۔ پندرہ بیس منٹ میں نقشہ تیار ہو گیا۔ کمانڈو خالد اور ہارون اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھ کر مجھ سے پوچھا۔

”یہ تیر کا نشان کیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”یہاں سے اوپر وہ پگنڈی ہے جس پر سے سستی پڑوں کے بھارتی سنتری گزرے

تھے۔“

”کیا وہ اسی پگنڈی سے واپس بھی آئے تھے؟“

کمانڈو خالد نے یہ سوال مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے کہا۔

”ہم ان کے گزر جانے کے فوراً بعد دائیں جانب اوپر کی طرف چلے گئے تھے۔“

میرے اس جواب کی محفل قاسم نے بھی تائید کی۔ اس کے بعد دیر تک ہمارے

”کرم داد! تمہارا کیا خیال ہے ہمیں کس قسم کا کمائڈو ایکشن پلان تیار کرنا چاہیے۔“

شیرخان چائے کی پیٹک لے کر آگیا۔ کمائڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”میرا خیال ہے پہلے گرم چائے کی ایک ایک پیالی پی جائے۔ پھر دماغ زیادہ روشن ہو کر سوچے گا، کیا خیال ہے ہارون؟“

شیرخان پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ چائے بڑی اچھی بنائی تھی شیرخان نے۔
بھارت کے اس علاقے میں چائے اچھی مل جاتی تھی، وہاں سے ذرا نیچے جائیں تو کلنی کا رواج شروع ہو جاتا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب چائے پی چکے تو خالد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”اوکے کرم داد! تمہارے خیال میں ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟“

میں اس دوران کلنی کچھ سوچتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”کمائڈو! مجھے تو ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔“

”وہ کیا؟“ کمائڈو ہارون نے پوچھا۔

کمائڈو خالد بولا۔

”تم آرمی کے سابق کمائڈو ہو کرم داد! تم ضرور کوئی بڑی کارکردہ تیار کرو گے۔“

میں نے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ ہم صرف ایک ہی طریقے سے یقینی طور پر دشمن کی لیزر گن کو تباہ کر سکتے ہیں کہ جس قدر بارود اوپر لے جاسکتے ہیں لے جائیں۔ اسے توپ کے نیچے لگا کر سارے کے سارے بگر کو ایک ہی دھماکے سے اڑا دیں۔“

کمائڈو خالد اور ہارون ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہارون بولا۔

”اُتا بارود ہم اس قدر خطرناک علاقے میں اتنی ہندی پر کیسے پہنچائیں گے جہاں

قدم قدم پر دشمن مشین گنیں اور توپیں لگائے بیٹھا ہے۔“

میں نے کہا۔

کہ پہاڑوں کے اندر غار بنا کر جو لیزر گن دشمن نے نصب کر رکھی تھی اس کے اندر جا کر گن کو تباہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ یہ عام گولے والی توپ نہیں تھی۔ یہ لیزر گن تھی جس کی ساخت بھی ایک مشین کی طرح تھی۔ وہاں ہر وقت مسلح گارڈ موجود رہتی تھی اور خطرے کے الارم کا انتظام بھی ضرور کیا گیا ہو گا جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس جگہ اپنا کھاتہ لگ جانے سے یہ الارم بج اٹھے گا۔ ہم نے گن کا جو مشاہدہ کیا تھا، وہ ایک بہت بڑی اور فولادی مشین لگ رہی تھی۔ اس کی ٹالی بہت چھوٹی تھی۔ جب میں نے لیزر گن کی فوجی نقطہ نگاہ سے کمائڈو خالد کو پوری تفصیل بتائی تو وہ کہنے لگا۔

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس لیزر مشین کی مضبوطی ٹینک سے کم نہیں ہے

اور اس پر پیئڈ گرنیڈ کا شاید ہی کوئی اثر ہو۔“

کمائڈو ہارون نے کہا۔

”ایئرین میرین کا یہ بہت بڑا پراجیکٹ ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں ریموٹ کنٹرول ٹی

وی کیمرہ بھی کسی جگہ لگا ہوا ہو اور جیسے ہی ہم بگر میں داخل ہوں، ہم ٹی وی سکرین پر دیکھ لیں جائیں۔“

کمائڈو خالد نے قاسم سے پوچھا۔

”کیا تم لوگوں نے شگاف کے اندر لگے ہوئے ڈائیلیوں کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا؟“

مجاہد قاسم نے کہا۔

”میری نگاہ سامنے والی دیوار پر تھی۔ وہاں مجھے کچھ ڈائیل اور ایک پینسل پر دو

کمپیوٹر پڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔“

کمائڈو خالد نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”میں نے بھی اپنی سامنے والی بکر کی دیوار پر ڈائیل دیکھے تھے۔“

کمائڈو خالد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

”خالد بھائی! بارودی سکوں والے ٹائم بم ہمارے بھوپال والی خفیہ کیمین گاہ میں بھی نہیں ہیں۔ اس کے لیے تو ہمیں بھوپال چھاؤنی میں انڈین آرمی کے کسی گولہ بارود کے ذخیرے پر شب خون مارنا ہوگا۔“

تب شیر خان نے کہا۔

”اگر کسی فوجی ایمونیشن ڈپو پر ہی شب خون مار کر یہ اسلحہ حاصل کرنا ہے تو بھوپال جانے کی کیا ضرورت ہے، دوا رکامیں ہی کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“

خالد نے پوچھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

شیر خان نے کہا۔

”میں ساحل کے جنوب میں ایک پہاڑی کے دامن میں انڈین نیوی کا ایک گولہ بارود کا ڈپو ہے۔ وہاں نیوی کے ٹرک آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے گولہ بارود کے اس ذخیرے میں آپ کے مطلوبہ ٹائم بم بھی ہوں۔“

میں نے اس پر کہا۔

”اگر یہ ڈپو نیوی کا ہے تو وہاں بارودی سکوں والے ٹائم بم ضرور ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بم بحریہ کے غوط خور کمانڈو دشمن کے ہتھیاروں کو اڑانے کے لیے جہاز کے نیچے جا کر اس کے چنڈے سے چپکا دیتے ہیں۔ یہ بم مائیکرو ویوز کے ذریعے ریموٹ کنٹرول سے منسلک ہوتے ہیں اور ریموٹ کنٹرول کاٹھن دبانے سے پھٹ جاتے ہیں۔“

”اگر یہ بات ہے تو ہمیں اسی گولہ بارود کے ڈمپ پر شب خون مارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

انتا کہہ کر کمانڈو خالد نے شیر خان کی طرف دیکھا۔

”شیر خان! انڈین نیوی کا یہ ایمونیشن ڈپو یہاں سے کتنی دور ہے اور وہاں سیکورٹی کی پوزیشن کیا ہے؟“

”ہم یہ بارود انتہائی دھماکہ خیز ٹائم بموں کی شکل میں لے جائیں گے۔ یہ ٹائم بم بارودی سکوں والے ہوں گے جو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے پھینکے گئے۔“

کمانڈو خالد نے ہارون سے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے ہارون؟“

وہ بولا۔

”کمانڈر! تجویز تو صحیح ہے اپنی جگہ پر۔ بارود سے تو ساری پہاڑی اڑانی جاسکتی ہے۔“

میں نے کہا۔

”میں یہی چاہتا ہوں کہ صرف لیزر گن کی بجائے پہاڑی کے سارے کے سارے اوپر والے حصے کو اڑا دیا جائے۔ ہم یہ انتہائی طاقتور دھماکہ خیز بم لیزر گن کے بانی پاؤ کے نیچے لگا سکتے ہیں۔ یہ بم کم از کم تعداد میں دس ضرور چاہیے۔ جب اتنی کثیر مقدار کا بارود زیر دست دہاؤ کے ساتھ پھینکا تو لیزر گن کے ساتھ پہاڑی بکر بھی اڑ جائیں گے۔ ہمارے مشن کی کامیابی کی یہی ایک صورت ہے۔“

کمانڈو خالد نے شیر خان کی طرف دیکھا۔

”کیوں ہمارے شیر خان! تم نے بھی ساری بات سن لی ہے۔ کیا تم اس قسم کے دس پندرہ ٹائم بموں کا انتظام کر سکتے ہو؟“

شیر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کمانڈر! دستی بموں کا تو بندوبست ہو سکتا ہے مگر اس قسم کے ٹائم بم ہمارے آدمیوں کے پاس نہیں ہیں۔ یہ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“

کمانڈو خالد نے ہارون سے پوچھا۔

”کیوں ہارون! تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

کمانڈو ہارون کہنے لگا۔

سنیاسی ریل گاڑیوں، بسوں اور لاریوں میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہیں۔ ان سے ٹکٹ کوئی نہیں پوچھتا۔

لاری شہر کے سنگم علاقہ میں سے نکل کر ایک کھلی سڑک پر آگئی۔ جہاں ایک طرف دور تک ساحلی پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا اور دوسری طرف شہر کی اونچی نیچی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔



Famous Urdu Novels

Free pdf Library

شیر خان نے کہا۔

”یہ ایک چھوٹا سا ایمونیشن ڈپو ہے۔ پہاڑی کے اندر بنا ہوا ہے۔ سامنے احاطے میں خاردار تاروں والی چار دیواری ہے۔ ایک نیم پہاڑی سڑک کچھ فاصلے پر سے گزرتی ہے۔ وہاں سے کبھی کبھی بس پر سے گزرتے ہوئے میں نے اس ڈپو کو دیکھا ہے۔ مجھے تو وہاں دو چار فوجی ہی پہرہ دیتے نظر آئے تھے۔“

میں نے کہا۔

”یہ ساٹ ہمیں خود جا کر دیکھنا ہوگا۔“

کمانڈر خالد نے شیر خان سے پوچھا۔

”یہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہوگی؟“

اس نے بتایا کہ زیادہ سے زیادہ چار میل کا فاصلہ ہوگا۔ اس سے کچھ فاصلے پر دوار کا سے کھنڈیاوار جانے والی سڑک گزرتی ہے۔ اس کے پیچھے پہاڑیاں ہیں اور ان کے پیچھے سمندر کا ساحل ہے۔ کمانڈر خالد نے مجھ سے کہا۔

”کرم دادا، تم اور قاسم آج ہی یہ جگہ جا کر دیکھو گے۔ مگر تیس دن کے وقت جانا ہوگا اور وہی جتنی سلحوں والے ہمیں میں جاؤ گے۔“

اس وقت دودھیر ہو چکی تھی۔ میں نے اور قاسم نے تیاریاں شروع کر دیں۔ شیر خان نے ساٹ کی نشان دہی کئے لیے ٹارگٹ سے کچھ دور تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی جتنی سلحوں والا لباس پہنا۔ وہی حلیہ بتایا اور شیر خان کے ساتھ اپنے نئے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شیر خان ہمارے آگے آگے تھا۔ اس نے ہمیں بتا دیا تھا کہ دوار کا کے ایک لاری اڑے سے ہمیں کھنڈیاواڑ جانے والی ایک لاری پر سوار ہونا ہوگا اور راستے میں جہاں پائیں جانب جہین مندر نظر آئے گا وہیں اتر جانا ہوگا۔ وہ ہماری راہ نمائی کرتا ہمیں دوار کا شہر کے لاری اڑے پر لے آیا۔ وہ خود بھی لاری میں بیٹھ گیا۔ ہم بھی اسی لاری میں سوار ہو گئے۔ شیر خان نے کسی اگلے گاؤں تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ کنڈکٹر نے ہمیں کوئی ٹکٹ وغیرہ لینے کو نہ کہا۔ بھارت میں سلحو

جہاں ایک نیوی کی وردی والا سنتی رائل لیے پہرہ دے رہا تھا۔ پہاڑی کی دیوار میں ایک جگہ دروازہ بنا ہوا تھا جو بند تھا۔ اس کے آگے دو اینڈرین آرمی کی کسی رجمنٹ کے سپاہی سنولوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شیر خان بھی اب ہمارے قریب سے سرنگھل کر دیکھنے لگا۔ بولا۔

”یہاں بس اتنے ہی سنتی ہمیشہ دیکھے گئے ہیں۔ وہ دیکھو دائیں جانب سڑک ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جو دوار کا سے کالھیواڑ کو جاتی ہے اور جس پر ہم سفر کر رہے تھے۔ یہ یہاں سے گھوم کر دوسری طرف نکل جاتی ہے۔“

میں اپنے نقطہ نظر سے ٹارگٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ آپریشن بظاہر آسان لگتا تھا۔ ان تین چار سنتیوں کو رات کے اندھیرے میں قابو کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ ایمنیشن ڈپو کی چابی ان کے پاس ہونی چاہیے۔ کیونکہ ڈپو کے دروازے پر ضرور تالا لگا ہوا ہوگا۔ عام طور پر جو فوجی دستہ ایمنیشن لینے آتا ہے ڈپو کی چابی اس کے انچارج کے پاس ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی چھوٹا ایمنیشن ڈپو ہو تو اس کی چابی سیکورٹی گارڈ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ میں نے قاسم سے اس خدشے کا اظہار کیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔

”ممکن ہے ڈپو کی چابی سیکورٹی گارڈ کے پاس ہی ہو۔ یہ خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا۔“

میں مسلسل ایمنیشن ڈپو کی خاردار دیوار کی تاروں کو دیکھ رہا تھا جو گچھوں کی شکل میں تھے۔ یہ دیوار کوئی سات آٹھ فٹ بلند ہوگی۔ میں نے کہا۔

”ہمیں ایک تار کاٹنے والے پلاس کی ضرورت ہوگی۔“

”وہ مل جائے گا۔“ قاسم نے آہستہ سے کہا۔

شیر خان کہنے لگا۔

”تم لوگ اس راستے سے بھی آسکتے ہو جس راستے سے میں تمہیں لایا ہوں لیکن ایک راستہ دوار کا کالھیواڑ سڑک کی طرف سے یہاں تک آتا ہے۔ اس راستے کے



لاری شر سے چھ سات میل باہر گئی ہوگی کہ ہمیں سڑک کی بائیں جانب ایک جین مندر کا منار نظر آیا۔ آگے بیٹھے ہوئے شیر خان نے مڑ کر ہماری طرف دیکھ کر اس نے ڈرائیور سے کہا کہ لاری روکائی۔ وہ بھی نیچے اتر پڑا۔ میں اور قاسم بھی نیچے اتر پڑے۔ شیر خان درمیان میں فاصلہ ڈال کر سڑک پر آگے کی طرف چلے گئے۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ کچھ دور جا کر وہ سڑک سے اتر کر دائیں جانب ہو گیا جہاں چھوٹے بڑے نیلے پھلے چلے گئے تھے۔

ہم اس کی راہ نمائی میں کئی گرائیڈ اور سمندری جہازوں کو عبور کر گئے۔ یہ علاقہ انسانوں سے بالکل خالی تھا۔ شیر خان ایک نیلے کے اوپر چڑھنے لگا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے۔ نیلے چھوٹا سا تھا۔ اوپر جا کر وہ بیٹھ گیا۔ ہم بھی اس کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ اس نے دوسری طرف جھانک کر کہا۔

”وہ دیکھو۔ وہ ہے اینڈرین نیوی کا ایمنیشن ڈمپ۔“

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ہم سر ذرا دُرا سے اوپر نکل کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ دوسری طرف ایک اور چھوٹا سائیل یا پہاڑی تھی۔ یہ سمندری پہاڑیاں تھیں جن پر کوئی سبزہ وغیرہ نہیں تھا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک احاطہ نظر آیا جس کی دیوار کاٹنے والے تاروں کی تھی۔ دن کی روشنی میں یہ خاردار تاروں والی دیوار بڑی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ احاطے کا ایک داخلہ کا چھوٹا سا گیٹ تھا

”کرم داد کیا خیال ہے تمہارا؟“

میں نے بیٹھے ہوئے کہا۔

”یہ کوئی مشکل ٹارگٹ نہیں ہے کمناؤ! ہم آج رات کو ہی اسے مار لیں گے۔“

لیکن دعا کرو کہ ہمیں مطلوبہ ٹائم بم ڈپو کے ذخیرے سے مل جائیں۔“

کمناؤ خالد کہنے لگا۔

”یہ بات تو ہمیں خدا پر چھوڑنی ہوگی۔ اگر خدا نے چاہا تو مطلوبہ ٹائم بم مل جائیں گے۔ اگر نہ ملے تو پھر کل منہ اندھیرے بھوپال کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ٹارگٹ

تم نے اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے نا؟“

”بالکل دیکھ لیا ہے۔ ہمیں صرف ایک تار کاٹنے والے پلاس کی ضرورت ہوگی۔“

شیر خان نے کہا۔

”وہ میں ابھی لا دوں گا۔ آپ لوگ اس صبح پر کس وقت روانہ ہوں گے؟“

میں نے کہا۔

”وہی آدھی رات کے بعد والا ٹائم ہی ٹھیک رہے گا۔“

شیر خان بولا۔

”تو پھر میں شرجا کر وائر کٹر لے آتا ہوں۔ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

میں نے کہا۔

”اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کمناؤ چاقو اور آٹوٹیک ہسٹول ہمارے پاس موجود

ہیں۔“

شیر خان شرکی طرف چل دیا۔ میں کمناؤ خالد، ہارون اور قاسم فرش پر بھیجی ہوئی

دوری پر بیٹھ کر رات والے مشن کے بارے میں مزید تفصیلات طے کرنے لگے۔ کمناؤ

خالد کہنے لگا۔

”اگرچہ یہ چھوٹا سانیول ایمونیشن ڈپو ہے اور سیکورٹی گارڈ بھی وہاں تین چار ہی

ہیں لیکن اس بات کی تمہیں تسلی ضرور کر لینی چاہیے تھی کہ کہیں اوپر کسی پہاڑی پر

ذریعے نیوی اور آرمی کے فوجی ٹرک آتے جاتے ہیں۔ میں تمہیں اس لیے ادھر سے نہیں لایا کہ اگر کوئی فوجی ٹرک آگیا تو فوج ہمیں روک کر ضرور پوچھ گچھ کرے گی کہ ہم اس طرف کیا کرنے جا رہے ہیں جبکہ وہ راستہ صرف ایمونیشن ڈپو تک ہی جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔

”ہم اسی پہاڑی راستے سے ہی آئیں گے۔ یہ محفوظ راستہ ہے۔“

مجاہد قاسم نے مجھ سے پوچھا۔

”کسی اور جگہ کو دیکھنا ہو تو —؟“

میں نے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مختصر سا کمناؤ آپریشن ہوگا لیکن دعا کرو کہ گولہ بارود کے

اس ذخیرے میں سے ہمارے مطلوبہ ٹائم بم نکل آئیں۔“

ہم پیچھے ہٹ گئے۔ مجاہد قاسم کہنے لگا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ اگرچہ اس قسم کے ٹائم بم ضرور ہوتے ہیں۔“

میں نے پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

”یہ انتہائی دباؤ والے ذہنوں کے کام ہیں۔ ہمیں جیڑ ہوتے ہیں اور صرف یہی پھنسنے کے

بعد جنگی جہازوں کے فولادی پینڈے کو بچاڑ سکتے ہیں۔“

شیر خان حسب سابق تھوڑا فاصلہ ڈال کر ہماری بائیں جانب آگے آگے چل رہا

تھا۔ ہم جینی سلاخوں کے چیلے میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے بڑے سکون کے

ساتھ ڈھلان اتر رہے تھے۔ جیسے ہم دنیا اور دنیا داری کے جھیلیوں سے بالکل آزاد

ہوں۔

ہم واپس شیر خان کے مکان پر آگئے۔

کمناؤ خالد اور ہارون ہمارے انتظار میں ہی تھے۔ کمناؤ خالد نے مجھ سے سوال

کیا۔

کوئی مشین گن پوسٹ نہ ہو۔“
ختم کر دوں گا۔ لیکن مجھے اس کی امید نہیں ہے۔ کوئی ایسے آمار بھی نظر نہیں آ رہے۔ لگتا ہے اس بار بھی میرا انسانی روپ والا وقفہ کافی لمبا ہوگا۔“

چونکہ ناگن درگا کے متعلق میں نے ساری کہانی کہانڈو خالد کو بتا دی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

”بے چاری ناگن درگا کو تمہاری اس وقت شدید ضرورت تھی۔ اس وقت تم اس کا منہ چوم کر اسے عورت کی شکل میں واپس لا سکتے تھے۔ لیکن خدا جانے وہ تم سے سیکڑوں میل دور سناپ کے روپ میں کہل در بدر پھر رہی ہوگی۔“
میں نے کہا۔

”یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک بھوپیل والے بیرون جی کے مندر کے آس پاس ہی کہیں چھپی ہوئی ہوگی۔ میں نے اسے وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا تھا۔“

”لیکن“ خالد بولا۔ ”اس بات کو تو کئی دن گزر گئے ہیں۔ اتنی دیر تک وہ کہل انتظار کرے گی۔“
میں نے ہنس کر کہا۔

”سناپ بڑی دیر تک انتظار کر رہا ہے۔“
کہانڈو خالد ہنس پڑا۔

”ہاں بھائی! تم یہ بات کہہ سکتے ہو کیونکہ یہ تمہارے اپنے تجربے کی بات ہے۔“
ہارون چائے گرم کر کے لے آیا۔ اس دوران مجاہد قاسم ہمارے قریب ہی دری پر ایک طرف ہو کر لیٹ گیا تھا اور سو رہا تھا۔ ہارون نے اسے جگانا چاہا تو خالد نے کہا۔

”نہیں ہارون! اسے سونے دو۔ رات کو اس نے پھر کہانڈو مشن پر جانا ہے۔“
ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد مجاہد قاسم بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”دوستو! تم اکیلے اکیلے چائے پی رہے ہو۔ چائے کی اس وقت مجھے بھی ضرورت

”اب یہ معاملہ بھی خدا پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن ہم اتنا ہی خاموشی سے ٹارگٹ کی طرف بڑھیں گے۔ اگر پہاڑی پر کوئی مورچہ بھی ہوا تو اس کے سپاہیوں کو خبر تک نہیں ہوگی۔“

کہانڈو خالد نے کہا۔
”تمہاری اوئیں کوشش اور کمال یہ ہونا چاہیے کہ سیکورٹی گارڈ کوئی فائر نہ کر سکے۔“

میں نے کہا۔
”کوئی فکر نہیں کہانڈو! اس سے پہلے کہ وہ گن کا ٹریگر دبائے وہ موت کی فینڈ سو چکا ہوگا۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے کرم دادا!“
کہانڈو خالد نے میری طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہارون نے چائے کی چینیک کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا اور بولا۔

”ابھی اس میں کافی چائے ہے۔ مگر ٹھنڈی ہو گئی ہے میں ابھی گرم کر کے لاتا ہوں۔“

ہارون چینیک لے کر کچن کی طرف چل دیا جو دوسرے کمرے میں تھا۔ کچن کیا تھا، بس کمرے کے کونے میں ایک تھڑے پر مٹی کے تیل کا چولہا اور کچھ برتن رکھے ہوئے تھے۔

کہانڈو خالد کہنے لگا۔
”بھائی کرم دادا! اگر اس مہم کے راستے میں ہی تم سناپ بن گئے تو کیا ہوگا؟“
میں نے کہا۔

”سناپ بن گیا تو مشن زیادہ آسان ہو جائے گا۔ میں سیکورٹی گارڈ کو بڑی جلدی

ہے۔

بارون نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور اس میں چمیک میں سے گرم چائے انڈھلتے ہوئے بولا۔

”لو بھائی تم بھی چائے پی لو۔“

”شام ہونے لگی تو شیر خان تار کاٹنے والا پلاس لے کر آگیا۔ میں نے پلاس کو لے کر اس کا جائزہ لیا۔ کافی مضبوط پلاس تھا۔ شیر خان بولا۔

”یہ فوجی پلاس ہے گرم داد بھائی۔ تم بے شک تجربہ کر کے دیکھ لو۔“

میں نے کہا۔

”تجربہ کر کے تو ہر حالت میں دیکھنا پڑے گا۔“

شیر خان لوہے کا ایک تار کہیں سے ڈھونڈ کر لے آیا۔ میں نے اسے کٹا، تار ایک دم کٹ گیا۔ کمانڈو خالد نے پلاس کو لے کر دیکھا اور بولا۔

”بالکل ٹھیک ہے گرم داد!“

میں نے کہا۔

”جی ہاں!“

رات کو ہم نے اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا۔ ہم نے اپنا سلاخوں والا حلیہ آتے ہی بدل لیا اور دھوٹی کرتہ پہن لیا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد کمانڈو خالد نے کہا۔

”تم لوگ ابھی سے کمانڈو لباس پہن لو اور سو جاؤ، رات ٹھیک ساڑھے بارہ بجے تمہیں جگا دیا جائے گا۔ اس وقت لباس تبدیل کرنے کے لیے وقت نہیں ہوگا۔“

میں نے اور مجاہد قاسم نے دوسرے کمرے میں جا کر سیاہ رنگ کی جیکٹیں اور چٹونیں پہن لیں۔ چاقو اور آئوٹک پستول بھی جیبوں میں رکھ لیے۔ تار کاٹنے والا پلاس میں نے چٹون کی پٹی کے ساتھ لٹکا دیا۔ ہم نے بوٹ بھی پہن لیے تھے۔ گویا ہم مشن پر جانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ شیر خان نے دوار کا کھنڈیا ڈاڑ روڈ والے عین

مندر تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔ اگرچہ قاسم نے کہا بھی کہ شیر خان کی ضرورت نہیں پڑے گی ہم نے راستہ دیکھ لیا ہوا ہے لیکن کمانڈو خالد نے کہا کہ شیر خان عین مندر تک ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ وہاں سے وہ واپس آ جائے گا۔“

اس کے بعد ہم دوسرے کمرے میں جا کر الگ الگ چارپائیوں پر سو گئے۔ رات کے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے کمانڈو خالد نے ہمیں جگا دیا۔ ہمیں کسی قسم کی تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ شیر خان پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ہم نے کلمہ شریف پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا۔ اسلحہ چیک کیا۔ تار کاٹنے والا پلاس چٹون کے ساتھ لٹکایا اور اللہ کا نام لے کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ ہم تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مجاہد قاسم نے شیر خان سے کہا۔

”سڑک چھوڑ کر چلنا۔“

وہ بولا۔

”فکر نہ کرو۔“

وہ ہمیں سڑک سے ہٹ کر ایک مٹاؤنی راستے سے لے جا رہا تھا۔ سڑک رات کے وقت ویسے ہی سنسان پڑی تھی۔ دوار کا گجرات صوبے کا کوئی اتنا بڑا اور صنعتی شہر بھی نہیں تھا کہ وہاں رات کو بھی سڑک پر ٹرکوں وغیرہ کی آمد و رفت جاری رہتی ہو۔ لیکن احتیاط کے طور پر ہم سڑک پر نہیں چل رہے تھے۔ کوئی فوجی گاڑی وہاں سے گزر سکتی تھی۔ دوار کا بھارت کے مغربی ساحل پر ایک اہم فوجی اڈہ تھا جہاں جدید ترین لیزر گن نصب تھی۔ مجاہد قاسم اسی خیال سے سڑک پر نہیں چلنا چاہتا تھا۔ ہم رات کے اندھیرے میں تینوں خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ جب ہماری دائیں جانب عین مندر کا کھنڈی مینار ستاروں کی دھندلی روشنی میں نظر پڑا تو شیر خان بولا۔

”میل سے تم لوگ دائیں جانب جاؤ گے۔ میرا خیال ہے اب تمہیں میری ضرورت نہیں ہوگی۔“

قاسم نے کہا۔

باہر چلتے بلب کی روشنی یہاں تک تھوڑی تھوڑی آ رہی تھی۔ مجھے اس قسم کے تاروں کو کانٹنے کی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی تھی جو میں بھولا نہیں تھا۔ میں نے ہم اللہ پرہیز کر ایک خاص زاویے سے پہلے تار کو پلاس کے شعلے میں رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اسے دبا دیا کانٹ کی آواز کے ساتھ تار کٹ گیا۔

اس آواز نے ہمیں چونکا کر دیا۔ میں نے اور قاسم نے سر نیچے کر لیے اور غور سے فوجی سپاہیوں کی طرف دیکھ انہوں نے یہ آواز نہیں سنی تھی لیکن ابھی مجھے چار پانچ جگہوں سے تار کٹ کر وہاں آدمی کے گزرنے کے برابر جگہ بتائی تھی۔ خطرہ یہی تھا کہ کہیں تار کٹنے کی آواز سپاہیوں تک نہ پہنچ جائے۔ میں جتنی احتیاط کر سکتا تھا اس سے بھی زیادہ احتیاط کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے پانچ جگہوں سے تار کٹ ڈالے اور بڑی آہستگی کے ساتھ تاروں کے کٹے ہوئے ٹکڑے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب وہاں اتنی جگہ پیدا ہو گئی تھی کہ ہم رینگ کر اس میں سے گزر سکتے تھے۔ میں نے قاسم کو بتا دیا ہوا تھا کہ احاطے کے اندر جاتے ہی ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ پہلے میں تاروں کے شکاف میں سے رینگ کر نکل گیا۔ میرے بعد قاسم بھی رینگتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ہم ابھی تک زمین پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے قاسم کانٹے دار دیوار کے ساتھ داخلہ گیٹ کی طرف رینگنے لگا۔ اسے داخلہ گیٹ پر پہرہ دیتے سنتری کو ختم کرنا تھا۔ یہ کام ہم داخلہ گیٹ کی طرف سے داخل ہو کر نہیں کر سکتے تھے۔

جیسے ہی قاسم داخلہ گیٹ کی طرف گیا میں نے پتول نکل کر ڈمپ والے دروازے کے باہر ڈیوٹی گارڈ کو نشانے میں لے لیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں ہنگامی صورت حال میں ایک دو کو ڈھیر کر سکتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی فائر کر بھی دیتا تو فائر کی آواز سے کوئی خاص فرق پڑنے کا امکان نہیں تھا۔ ہاں یہ خدشہ ضرور تھا کہ آہ پھاڑی کی دھلان پر کوئی مشین گن پوسٹ تھی تو ہم پر گولیوں کی بوچھاڑیں ہو سکتی تھیں اور ہمارا مشن ناکام ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ خطرہ مول لیے بغیر ہمارا مشن مکمل نہیں

”بالکل نہیں شیر خان۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

شیر خان وہیں سے واپس ہو گیا۔

میں اور قاسم نے ایک لمحے کے لیے رک کر علاقے کا جائزہ لیا اور نصف دائرے کا ایک چکر کٹ کر اس چھوٹی سی ویران سڑک پر نکل آئے جو سیدھی فوجی گولہ بارود کے ذخیرے کو جاتی تھی۔ ہم سڑک پار کر کے پتھروں اور چٹانوں کی آڑ لیتے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں اندھیرا زیادہ تھا۔ اس لیے کہ یہ پہاڑی کا دامن تھا۔ لیکن چونکہ ہم دن کے وقت ٹارگٹ کی نشان دہی کر چکے تھے اس لیے ہمیں خاردار تاروں والی دیوار کے پاس پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ یہ ایمنونیشن ڈپو کی خاردار دیوار تھی۔ ایمنونیشن ڈمپ کے گیٹ اور احاطے کے داخلہ گیٹ پر ایک ایک بلب روشن تھا۔ ان کی روشنی کافی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ رات کے وقت سیکورٹی گارڈز کے سنتری گیٹ پر نہ ہوں۔ محض شک دور کرنے کے واسطے ہم اندھیرے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے جاقو نکل کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔ دس پندرہ منٹ تک ہم نے انتظار کیا۔ جب اس دوران کوئی گشتی پارٹی اوھر نہ آئی تو ہم نے خاردار دیوار کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ ہم پہلو بہ پہلو زمین پر اونڈھے لیٹ کر رینگ رہے تھے۔ پلاس میرے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کوئی اتنی زیادہ سیکورٹی بھی نہیں تھی۔ داخلہ گیٹ پر ایک سنتری ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا پہرہ دے رہا تھا اور تین سنتری ایمنونیشن ڈمپ کے دروازے پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ان میں سے دو ٹکڑی کے کرسٹ یا شٹلوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ آہیں میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ باتوں کی مدد ہم آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔

اس کے سوا وہاں کوئی سپاہی نظر نہیں آتا تھا۔ ہم خاردار تاروں کی دیوار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ میں نے پلاس نکل لیا۔ ایک بار پھر تینوں فوجیوں پر نظر ڈالی۔ وہ خوش گہموں میں مصروف تھے۔ مجھے قاسم نے آئینک پتول نکل لیا تھا۔ میں نے کانٹے دار تاروں کے پھوس کا اندھیرے میں جائزہ لیا۔ چونکہ احاطہ چھوٹا تھا اس لیے ڈپو کے

نہیں ہو سکتا تھا۔ میں قاسم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں کچھ دور تک ریٹکتا ہوا
 داخلہ گیٹ کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ گیٹ پر بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے
 قاسم خداداد تاروں کے کچھوں کے ساتھ لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گاڑ سنتری اس سے ذرا
 آگے کھڑا تھا۔ اس کی پشت قاسم کی طرف تھی۔ سنتری کے ہاتھ میں رائفل ضرور تھی
 مگر وہ دھیلے دھالے انداز میں کھڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ رائفل کا سیفٹی کچھ آگے نہیں
 کیا ہوا ہوگا۔ کیونکہ یہ کوئی جنگی محاذ نہیں تھا۔ فائر کرنے کے لیے رائفل کا سیفٹی ہرک
 آگے کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے اچانک فائر کرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر
 تھا۔ میری نگاہیں کبھی ڈمپ کے دروازے والے سپاہیوں کی طرف جاتیں اور کبھی میں
 قاسم کو دیکھنے لگتا کہ یہ شخص اتنی دیر کس لیے کر رہا ہے۔ یہ کام اتنا "فنا" کرنے
 والے ہوتے ہیں۔ اس میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی بھی دیر ہو جائے تو سارے
 کیے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ قاسم گیٹ والے سپاہی کی طرف
 آہستہ آہستہ ایسے سناپ کی طرح ریٹکتے لگا ہے جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو اور اس پر
 ایک دم سے چبھنے والا ہو۔

قاسم کو یہی کرنا چاہیے تھا۔

اور پھر اس نے ایسا ہی کیا اور کمال کر دکھایا۔ گاڑ سنتری اپنی جگہ سے چلا ہی تھا
 کہ قاسم نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ کمانڈو کے چھلانگ لگنے اور ایک عام آدمی کے
 چھلانگ لگنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عام آدمی چھلانگ لگا کر دشمن کو گرا دیتا ہے اور
 گرانے کے بعد اس سے شکست کھاتا ہو جاتا ہے جبکہ کمانڈو جب پیچھے سے دشمن پر
 چھلانگ لگاتا ہے تو چھلانگ لگنے کے ساتھ ہی دشمن کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں
 اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ وہ کوئی آواز پیدا نہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سیدھے
 ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اس کی گردن پر پوری طاقت سے پھیرتا ہے اور اسے فوراً ہی
 زمین پر پھینک دیتا ہے۔ قاسم نے بھی ایک تجربہ کار کمانڈو کی طرح ایسے ہی کیا تھا۔
 فرق صرف اتنا تھا کہ گاڑ سنتری کے حلق پر چاقو چلانے کے بعد اسے ایک دم اپنے

سے الگ نہیں کیا تھا بلکہ اسے وہیں بیٹھا دیا تھا اور اس کے ساتھ خود بھی وہیں بیٹھ گیا
 تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔

گاڑ سنتری کی شر رگ یقینی طور پر کٹ چکی تھی اور اس کے آواز نکلنے یا زندہ
 بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ قاسم اسے جلدی سے کھینچ کر پیچھے لے گیا
 اور اسے وہیں چھوڑ کر ریٹکتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ میرے قریب آ کر اس نے
 ہاتھ کی دو انگلیاں اوپر کر کے اشارہ کیا کہ کام تمام ہو گیا ہے۔ اب ہمارا ٹارگٹ ڈمپ
 کے دروازے کے باہر کھڑے تین ایڈمن آرمی کے سنتری تھے۔ گیٹ پر جو گاڑ سنتری
 تھا وہ بھارتی بحریہ کا سپاہی تھا۔ یہ تینوں سنتری ہری وردیوں میں تھے اور آرمی کے سپاہی
 تھے۔ پلان کے مطابق میں نے قاسم کو اشارہ کیا اور ہم ایک دوسرے کے پیچھے ریٹکتے
 ہوئے ٹیلے کی دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ ہمیں سنتریوں کے
 باتیں کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہم نے اپنے اپنے آؤٹریک پتھروں
 نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔ یہاں کمانڈو چاقو کی بجائے ہمیں آؤٹریک پتھروں سے
 کام لینا تھا۔ یہاں ہم پتھر و قمر و پھینک کر ان میں سے کسی ایک سنتری کو اس طرف بلوا
 کر ہلاک نہیں کر سکتے تھے۔ اس تدبیر کے یہاں کارگر ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔
 کیونکہ یہ تین سنتری تھے اور آواز سن کر وہ سنتری بھی اس طرف آ سکتے تھے۔ چنانچہ
 میں نے اندھیرے میں قاسم کے کان میں سرگوشی کر کے اسے بتایا کہ ہم گاڑ سنتریوں کو
 آؤٹریک پتھروں سے ریپڈ فائر کر کے یکے بعد دیگرے ہلاک کریں گے۔

اس کام کی مجھے تو بہت شینگ مل چکی تھی۔ چنانچہ میں نے قاسم کو اشارہ کر کے
 بتایا کہ میں بائیں جانب والے دونوں سنتریوں کو نشانہ بنائوں گا اور قاسم سامنے کھڑے
 سنتری پر فائر کرے گا۔ جن دو سنتریوں پر میں نے فائر کرنا تھا وہ کھڑکی کے کھوکھوں پر
 آنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ تیسرا سنتری ان کے قریب کھڑا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں
 تھا۔ سنتریوں کی شکلیں ہمیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں
 ان کی نظر ہم پر نہ پڑ جائے۔ ہمیں تیز اور جلدی ایکشن کرنا تھا۔ قاسم بالکل میرے پہلو

ہوئے تالے کی چابی کی تلاش تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔
”مت تلاش کرو۔ آ جاؤ۔“

میں نے تالا دیکھ لیا تھا۔ اسے میرا پلاس اکھاڑ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے پلاس کی مدد سے تالے کو ایک طرف سے کٹڑے سمیت اکھاڑ دیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اندر چھت کے ساتھ بلب لگا تھا جس کی مدد میں روشنی میں ہمیں جگہ جگہ اسلحہ کے کرٹ لگے ہوئے نظر آئے۔ یہ چھوٹا سا ڈپ تھا۔ دیوار کے ساتھ پٹول کے کنٹینر لگے ہوئے تھے۔ لوہے کی لمبی میز پر اسلحہ کے چھوٹے بڑے کيسے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ میں جلدی جلدی ان بکسوں کو دیکھتا چلا گیا۔ ایک بکس کو میں نے پہچان لیا۔ میں نے پلاس کی مدد سے اسے توڑ ڈالا۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا۔ کيسے میں بارودی عنکوں والے کتے تھے ہی ٹائم بم ایک دوسرے کے ساتھ بڑے قریب سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ٹائم بم نکل کر اس کو اچھی طرح سے دیکھا۔ یہی وہ اسلحہ تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ میں نے بم بکس میں رکھ دیا۔ اس کے اوپر لکزی کا تختہ لگا دیا اور قاسم سے کہا۔

”ہمیں یہ بکس اٹھا کر ساتھ لے جانا ہو گا۔“

بکس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ قاسم نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور ہم جلدی جلدی ایونٹین ڈپ سے باہر آ گئے۔ دروازے کو اسی طرح بند کر دیا۔ تینوں بھارتی سٹریٹوں کی لاشیں اسی طرح پڑی تھیں۔ ہم دوڑتے ہوئے خاردار تاروں والی دیوار کے شکاف کے پاس آئے۔ ہم نے سب سے پہلے ٹائم بموں والے بکس کو شکاف میں دھکیل کر دوسری طرف کیا۔ پھر ایک دوسرے کے پیچھے رینگتے ہوئے باہر نکل آئے۔

اس کے بعد ہم جتنی تیز چل سکتے تھے چلتے ہوئے رات کی تاریکی میں اونچے نیچے پتھروں کے درمیان سے ہو کر چھوٹی مٹری روڈ پر آ گئے۔ قاسم نے بکس کندھے پر اٹھایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں سڑک خالی اور سنسان تھی۔ ہم جلدی سے سڑک پار کر گئے۔

میں اوندھا لینا ہوا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پٹول تھا اور ہم نے پٹول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ میں نے قاسم کی طرف دیکھ کر انگلی اٹھا کر خاص اشارہ کیا۔ قاسم نے آہستہ سے سر ہلایا۔ میرا ٹارگٹ کھوکھوں پر بیٹھے ہوئے دونوں سٹریٹ تھے۔ وہ میرے پٹول کی زد میں تھے۔ مکینڈو ٹریننگ کے دوران بھی میرا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنے تمام سابقہ تجربے اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پٹول کی تالی کا رخ دونوں سٹریٹوں کی طرف کیا اور اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ پہلا فائر کرنے کے بعد میں نے دوسرے فائر سے پہلے آؤٹک پٹول کو ذرا دائیں جانب کر لیا تھا کیونکہ دوسرا سپاہی دائیں جانب تھا۔ میرے فائر کے ساتھ ہی قاسم کے پٹول میں سے بھی ٹھک ٹھک دو بار فائر کرنے کی آواز آئی تھی۔

میں دل میں حیران ہوا تھا کہ قاسم کا ٹارگٹ تو ایک ہی سٹریٹ تھا پھر اس نے دو فائر کیوں کیے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس نے تیسرے سٹریٹ پر ہی دو بار فائر جو کھ دیا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے پٹول سے نکلی ہوئی گولیوں نے دونوں سٹریٹوں کو دھیر کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ میرا سپاہی گھبرا کر کسی کو مدد کے لیے بلاتا یا ہوائی فائرنگ کرتا اسے قاسم کی گولی نے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ کام بڑی جلدی ختم ہو گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ہم ان چاروں بھارتی سٹریٹوں کو اتنی جلدی مار لیں گے لیکن ہم نے انہیں مار لیا تھا۔ قاسم اٹھ کر چلنے لگا تو میں نے اس کے کندھے کو دباتے ہوئے وہیں بٹھا لیا اور سرگوشی میں کہا۔

”اگر اوپر کسی جگہ کوئی دشمن کی مشین گن پوسٹ ہے تو انہوں نے سٹریٹ والی فائر کی آواز بھی ضرور سن لی ہوگی۔ یہ آواز ہر فوجی پہچان لیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے رک جاؤ۔“

ہم دم سلاخے وہیں پر رہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اوپر کوئی مشین گن پوسٹ نہیں ہے تو میں نے قاسم کو اشارہ کیا۔ ہم دوڑ کر بھارتی سپاہیوں کی لاشوں کے پاس آ گئے۔ قاسم ان کی جیبیں اور بیٹلیں دیکھنے لگا۔ اسے ڈمپ کے دروازے پر لگے

ہم جس طرف سے آئے تھے اسی طرف سے ہو کر واپس جا رہے تھے۔ جب ہم جین مندر سے بھی آگے نکل گئے تو میں نے قاسم سے کہا۔

”بکس مجھے دے دو۔“

وہ ہانپ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”نہیں۔ تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو۔ میں جوان ہوں۔“

مگر میں نے زبردستی اس سے بکس لے لیا۔ قاسم واقعی بری طرح ہانپ رہا تھا۔ بکس کافی وزنی تھا۔ دو ایک میل تک میں بکس کو اٹھا کر چلتا گیا۔ آگے جہاں سے ہمیں شیر خان کے مکان کو جانے والی پگڈنڈی کی طرف مڑنا تھا قاسم نے بکس مجھ سے لے لیا۔

جب ہم رات کے اندھیرے میں شیر خان کے مکان پر پہنچے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے ایک اہم ترین مشن اتنی جلدی اور کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا ہے۔ شیر خان کے مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے خاص قسم کی دستک دی تو شیر خان نے ہی دروازہ کھولا۔ ہم تیزی سے اندر گھس گئے۔ مکناؤ خالد اور مکناؤ بارون میں سے کوئی نہیں سویا تھا۔ انہیں ہمارا انتظار تھا۔ قاسم کے کندھے پر بکس دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ مکناؤ خالد نے کہا۔

”میرا خیال ہے تم سو فیصد کامیاب لوٹے ہو۔“

میں نے بیٹھے ہوئے کہا۔

”یہ ایمنویشن کریم ہماری کامیابی کی نشانی ہے۔“

اسی وقت بکس کے اوپر والے تختے اٹھا ڈیے گئے۔ ایک کے بعد ایک اندر سے ٹائم بم نکلتے آئے۔ یہ انتہائی طاقتور دباؤ والے دھماکے خیز بارودی سکوں کو جوڑ کر بنائے گئے ٹائم بم تھے۔ ان میں مائیکرو ویو سکٹرز کے سوچ بھی تھے۔ ہر ٹائم بم کے ساتھ ریموٹ کنٹرول ٹیپ سے لگا ہوا تھا۔ ہم نے انہیں گنا۔ وہ پچاس ٹائم بم تھے۔ مکناؤ خالد نے کہا۔

”کرم داد! کیا خیال ہے ہمارے مکناؤ مشن کے لیے اتنے کافی رہیں گے؟“

میں نے کہا۔

”یہ بہت ہیں۔“

مجھ پر قاسم کہنے لگا۔

”وہاں ایمنویشن کے اور بھی بکس تھے۔“

میں نے کہا۔

”ہمیں جس قسم کے اسلحے کی ضرورت ہے وہ ہمیں مل گیا ہے۔ ہمارا ٹارگٹ ایسا ہے کہ اس کو تباہ کرنے کے لیے اسی اسلحے کی ضرورت تھی۔“

مکناؤ بارون ایک ٹائم بم کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ امریکی اسلحہ ہے۔“

مکناؤ خالد نے کہا۔

”امریکی ہی ہو گا جو بھارت کو اسرائیل کے ذریعے سپلائی ہوا ہے۔“

مکناؤ خالد نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”اب انہیں لگانے کا مسئلہ ہے۔ کرم داد! تم نے تو قاسم کے ساتھ ٹارگٹ سپاٹ کا معائنہ کیا ہے۔ تمہارے خیال میں ہمیں وہاں تک پہنچنے اور ان ٹائم بموں کو گمن پاؤ کے ساتھ چپکانے کے لیے اور کن چیزوں کی ضرورت ہوگی؟“

میں نے کہا۔

”مکناؤ! ابھی تو حقیقت یہ ہے کہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ یہ ساری باتیں کل کریں گے بالکل تازہ دم ہو کر۔“

”یہ تم نے میرے دل کی بات کسی ہے کرم داد۔“ قاسم نے جھلٹی لیتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر روانہ ہو گئے۔

اگلے روز ناشتے کے بعد مکناؤ خالد نے وہ کاپی نکل کر سامنے رکھ لی جس پر میری یادداشت کی بنیاد پر اس نے لیزر گن کے ٹارگٹ کا نقشہ تیار کیا ہوا تھا۔ میں، قاسم اور

میں پاکستان کے ساحلی شہر اور جہاز ہیں۔

ہارون کہنے لگا۔

”قاسم نے بالکل درست کہا ہے۔ ہمیں ہر قاسم کا خطرہ مول لے کر وہاں انٹیک کرنا ہوگا۔“

”لیکن ہمارا پلان کیا ہوگا؟“ کمانڈر خالد نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

”میرا تجربہ اور ٹریننگ یہ بتاتی ہے کہ ہم ان سارے بموں کو دو تھیلوں میں ڈال کر ساتھ لے جائیں گے۔ ہمارے لیڈر کے پاس ریموٹ کنٹرول ہوگا جس کا شن دیا کر وہ دھماکہ کرے گا۔ ہم ٹیل اور جنوب کی سمت سے گمن پوسٹ کی پہاڑی پر چڑھیں گے۔ گمن پوسٹ تک پہنچنے کے لیے ہمیں جس چیز کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہوگا وہ یہ ہے کہ راستے میں کسی دشمنی پٹرول کے سپاہیوں اور کسی مشین گن پوسٹ کے عملے کو کانوں کن خبر نہ ہو۔ اگر ہم گمن پوسٹ کے شگاف تک زندہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو پوسٹ کے بکھرے اندر چار بھارتی سپاہیوں کو قابو کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔“

ہارون، خالد اور قاسم بڑے غور سے میری بات سن رہے تھے۔ کمانڈر خالد نے قاسم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”قاسم! تمہارا کیا خیال ہے؟“

وہ میرے ساتھ ٹارگٹ کو دیکھ آیا تھا۔ کہنے لگا۔

”کرم داو! نے بالکل ٹھیک پلان پیش کیا ہے۔ کمانڈر! ہمیں دو دو کی ٹولی میں پہاڑی پر چڑھنا ہوگا۔ ایک ٹولی ٹیل کی طرف سے اور دوسری جنوب کی طرف سے آگے بڑھے گی۔ ہم ساحل سمندر کی طرف سے آپریشن شروع کریں گے۔ اس طرف مشین گن کی صرف دو ہی پوزیشن ہیں۔ ان کی نشان دہی ہم کر چکے ہیں۔ ہم ان سے دور رہنے کی کوشش کریں گے۔“

پھر اس نے نقشے پر سب کو وہ دونوں مشین گن مورچے دکھائے اور کہا۔

ہارون بھی دیکھ بیٹھ گئے۔ ہم کافی دیر تک سوچ بچار کرتے رہے۔ رات کے اندھیرے میں ہم کسی نہ کسی طرح لیڈر گن کی پہاڑی پر تو پہنچ سکتے تھے مگر سب سے مشکل مرحلہ ان ٹائم بموں کو گمن کے بکھرے اندر جا کر انہیں لیڈر گن کے ساتھ اور اس کے فولادی پیڈ کے نیچے چپکانا تھا۔ میں نے گمن پوسٹ کے بکھرے اندر چار فوجی سپاہیوں کو دیکھا تھا۔ کمانڈر خالد کہنے لگا۔

”وہاں اور بھی سپاہی ضرور ہوں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت اپنی اپنی باری پر صرف چار سپاہی ہی گاڑ ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔“

مجاہد قاسم بولا۔

”ان سب پر ہم کیسے قابو پا سکیں گے؟ یہ کام ہمیں ایک ہی وقت میں کرنا ہوگا۔“

ہارون کہنے لگا۔

”ہم چار آدمی ہوں گے۔ میں، کمانڈر خالد، کرم داو اور قاسم بھائی۔ ہم چاروں ایکدم سے بکھر کر ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ قابو کیا پانا ہے بس انہیں قتل کرنا ہے اور وہ ہم کر سکتے ہیں۔“

کمانڈر خالد نے کہا۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ وہاں کوئی کلوز سرکٹ کیمرہ تو نہیں لگا ہوا اور کوئی خفیہ خطرے کا الارم تو نہیں ہے۔ ان دونوں حالتوں میں ہم فوراً پکڑ لیے جائیں گے بلکہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔“

میں نے کہا۔

”میں نے بکھر کے شگاف سے اندر کا جو جائزہ لیا تھا۔ وہاں مجھے کسی کوئے میں کوئی کلوز سرکٹ ٹیلی ویژن کیمرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ باقی خطرے کا الارم تو وہاں کا کوئی ڈیوٹی گاڑ ہی شن دیا کر بجا سکتا ہے۔ ہم اسے اتنا موقع ہی نہیں دیں گے۔“

مجاہد قاسم بولا۔ ”کمانڈر! اگر ہم ان باتوں کو سوچتے رہے تو ہم اپنا مشن کلاسیائی سے مکمل نہ کر سکیں گے۔ ہمیں ہر حالت میں دشمن کی اس گمن کو جلا کرنا ہے جس کی زد

ہارون نے کہا۔

”ہم رات کو جس فوجی کیمپ کے ذخیرے کو توڑ کر وہاں سے بموں کا بکس اڑا لائے ہیں اس کا علم فوج کو ہو گیا ہوگا۔ اس بات کا امکان ہے کہ پہاڑی والی گن پوسٹ پر بھی سیکورٹی سخت کر دی گئی ہو۔“

میں نے کہا۔

”اگر ہم نے آج رات انٹیک نہ کیا تو کل پرسوں تک ممکن ہے کہ کھیاواڑ سے مزید فوجی دستے آجائیں اور سیکورٹی اتنی سخت ہو جائے کہ ہمارے لیے یہ مشن ناممکن ہو جائے۔“

کرم داو کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔“ خالد نے کہا۔ ”ہمیں آج رات کو ہی اپنے ٹارگٹ پر انٹیک کر دینا ہوگا۔ سیکورٹی تو سخت ہوتی ہی ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

آخر سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ ہمیں اسی رات کو اپنے مشن پر روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس وقت دن کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ باہر دھوپ نہیں تھی۔ آسمان ہلکے بادلوں میں چھپ گیا تھا اور کھڑی میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

”میرا خیال ہے زرا باہر کھلی ہوا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ دماغ تروتازہ ہو جائے گا۔ ہم جس مشن پر جا رہے ہیں، یہ موت کا مشن ہے۔ کیا خبر پھر یہ ٹھنڈی ہوا کے بھروسے نہیں کبھی نصیب نہ ہوں۔“

خالد نے شیرخان کی طرف دیکھا۔

”کیوں شیرخان تمہارا کیا خیال ہے۔ ہمیں مکان کے باہر بیٹھنا چاہیے یا نہیں؟“

وہ بولا۔

”مکان کے بچھواڑے ایک چارپائی پیچھی ہوئی ہے۔ وہاں تھوڑی دیر جا کر بیٹھ جائیں۔ اس طرف سامنے کوئی مکان بھی نہیں ہے۔“

شیرخان دوسرے کمرے میں جا کر کھانا وغیرہ تیار کرنے میں لگ گیا۔ میں، کمانڈو

”یہ ایک مورچہ ہے۔ ہمیں قدموں کے فاصلے پر اس کے بالکل متوازی دوسرا مشین گن مورچہ ہے۔ ہم اس کے دائیں بائیں سے ہو کر رات کے اندھیرے میں پہاڑی کے شگاف کی طرف جائیں گے۔ یہاں چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں پیٹ کے بل لیٹ کر اوپر چڑھنا ہوگا۔“

کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون نقشے کی وہ جگہ غور سے دیکھنے لگے جہاں مشین گن مورچوں کے نشان بنائے گئے تھے۔

شیرخان چائے بنا کر لے آیا۔ خالد نے نقشے والی کاپی ایک طرف رکھ دی اور ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کرم داو! تم ہم میں سب سے زیادہ تجربہ کار اور سند یافتہ تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ تمہارے خیال میں ہمیں اپنے ساتھ اور کیا اسلحہ لے جانے کی ضرورت ہے؟“

میں نے کہا۔

”کمانڈر! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی یہی کہوں گا کہ ہمیں سوائے بارودی شکنوں والے ٹائم بموں کے اور کسی اسلحہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس آٹومٹک ہتھول اور کمانڈو چاقو تو ضرور ہوں گے۔ ہم اپنے ساتھ دستی بم بھی نہیں لے جاسکتے۔ اگر ہم نے وہاں دستی بم سے ایک بھی دھماکہ کر دیا تو علاقے کی ساری یونٹیں بیدار ہو جائیں گی اور روشنی کے گولوں سے سارا آسمان سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو جائے گا اور ہم میں سے کوئی بھی واپس نہ آ سکے گا اور ہم اپنا ٹارگٹ بھی نہیں مار سکیں گے اور یہ ہماری سب سے بڑی بد نصیبی ہوگی۔“

کافی دیر تک ہماری خفیہ میٹنگ جاری رہی۔ آخری یہ طے پایا کہ ہم دو کمانڈو پارٹیوں کی شکل میں چلیں گے۔ ایک کمانڈو پارٹی کو قاسم گھنیز کرے گا اور ایک کمانڈو پارٹی کو میں گھنیز کروں گا۔ کیونکہ ہم دونوں نے پہاڑی علاقے کا راستہ دیکھا ہوا تھا۔

قاسم کہنے لگا۔

”ہمیں آج رات کمانڈو انٹیک کر دینا چاہیے۔“

خالد، کمانڈو ہارون اور مجلہ قاسم مہکن کے بچھواڑے آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں پتھر ٹکڑے ہوئے تھے کہیں جھاڑیاں تھیں۔ میں چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اچانک میرے قریب بیٹھے ہوئے قاسم نے اچھل کر ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔

”سناپ کرم دادا“

مجھے اپنی گردن پر سناپ رہنٹا ہوا محسوس ہوا۔ یہ میری جیکٹ پر سے ہو کر میری گردن پر پہنچا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس پر ہاتھ مارا اور جلدی سے اسے دبوچ لیا۔ اس دوران سناپ نے میری گردن پر ڈس دیا تھا مگر میں نے سناپ کو نہ چھوڑا۔ سناپ کو ڈستے ہوئے کمانڈو خالد نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کرم دادا! تمہیں سناپ نے کٹ لیا ہے۔“

میں نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“

قاسم، ہارون اور خالد ڈر کر مجھ سے ایک قدم پیچھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ سناپ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اس کو گردن سے دبوچ رکھا تھا۔ خالد پریشان ہو کر بولا۔

”کرم دادا! اندر چلو پلیز! شاید شیر خان کے پاس سناپ کے کاٹنے کی کوئی دوا ہو۔“

قاسم نے کہا۔

”ہمیں کرم دادا کو ہسپتال لے چلنا چاہیے۔“

میں نے کہا۔

”پلیز! ایک منٹ کے لیے خاموش ہو جائیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر سناپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ سناپ اگر آدمی کی گردن پر کاٹے تو زہر کا اثر بڑی تیزی سے دماغ تک پہنچ کر آدمی کے اعصاب کو ساکت کر دیتا ہے اور آدمی کی فوراً موت واقع ہو جاتی ہے مگر میرے ساتھ

ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ان سب دوستوں کو علم تھا کہ میں کبھی سناپ کی جون بدل لیتا ہوں۔ میں نے کہا۔

”دوستو! مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ سناپ کے زہر نے میرے خون پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ میرے اندر کبھی کبھی سناپ کے روپ میں آنے کی وجہ سے جو زہر جمع ہو گیا ہوا ہے اس نے سناپ کے زہر کو بے اثر کر دیا ہے۔“

وہ لوگ بھی تعجب سے مجھے دیکھ رہے تھے کیونکہ میرے جسم پر زہر کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

”خدا کے لیے اس سناپ کو تو مار ڈالو۔“

مگر میں اس سناپ کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ سناپ کے ڈسنے کی وجہ سے میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب سکیم جنم لے چکی تھی۔ میں نے یہ سکیم خفیہ ہی رکھی اور خالد سے کہا۔

”میں ابھی اس سناپ کو مارنا نہیں چاہتا۔“

میں نے سناپ کو الٹا کر کے دیکھا اور کہا۔

”یہ مادہ ناگن ہے۔ اس کا زہر بھی نہیں کہیں ہوگا۔“

کمانڈو ہارون نے کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو کرم دادا! تمہیں اس کے زہر سے کیا دلچسپی ہے۔ خدا کے واسطے اس موذی کا سر پھیل دو۔“

میں نے ہنس کر کہا۔

”ہو سکتا ہے یہ بھی میری طرح کا انسان ہو جو میری ہی طرح کی مصیبت میں گرفتار ہو اور انسان سے جون بدل کر سناپ بن گیا ہو۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”کرم دادا! مذاق بہت ہو چکا۔ اس سے پہلے کہ یہ سناپ تمہارے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کو ڈس دے۔ اسے مار ڈالو۔“

”تم اسی جگہ ٹھہرو۔“

میں جھاڑیوں میں چلا گیا۔ اچانک ایک جھاڑی میں سے پھنکار کی آواز آئی اور ایک نیلے رنگ کے سانپ نے تیزی سے لپک کر میری پنڈلی پر ڈس دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے وہیں اس کی دم دبوچ کر اسے اٹھالیا۔ دونوں سانپ میرے ہاتھوں میں تھے۔ دونوں میرے ہاتھوں میں لٹک رہے تھے اور مجھے ڈسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری پنڈلی ایک دو سینکڑ کے لیے گرم ہو کر پھر اپنی نارمل حالت میں آگئی تھی۔ اس سانپ کے زہر نے بھی مجھے کچھ نہیں کما تھا۔ کمانڈو خالد نے میرے دوسرے ہاتھ میں بھی سانپ دیکھا تو گہرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس نے بھی مجھے ڈس لیا ہے مگر مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے تو اب پتہ چلا ہے کہ مجھ پر سانپ کے کاٹنے کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ آج تو یہاں پر چلتے ہیں۔“

”مگر ان سانپوں کو کیوں لے جا رہے ہو؟“

خالد نے حیرانی سے پوچھا۔ میں نے کہا۔

”یہ میں تمہیں کمرے میں جا کر بتاؤں گا۔“

ہم شیر خان کے مکان والے کمرے میں آ گئے۔ وہاں ہارون اور قاسم پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھوں میں دو سانپ دیکھ کر وہ بھی گہرا گئے۔ میں نے قاسم سے کہا۔

”گہرا نے کی ضرورت نہیں قاسم۔ شیر خان کے پاس جاؤ اور کوئی موٹے پلاسٹک کا تھیلا ہو تو لے آؤ۔“

قاسم دو ڈکر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں شیر خان کھانا تیار کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس کو قاسم نے جب بتایا کہ کرم دادو دو سانپ پکڑ لایا ہے اور پلاسٹک کا تھیلا مانگ رہا ہے تو وہ آگیا۔ میرے ہاتھوں میں سانپ دیکھ کر ڈر گیا۔

”بھائی کرم دادا! ان موزیوں کو یہاں کیوں لے آئے ہو؟“

میں نے کہا۔

”کمانڈو خالد! تم میرے ساتھ آؤ، ہارون اور قاسم بھائی تم بے شک اندر چلے

جاؤ۔“

کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن میرے اصرار پر قاسم اور ہارون مکان کے اندر چلے گئے اور کمانڈو خالد وہیں کھڑا رہا۔ ”تم کہاں جانا چاہتے ہو؟“ خالد نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے سانپ کی گردن کو اچھی طرح سے دبوچ لیا۔ اس خیال سے نہیں کہ دوسری دفعہ مجھے کٹ ڈالے گا اور مجھ پر ہو سکتا ہے دوسری بار ڈسنے سے زہر کا اثر ہو جائے کیونکہ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ سانپ چاہے ساری رات مجھے ڈستا رہے اس کے زہر کا مجھ پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہو گا۔ میں نے سانپ کی گردن اس لیے دبوچ رکھی تھی کہ میں اس کے زہر کو منہ کے اندر ہی محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سانپ کے زہر سے برا ضروری کام لیتا تھا۔

میں نے خالد سے کہا۔

”کمانڈر! میرے ساتھ آؤ۔ میں اس مادہ ناگن کے ز سانپ کو بھی پکڑنا چاہتا ہوں۔“

کمانڈو خالد کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکا کہ میں اسے کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں مگر وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں نے ناگن سانپ کو اس کی دم سے پکڑ کر اسے نیچے ٹٹکا لیا۔ اب وہ میرے پیچھے ہوئے بازو کے ساتھ جھول رہی تھی اور منہ اوپر لا کر میری کلانی پر ڈسنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک تو ناگن کی لمبائی زیادہ تھی دوسرے میں اسے اوپر نہیں آنے دے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر مادہ ناگن یہاں پر ہے تو اس کا ز سانپ بھی ضرور یہیں کہیں ہو گا۔ ایک جگہ جھاڑیوں کے پاس آ کر ناگن سانپ نے پھنکارنا شروع کر دیا۔

میں نے خالد سے کہا۔

سکیم ہے اگر میری سکیم کامیاب ہوگئی تو تم سب کو اپنے آپ پتہ چل جائے گا کہ میں نے یہ سانپ کیوں پکڑے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادہ نامگن نے مجھے ڈس کر خود یہ سکیم بتائی ہے۔“

”تو کیا تم ان سانپوں کو ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟“

کمانڈو خالد نے اس سوال پر میں نے کہا۔

”ارادہ تو یہی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ میں چاہتا ہوں دوستو! کہ ان سانپوں

کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھا جائے۔“

”اوکے، اوکے۔“

کمانڈو خالد نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اب تم سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔“

میں نے شیر خان سے کپڑے کا ایک ٹھیکہ منگوا کر سانپوں والے ڈبے کو تھیلے میں

ڈال کر اوپر سی پیٹ دی۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد ہم سب سو گئے۔ رات کو ہمیں بڑے اہم کمانڈو مشن

پر جانا تھا۔ ہم شام تک سوئے رہے شام کو چائے پی اور اپنے اپنے آؤٹ فیک پتوں کو

چیک کر کے ان میں نئے میگزین ڈالے۔ رات کے نو بجے ہم نے کھانا کھایا۔ اس کے

بعد کٹنی بنوا کر پی مالکہ جسم چوس رہے۔ ساڑھے دس بجے ہم سب نے کمانڈو کی

دوریاں پن لیں۔ طے یہ ہوا کہ ایک کمانڈو پارٹی میں میرے ساتھ کمانڈو خالد ہوگا اور

دوسری کمانڈو پارٹی میں مجاہد قاسم کے ساتھ ہارون ہوگا۔ قاسم اس پارٹی یعنی ہارون کو

گائیڈ کرے گا۔ جب رات کو پورے بارہ بج گئے تو خالد نے شیر خان کو اشارہ کیا وہ باہر

کی فضا کی دیکھ بھال کو نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آگیا اور بولا۔

”اوکے کمانڈو! سب ٹھیک ہے۔“

ہم نے اپنی اپنی جگہ گھڑیاں ملا لیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک چاقو

اور ایک ایک آؤٹ فیک پتوں تھا جس کی ٹلی پر سلیٹر چڑھا ہوا تھا۔ ہم سیاہ جینٹ اور

کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

”اگر گھر میں موٹے پلاسٹک کا تھیلہ ہو تو لے آؤ۔“

وہ بولا۔

”تھیلہ تو نہیں ہے، ہناسپتی گھی والا پھوٹا خالی ڈبہ ہے۔“

میں نے کہا۔

”وہی لے آؤ۔“

شیر خان ہناسپتی گھی کا گول ڈبہ لے آیا۔ اس کا سائیز درمیانہ تھا۔ میں نے قاسم

سے کہا۔

”ڈبے کا ڈھکنا کھول کر میرے آگے کر دو۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کوشش کر کے دونوں سانپوں کو ڈبے میں ڈال کر

اس کا ڈھکنا بند کر دیا۔ کمانڈو خالد نے میرے جسم پر اس جگہ کو دیکھا جہاں مجھے دونوں

سانپوں نے کاٹا تھا۔ یہ دیکھ کر میں خود حیران رہ گیا کہ وہاں ذرا سی بھی سوجن نہیں پڑتی

تھی۔ صرف سانپ کے دانتوں کا نشان تھا جہاں تھوڑا سا خون نکل کر جم گیا تھا۔

شیر خان کہنے لگا۔

”بھائی کرم دادا کیا تم سپرے بھی ہو؟“

میں نے ہنس کر کہا۔

”میں سپرے ہی نہیں سانپ بھی ہوں۔“

اس پر کمانڈو خالد اور میرے دوسرے ساتھی ہنسنے لگے۔ وہ میرے سانپ بن جانے

کے راز کو جانتے تھے۔ شیر خان کو معلوم نہیں تھا۔ وہ چلا گیا تب خالد نے مجھ سے

پوچھا۔

”اب بتاؤ تم نے یہ سانپ کیوں پکڑے ہیں؟“

میں نے کہا۔

”ہات یہ ہے کہ میں راز ابھی کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتا۔ میرے ذہن میں ایک

ڈال سکتی تھی۔ میں نے سائپوں والا تھیلا اپنی کر کے گرد ری سے باندھا ہوا تھا۔ ان سائپوں سے مجھے وہ کام لینا تھا جو ہم نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کر سکتے تھے تو اس میں کامیابی کے چانس بہت کم تھے۔ اسی طرح بے حد محتاط رہ کر چلتے چلتے آخر ہم اس مقام پر آ گئے جہاں ہماری ایک جانب شگلاخ ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہاں سے ہم چٹانوں کی آڑ لیتے ساحل سمندر کی طرف ہو گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں سمندر میں دو رکھڑے ایک جہاز کی دھندلی روشنیوں نظر آنے لگیں۔ ہم بائیں جانب مڑ گئے۔ دو سو گز تک ہم اونچی نیچی سمندری چٹانوں کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے چلتے گئے۔ میں اور مجاہد قاسم آگے آگے تھے۔ کیونکہ ہمیں یہ رستہ یاد تھا۔ کمائڈو خالد اور کمائڈو ہارون ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ہم اس پہاڑی کے دامن میں آ گئے جس کی چوٹی پر بڑی لیزر گن کا مورچہ تھا۔ یہاں آ کر ہم اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی پارٹی سے دھیمی آواز میں کہا۔

”یہاں سے ہمارے ٹارگٹ کا اصل اور خطرناک علاقہ شروع ہو رہا ہے۔ دو سو گز کی چڑھائی کے بعد ہم دو دو کی ٹولیاں میں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اب ہم آپس میں کوئی بات چیت نہیں کریں گے۔ ساری باتیں اشاروں میں ہوں گی۔ جب ہم الگ الگ ہو جائیں گے تو اس کے بعد ہمیں کیڑے مکوڑوں کی طرح پہاڑی چڑھائی پر رینگنا ہوگا۔ آؤ میک پستول کے فائر سے گریز کرنا ہوگا۔ انتہائی ضرورت کے وقت کمائڈو چاقو سے کام لینا ہوگا۔ کھانسی چھینک کو ہر حالت میں روکنا ہوگا۔ اوکے۔“

ہم نے اللہ کا نام لے کر پہاڑی کی ڈھلان پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ہم رات کی تاریکی میں پتھروں پر پاؤں جما ہمارا چڑھ رہے تھے۔ ابھی چڑھائی سیدھی اور مشکل نہیں تھی۔ جب ہم تقریباً دو ڈھائی سو گز کا فاصلہ طے کر چلے تو مجاہد قاسم نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو جگہ سے زمین ابھری ہوئی تھی۔ میں اور مجاہد قاسم نے پہچان لیا تھا کہ یہ دشمن کی مشین گن پوزیشن تھیں۔ میں نے یہ مورچے دور سے کمائڈو خالد کو بھی دکھائے اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

چٹانوں میں تھے۔ اندھیرے میں ہمیں دیکھنا مشکل تھا۔ میں اور قاسم ذرا آگے آگے اپنے ساتھیوں کو گائیڈ کرتے چل رہے تھے۔ ہم نے اپنی رفتار مکان سے نکلے ہی تیز کر لی تھی۔ تاکہ اپنے ٹارگٹ پر جلدی پہنچ سکیں۔ رات تاریک تھی۔ آسمان پر پتلے بادلوں کی وجہ سے ستارے کہیں کہیں بڑے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا بند تھی۔ قاسم کہنے لگا۔

”خدا کرے کہیں بارش نہ ہو جائے۔“

کمائڈو خالد نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ بادل بارش والے نہیں ہیں۔“

مجھے اور قاسم کو سارا رستہ یاد تھا۔ ہم ایک گھنٹے میں ان پہاڑیوں کے دامن میں ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں جوار بھاتا کی سمندری لہروں کا پانی جگہ جگہ نشیبی علاقے میں بھرا ہوا تھا۔ یہاں سے ہم نے راستہ بدل لیا۔ کیونکہ ہمیں سمندر کی طرف سے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا تھا۔ اس طرف راستے میں بڑی توپوں کے بکھرے تھے اور مشین گنوں کے مورچے بھی تھے۔ جبکہ سمندر کی جانب پہاڑی ڈھلان پر ہمیں صرف دو مشین گن پوزیشنیں نظر آئی تھیں۔ ہمیں صرف ان گن پوسٹوں اور گشتی پٹرول کے سپاہیوں سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ لیکن اب ہم اس پوزیشن میں تھے کہ اگر کوئی ابھرنیسی والی صورت حال پیدا ہوگئی تو گشتی پارٹی کے سپاہیوں کو وہیں ڈھیر کر دیں کیونکہ ہمیں دوبارہ اس طرف نہیں آنا تھا۔ اگر ہم زندہ بچ گئے تو!

ہم پہاڑی کی طرف جانے کی بجائے اس کے دامن میں چٹانوں اور پتھروں کے درمیان سے ہو کر شمال مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جس طرف سمندر کا ساحل تھا۔ ہمیں اسی طرف سے پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ اس طرف گشتی پارٹی کے سنتریوں کا بھی خطرہ کم ہی تھا۔ کیونکہ یہ علاقہ گن پوسٹ سے کافی دور تھا۔

زمین ریتی شروع ہو گئی تھی جہاں کہیں کہیں سمندر کا پانی کھڑا تھا۔ میں دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ بارش نہ شروع ہو جائے۔ بارش ہمارے مشن کی راہ میں رکاوٹیں

کمانڈو چاقو ہم نے اپنے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے۔ ہماری آنکھیں چلاک چیتے کی آنکھوں کی طرح اندھیرے میں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پہاڑی گن پوسٹ والے شگاف کی دھیمی روشنی قریب ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں پہاڑی کی ڈھلان پر ایک پگڈنڈی آتی ہے جہاں گزشتہ رات ٹائیٹ پٹرول کے سنتری ہم نے ایک دوسرے سے باتیں کرتے گزرتے دیکھے تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کے کندھے کو آہستہ سے دھلیا۔ وہ رک گیا۔ میں نے اوپر کی طرف اشارہ کر کے انگلیوں کو دائیں بائیں تھمایا۔ اس کا مطلب تھا کہ آگے خطرہ ہے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرف سے گشت لگتے سنتری تو نہیں آ رہے۔ جب میری تسلی ہو گئی کہ ادھر کوئی رات کو گشت لگانے والی پارٹی نہیں ہے تو میں نے ریگنا شروع کر دیا۔ کمانڈو خالد نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب ہم پہاڑی کی پگڈنڈی پر پہنچے تو اچانک ایک طرف سے باتیں کرنے اور ہلکے قہقہے کی آواز سنائی دی۔

آواز بڑے قریب سے آئی تھی۔ میں نے کمانڈو خالد کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ مارا اور تڑپ کر پگڈنڈی پار کر کے دوسری طرف ایک پتھر کے چپچپے اپنے آپ کو گرا دیا۔ کمانڈو خالد نے بھی بالکل ایسے ہی کیا۔ پتھر بڑا نہیں تھا اگر پگڈنڈی پر سے گزرتے ہوئے کوئی ہماری طرف دیکھتا تو ہم نظر آسکتے تھے۔ صرف رات کا اندھیرا ہی ہمیں کسی حد تک بچا سکا تھا۔ ہم اوپر چڑھائی پر بھی نہیں چھپ سکتے تھے۔ اتنی دیر میں دو گشتی سنتری جو ٹائیٹ پٹرول پر تھے پہاڑی کے پہلو سے نمودار ہو کر پگڈنڈی پر آچکے تھے۔ ہم مرہہ ساتوں کی طرح اندھیرے میں بیٹھ کے بل پڑے تھے اور آنکھیں پھاڑے دشمن کو قریب آتا دیکھ رہے تھے۔ میری نگاہیں بھارتی سپاہیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ چاقو پر میری گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا خالد کی بھی یہی کیفیت تھی۔ میں نے انگلی کے اشارے سے ایک سنگل دیا۔ وہ اوندھے پڑے پڑے لڑھک کر دو قدم پرے ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے اسے کیا سنگل دیا ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ہم بچ نہیں سکتے۔ بھارتی سپاہیوں کی ہمارے قریب

”تمہیں اور ہارون کو ان مشین گن مورچوں سے بہت چوکس رہ کر گزرتا ہو گا۔“
میں سے تم ریک کر آگے بڑھو گے۔“
پھر میں نے اوپر پہاڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ اوپر ایک جگہ ہلکی ہلکی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ میں نے کمانڈو خالد کو روشنی کا وہ سپاٹ دکھایا اور سرگوشی میں کہا۔
”یہ بڑی لیزر توپ کے بکر کی روشنی ہے۔ قاسم اور ہارون اس شگاف کی دوسری جانب سے نمودار ہو گے۔ میں اور تم اس طرف سے جائیں گے۔ بکر کے شگاف پر پہنچ کر تم لوگ صرف ہمیں اپنے چہرے دکھاؤ گے۔ اس کے بعد جب میں اشارہ کروں گا تو تم بکر کے اندر کود پڑو گے۔ میرے اشارے کے بغیر تم دم مارو گے وہیں بیٹھے رہو گے۔ اوکے؟“

کمانڈو خالد نے سرگوشی میں کہا۔

”اوکے!“

”اوکے!“

اس مقام سے ہماری کمانڈو پارٹی دو دو کی ٹیلیوں میں بٹ لٹی مجاہد قاسم، کمانڈو ہارون کو لے کر دوسری طرف اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں اور کمانڈو خالد پہاڑی کی اپنی طرف والی ڈھلان پر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگے۔ اس جانب گشتی سنتریوں کے پٹرول کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس علاقے کو ہم نے اس لیے منتخب کیا تھا۔ یہاں دشمن نے صرف دو مشین گن مورچے ہی کافی سمجھے تھے۔ آہستہ آہستہ پہاڑی کی چڑھائی سیدھی ہوتی گئی۔ پھر بیٹھ کر اور جبکہ کر چڑھائی چڑھنا مشکل ہو گیا۔ ہم بیٹھ کے بل ریگنے لگے۔ سب سے زیادہ احتیاط ہمیں یہ کرنی پڑ رہی تھی کہ ہمارے جسموں سے دب کر یا لگ کر کوئی پتھر پیچھے نہ لڑھک جائے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ ریک رہے تھے۔ میں کمانڈو خالد کا کانٹہ بھی تھا۔ میں اسے اسی راستے سے لے جا رہا تھا جس راستے سے میں اور قاسم ایک رات پہلے ریکی کر چکے تھے۔ ہم کافی اوپر آ گئے تھے۔ سمندر کی طرف سے لہروں کے پتروں اور چٹانوں سے کمرانے کی آواز بڑی مدھم سنائی دے رہی تھی۔

سپاہی نے ایسا بھی نہیں کیا۔ میں وہ غلطی کرنے کی حالت میں نہیں تھا جو اس سپاہی نے کی تھی۔ اس سے پہلے کی بھارتی سنتری کا پورا جملہ ختم ہوتا میں اس پر اور کمائڈو خالد دوسرے سنتری پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ چھلانگ لگانا گردن کو کھینچنے میں لینا اور دشمن کے حلق پر پوری طاقت سے حاوی پھیرنا یہ تینوں کام ایک ہی ایکشن میں ہو گئے تھے۔ کمائڈو خالد نے بھی اپنی زد میں آئے ہوئے بھارتی سپاہیوں کو کوئی آواز نکالنے کی مصلحت نہیں دی تھی۔ مجھے اس کا ڈر تھا کیونکہ وہ فوجی کمائڈو نہیں تھا۔ اس کو فوجی کمائڈو ٹریننگ نہیں ملی ہوئی تھی پھر بھی اس نے مکمل کر دکھایا۔

دوسرے لمحے دونوں بھارتی سپاہیوں کی لاشیں رات کے اندھیرے میں پہاڑی گنڈھڑی پر اوندمی پڑی تھیں۔ ہم نے جلدی سے ان لاشوں کو تحیث کر پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے کر لیا۔ یہاں سے وہ دیکھے نہیں جاسکتے تھے۔ ہم اس کام سے فارغ ہو کر بے دم سے ہو کر ڈھولوں زمین پر اوندمی پڑ گئے تھے۔ ہمارے سانس پھول رہے تھے۔ میں نے کمائڈو خالد کو اوپر توپ کے مورچے کے شگاف میں سے آتی روشنی کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھنے کا سگنل دیا۔ ہم اوپر کی طرف ریپٹلے لگے۔ آہستہ آہستہ مورچے کے شگاف کی روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن اپنی دوسری کمائڈو پارٹی کی طرف بھی لگا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ مشین گن کے مورچوں کا تھا جہاں اپنے دونوں ساتھیوں کو بڑے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ لیکن قاسم کمائڈو ہارون کے ساتھ تھا اس لیے مجھے تھوڑا بہت اطمینان تھا۔ چاہے قاسم اس جگہ کے سارے نشیب و فراز سے واقف تھا ابھی تک اس طرف کوئی خطرناک صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی، ورنہ مشین گنوں کے دھماکے سنائی دینے لگ جاتے اور روشنی راؤنڈ فائر ہو کر سارے علاقے میں دن کی روشنی کر دیتے۔

ہم ککجوروں کی طرح ریپٹلے ہوئے توپ کے مورچے کے دہانے کے بالکل قریب پہنچ کر وہیں دیک کر بیٹھ گئے۔ ہم دم سلاخے بیٹھے تھے اور ہمارے کان شگاف کے اندر سے آنے والی تک تک کی آواز پر گتے تھے۔ یہ کمپیوٹر کی آواز تھی۔ کوئی شخص

سے گزرتے ہوئے ہم پر ضرور نظر پڑ جاتی تھی۔ ایک سپاہی میری جانب چلا آ رہا تھا۔ دوسرا سپاہی کوئی دو تین فٹ پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں کے پاس شین گتیں یا برین گتیں تھیں جو ان کے کندھوں سے لگی ہوئی تھیں۔ میں نے کمائڈو خالد کو جو سگنل دیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں پیچھے آنے والے بھارتی سپاہیوں کو نشانہ بنائوں گا اور وہ ذرا آگے چلنے والے سنتری کو روکے گا۔

یہ ایکشن اتنا آسان نہیں تھا۔ کوئی آسان زاویہ بھی نہیں بن رہا تھا۔ ہمیں چیتے کی طرح زمین سے اچھل کر دشمن کی گردنوں پر وار کرنا تھا۔ اور اس طرح وار کرنا تھا کہ ایک ہی وار میں دشمن کی سر رگ کٹ جائے یا گردن کا منکا ٹوٹ جائے اور وہ کوئی آواز نہ نکال سکے۔ یہ کام بیک وقت ہونا تھا۔ اس ایکشن میں ایک سیکنڈ کا وقفہ ہمارے سارے منصوبے کو ہمارے ساتھ ہی خاک میں ملا سکتا تھا۔ پہاڑی کی یہ گنڈھڑی چونکہ زیادہ چوڑی نہیں تھی اس لیے لا محالہ دونوں سنتریوں کو ایک دوسرے کے پیچھے چلنا پڑ رہا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی اور خوشگوار موڈ میں چلے آ رہے تھے اور کسی وقت باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ میری نگاہیں پیچھے آنے والے سنتری پر جم گئی تھیں۔ جیسے ہی یہ سنتری ہمارے قریب سے گزرے ان میں سے جو آگے تھا اس نے اندھیرے میں کمائڈو خالد کو دیکھ لیا اور پوچھا۔

”کون ہے؟“

یہ ہماری خوش قسمتی اور خوش نصیبی تھی کہ اس اناڑی بھارتی سپاہی نے کمائڈو خالد پر فائر نہیں کیا تھا حالانکہ جس قسم کے نازک اور حساس علاقے میں وہ پڑونگ ڈیوٹی پر تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ اندھیرے میں کسی انسان کو دیکھتے ہی فائر کر دے مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ وہ اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ فوجیوں کی طرح بلند آواز میں بولتا تو ڈر تھا کہ قریبی مشین گن پوسٹ تک اس کی آواز پہنچ جاتی اور وہ لوگ الٹ ہو جاتے یا مشین گن کی بوچھاڑیں مارنے لگتے اور روشنی کے راؤنڈ بھی فائر کر دیتے۔ جن کی روشنی میں ہم صاف نظر آسکتے تھے۔ مگر اس نا تجربہ کار بھارتی



مجھے سگریٹ کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔

مورچے کے اندر کسی نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اپنے سر کو اوپر کھٹکے لگا۔ پھر جب صرف میری آنکھیں بکھر گئے وہاں کے کناروں سے ذرا اوپر ہوئیں تو مجھے وہاں جو منظر نظر آیا وہ یہ تھا کہ کپیوٹر پر بیٹھا ہوا فوجی اسی طرح بیٹھا کالم کر رہا تھا اور بار بار کپیوٹر کی سکرین کو دیکھتا جاتا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک سنتری شین گن کدھے سے لٹکائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرا سنتری لیئر گن کے بالکل سامنے سٹول پر بیٹھا اپنی برین گن کو کھٹھوں پر رکھے کپڑے سے اس کی ٹالی کو رگڑ رہا تھا۔ اتنے میں اچانک مجھے وہاں کے سامنے والے سرے سے ایک انسانی سرا بھرا دکھائی دیا۔ یہ مجاہد قاسم تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہماری دوسری کمانڈو پامنی فیریٹ سے ٹارگٹ تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر انگلی سے اشارہ کیا۔ مجاہد قاسم نے میرے اشارے کو دیکھا اور جلدی سے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اب مجھے تپ کا پتا نہیں تھا جو ڈالڈا گھی کے ڈبے میں بند تھا۔ میں نے بڑے آہستگی سے ڈبے کا ڈھکن کھولا کہ اس کی ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر ایک سانپ کو گردن سے دبوچ لیا۔ اس نے مجھے فوراً ہاتھ پر ڈس لیا۔ میں نے اسے باہر نکال کر دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن کو پکڑ لیا اور پھر دوسرے سانپ کو بھی نکال کر اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ ڈبے کو میں بڑی

کپیوٹر پر کالم کر رہا تھا۔ شگاف میں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ ہم اندھیرے میں پہاڑی دیوار کی اوٹ میں تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کو وہیں دیکے رہنے کا اشارہ دیا اور خود آہستگی سے سر کو اونچا کیا اور شگاف کے وہاں سے اندر بکھر میں دیکھا۔ بکھر میں خطرناک لیئر گن اپنے فولادی پانی پاؤں پر کسی عفریت کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بکھر میں روشنی ہو رہی تھی۔ سامنے والے پینل پر ایک بارودی سپاہی کپیوٹر کے آگے بیٹھا کالم کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں سر نیچے کرنے ہی لگا تھا کہ توپ کے پیچھے سے دو بھارتی سپاہی اندر آ گئے۔ میں نے جلدی سے سر نیچے کر لیا۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کمانڈو خالد خرگوش کی طرح دیک کر اندھیرے میں پتھروں سے لگا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے جلدی سے نیچے ہوتے دیکھا اور مورچے کے اندر سے آوازیں آتی سنیں تو سمجھ گیا کہ خطرہ سر پر منٹلا رہا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چپتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے آہستہ سے کمر کے ساتھ بندھا ہوا سانپوں کے جوڑے کا تھیلہ اتار دیا۔ دونوں ڈھیریلے سانپ ڈالڈا گھی کے ڈبے میں بند تھے۔ ڈبے باہر نکل کر میں نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ ان سانپوں کو میں نے اسی نازک کھڑی گے لیے پکڑا تھا۔ کمانڈو خالد ضرور اس وقت مجھے حیران آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا۔ لیکن اس وقت میں اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری ساری توجہ اوپر مورچے سے آنے والی آوازوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔



آہستگی اور احتیاط کے ساتھ رکنا چاہتا تھا لیکن میرے دونوں ہاتھوں میں سناپ تھے۔
کمانڈو خالد مجھے برابر دیکھ رہا تھا۔

اس نے فوراً "میری گود سے ڈبا اٹھالیا۔ میں اپنا سر اونچا کرنے لگا۔ شکاف کے کنارے سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا۔ تینوں فوجی اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ جو بھارتی سنتری لیزر گن کے سامنے سٹول پر بیٹھا تھا۔ اب وہ بھی سرگٹ پی رہا تھا۔ اور گھراتی زبان میں اپنے ساتھی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ میں نے سر نیچے کر لیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے ایک ہاتھ شکاف کے اندر ڈال کر سناپ کو دیوار کی اندر کی طرف چٹا دیا۔ اس کے بعد دوسرے سناپ کو بھی اس طرح شکاف کے اندر داخل کر دیا۔ اب سارا کام سناپوں کے اس جوڑے نے کرنا تھا۔ لیکن میں بے خبر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے سر اونچا کر کے اپنی آنکھیں شکاف کے کنارے کے ساتھ لگا دیں۔

دہائی بھی تک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ خدا جانے دونوں سناپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ دونوں سناپ مورچے کی دیوار کے ساتھ رینگتے ہوئے بکر سے باہر نکل جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کمپیوٹر والے پینل کے پیچھے جا کر چھپ گئے ہوں۔ اتنی دیر میں میں نے صرف اتنا کیا کہ جیب سے آٹومیک پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اشارے سے کمانڈو خالد کو بھی الرٹ کر دیا تھا۔ ابھی تک میں نے سر کو نیچے ہی کیا ہوا تھا۔ میں اندر سے آنے والی گھبرائی ہوئی آوازیں سننا چاہتا تھا جو ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے پستول سے تینوں بھارتی سنتریوں کو موت کی نیند سلانے کا فیصلہ کیا اور سر کو اوپر کر کے بکر میں جھانک کر دیکھا تاکہ ایسی پوزیشن بنا سکوں کہ یکے بعد دیگرے تینوں سپاہیوں کو نشانہ بنا سکوں۔ پستول آٹومیک تھا۔ اس کی ٹالی پر سلیسر چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے فائر کا دھماکا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ایک خاص زاوے پر پوزیشن بنائی اور پستول والا ہاتھ آہستہ آہستہ کھسکاتے ہوئے اوپر کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس فوجی نے جو کمپیوٹر کے

سامنے بیٹھا ہوا تھا زور سے اپنی ٹانگ پر ہاتھ مارا اور اس کے ساتھ ہی کرسی سے لڑھک گیا۔ ایک سناپ نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ اسے کرسی سے گرتے دیکھ کر دونوں مسلح سنتری اس کی کی طرف لپکے۔ گرے ہوئے فوجی کے منہ سے صرف سناپ کے الفاظ ہی نکل سکے۔ سناپ کا سن کر دونوں فوجیوں نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اپنی گنوں کو انہوں نے فائرنگ کی پوزیشن میں کر لیا تھا۔ ان کے ادھر ادھر گھبرائی ہوئی حرکتیں کرنے سے ان کے بولوں کی دھمک نے سناپوں کو بھی ہراساں کر دیا۔

دونوں سناپ وہیں تھے اور شاید ایک کو ڈسنے کے بعد وہ چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ فوجیوں کے شور اور ان کے بھاری جوتوں کی آوازوں سے وہ گھبرا گئے اور اپنی جان بچانے کے لیے انہوں نے ان سنتریوں کو بھی ڈس دیا۔ عجیب منظر سامنے آیا۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ دونوں فوجی دہشت ناک انداز میں سناپ سناپ کی آوازیں نکالتے گئے۔ مجھے یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ ان کی آوازیں سن کر باہر سے زیادہ فوجی اندر نہ آجائیں۔ لیکن گلتا تھا کہ رات کے وقت صرف وہ دونوں سپاہی ہی ڈیوٹی پر تھے۔ دونوں فوجی چکر کر ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سناپ بڑے زہریلے تھے اور کلر کے سناپ تھے۔ خود سناپ بن جانے کی وجہ سے مجھے سناپوں کے بارے میں اتنا کچھ معلوم ہو چکا تھا کہ اتنا علم پرانے سے پرانے سپرے کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ کلر سناپ کا زہر بھی سب سے پہلے آدمی کے گلے کی رگوں کو مفلوج کرتا ہے اور اس کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان تینوں بھارتی فوجیوں کا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ گرے میں نے مورچے کے دہانے کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا۔ کمانڈو قاسم سر اوپر کیے ہوئے تھا اور اس نے تینوں بھارتی فوجیوں کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے اشارہ کیا وہ مورچے کی دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ اس کے ساتھ ہی بارون بھی اندر آ گیا۔ میں اور کمانڈو خالد بھی مورچے میں بڑے آرام سے کود کر اندر آ گئے۔ میں نے انہیں سناپوں سے ہوشیار رہنے کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔

کمانڈو ہارون لیزر گمن کے دائیں اور بائیں لوسہ کی اونچی الماریوں کی اوٹ میں پو گئے۔ اس وقت وہاں صورت حال یہ تھی کہ اگر دونوں سپاہی بکر میں داخل ہو جاتے تو انہیں لیزر گمن اور بالی پاؤ پر لگے ہوئے لمبی سٹکوں والے ٹائم بم صرف نظر آسکتے تھے۔ ان کے علاوہ تین بھارتی سپاہیوں کی لاشیں بھی درمیان میں اسی طرح پڑی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد اور قاسم کو اشارہ کیا کہ دونوں سپاہی زندہ حالت میں اندر نہ آئیں۔

دروازے کے باہر دونوں سپاہیوں نے کسی بات پر قہقہہ لگایا۔ ہم ہوشیار ہو گئے۔ ان کے بھاری جوتوں کی آواز قریب آگئی تھی۔ پھر باہر سے انہوں نے دروازہ اندر کو دھکیلا اور اندر آ گئے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے ایک طرف سے جگہ قاسم نے اور دوسری جانب کمانڈو خالد نے ان پر حملہ کر دیا اور دونوں کی گردنوں کو اپنے بازوؤں کے ٹکڑے میں لے کر تین چار اتنے شدید جھٹکے دیئے کہ ان کے جسم ٹک گئے۔ یہ جنوبی ہند کے دھان پان سپاہی تھے۔ وہ تو پہلے جھکوں میں ہی ختم ہو گئے تھے اور ان کی گردنوں کے ٹکڑے نوٹ چکے تھے۔ میں نے کمانڈو ہارون سے کہا۔

”تم دروازے کے باہر پوزیشن لے کر ایٹ جاؤ کوئی اور سنتری بھی آ سکتا ہے۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے اور خالد نے جلدی جلدی چھ سات باقی بچے ہوئے ٹائم بم ریڈار کے ہینسل کے پیچھے چھپا کر دیئے۔ ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

”کرم دادا! ایک بار پھر چیک کر لو۔“

میں نے جیک کر تمام چیکے ہوئے بموں کا جائزہ لیا۔ اور باری باری سب کے سینٹری پن اون کر دیئے۔ ان ٹائم بموں نے ریوٹ کنٹروں کا مین دیانے پر ایک ساتھ پھٹنا تھا۔ یہ کلاک بم نہیں تھے جو ٹائم دینے پر پھٹتے ہیں۔ اگرچہ ہم انہیں ٹائم بم ہی کہہ کر پکار رہے تھے۔ یہ بم بہت طاقت ور بم تھے اور جنگی جہازوں کی موٹی سے موٹی فولادی چادر کو پھاڑ ڈالتے تھے۔ میں نے خالد سے کہا۔

”سب ٹھیک ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو۔“

میں خود بکر کے پیچھے کی طرف کھسکے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس طرف کوئی فوجی پوسٹ تو نہیں ہے۔ تاکہ اگر ہو تو اس کے سنٹریوں کو بھی ختم کر دیا جائے تاکہ ہم اپنا کام شروع کر سکیں۔ پیچھے ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے ذرا سا کھول کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا مگن تھا جس کے کونے پر ایک ہیرک سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو مجھے دونوں سانپ فرش پر نظر آئے۔ وہ دروازے کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے دروازہ تھوڑا سا اور کھول دیا۔ دونوں سانپ باہر نکل گئے۔ میں نے جگہ قاسم کو اشارہ کر کے بلایا اور سرگوشی میں کہا کہ وہ دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھتا رہے۔ اگر کوئی سپاہی اوجر آ رہا ہو تو ہمیں فوراً خبردار کر دے۔

اس کلام سے فارغ ہو کر میں تھوڑے قدم اٹھاتا اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا۔ طاقتور ٹائم بموں کا ایک تھیلا جگہ قاسم اور کمانڈو ہارون لائے تھے۔ ایک تھیلا کمانڈو خالد اپنی پشت پر باندھ کر لایا تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

”ٹائم بم فوراً باہر نکل لیں۔“

کمانڈو ہارون نے بھارتی فوجیوں کی لاشیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پتول کے فائرنگی آواز ہم نے نہیں سنی تھی۔ ان کو کیسے ختم کیا؟“

کمانڈو خالد بولا۔ ”انہیں ان سانپوں نے ڈس کر ہلاک کیا ہے جو کرم دادا ڈبے میں بند کر کے لایا تھا۔ یہ ایکشن بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

ہم نے جلدی جلدی ٹائم بموں کے پیک لگنے شروع کر دیئے۔ زیادہ ہم ہم نے لیزر گمن پر اور اس کے بالی پاؤ کے نیچے اور پمیلوں پر لگائے۔ بالی پاؤ فولادی تھا جس کی وجہ سے ہم اس کے ساتھ آسانی سے چپک گئے۔ اچانک دروازے کی دراز کے پاس کھڑے قاسم نے منہ سے ہلکی سی سسکی کی آواز نکال کر ہمیں بتایا کہ باہر سے دو سپاہی آ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ دروازے کی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ میں نے کمانڈو خالد کو اشارہ کیا۔ وہ دروازے کی دوسری جانب دیوار کے بالکل ساتھ لگ گیا۔ میں اور

شروع ہو گیا۔ زبردست دھماکوں کے ساتھ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے نکل رہی تھیں۔

کمانڈو خالد نے چیخ کر کہا۔

”ڈبل سے۔ گو“

یہ اس کانٹائی پر تھ۔ برین گمنوں اور مشین گنوں کی بوچھاڑوں میں آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں تو وہیں لینا رہا لیکن مجاہد قاسم اور کمانڈو ہارون اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈھلوان پر اپنی دائیں جانب دوڑ پڑے۔ دوسرے لمبے کمانڈو خالد بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ میں وہیں اونحالیٹ گیا۔ گولیاں جیتی جیتی چلائی میرے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم ایک ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اچانک وہ گر پڑے۔ کمانڈو خالد ان سے دس پندرہ قدم ہٹ کر بھاگ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم میں سے ابھی تک کوئی نہیں اٹھ رہا تھا۔ یقینی طور پر مشین گن کا برسٹ ان کے جسموں سے پار ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اٹھ کر ضرور دوڑنے لگتے۔

گمن پوسٹ کی سیکورٹی بیدار ہو گئی تھی۔

اس بات کا خطرہ تھا کہ گمن پوسٹ کی عقبی بئرک میں سے گارڈ پوسٹ کے اندر آ جائے گی اور ہمارا پلان ناکام ہو جائے گا۔ میں نے جیب سے ریموٹ کنٹرول نکال لیا اور اندھیرے میں اس کے سرخ بٹن کو غور سے دیکھ کر اس پر اپنی انگلی رکھ کر اوپر گمن پوسٹ کے شگاف کی طرف دیکھا۔ عین اس وقت سمندر کی جانب سے ایک بیلی کاپڑ گزر رہا تھا۔ آہا اور اپنی ہیڈ لائٹ کی روشنی ڈالتا ہوا میرے اوپر سے گمن پوسٹ کی طرف نکل گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر سرخ بٹن دبا دیا۔

مجھے شک تھا کہ شاید دھماکہ نہ ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے ہم کمانڈو مشینوں میں بھی ٹائم بم ہی لگایا کرتے تھے اور وہ دینے گئے مقررہ وقت کو پورا کر کے اپنے آپ پھٹ جاتے تھے۔ ریموٹ کنٹرول کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن یہ امریکی ریموٹ کنٹرول بم تھے

میں نے سس کی آواز سے کمانڈو ہارون کو اندر بلا لیا۔ ہمیں الگ الگ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم گمن پوسٹ کے بکر کے شگاف میں سے ایک ساتھ نیچے پہاڑی ڈھلوان پر اتر گئے اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم اس سمت سے واپس جا رہے تھے جہر دشمن کی کوئی مشین گن پوسٹ نہیں تھی۔ یہ ہمارا خیال تھا۔ ہم چاروں کمانڈو بیٹھ کر تھوڑا تھوڑا آگے کھینکتے ہوئے پہاڑی ڈھلوان سے نیچے اتر رہے تھے۔ ریموٹ کنٹرول میں نے خالد سے لے لیا تھا اور اسے اپنی بیٹھ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے ایک سرخ بٹن کو دبانا تھا اور لیڈر گمن پوسٹ کی پہاڑی چوٹی کو دھماکے سے اڑ جانا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے ذرا تڑپتے ہو کر اتر رہے تھے۔ ہمارا لباس کالا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ہم نظر نہیں آتے تھے۔ چونکہ ہم بیٹھ کر اتارائی اتر رہے تھے اس لیے اس بات کا خیال رکھ رہے تھے کہ کوئی پتھر ہمارے نیچے سے پھسل کر لڑھک نہ جائے۔ اس کی آواز سے سیکورٹی اور مشین گن مورچوں کے سنتری فائر کھل سکتے تھے۔

Famous Urdu Novels

ہم گمن پوسٹ کی پہاڑی سے اتر آئے تھے۔ اب دوسرے ٹیلے کی ڈھلوان شروع ہو گئی تھی جس ہمارے پائس جانب کچھ فاصلے پر مشین گن کے دونوں مورچے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اترتے وقت مجاہد قاسم اور کمانڈو ہارون وہ احتیاط نہیں کر رہے تھے جس کی اشد ضرورت تھی مگر میں انہیں آواز دے کر خبردار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جب ہم پہاڑی کے دامن میں سمندری ساحل کے قریب پہنچے جہاں سے ہمیں دائیں جانب مڑنا تھا تو کمانڈو ہارون کسی پتھر سے پھسل گیا اور پتھروں کے ساتھ لڑھکنیں کھاتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ رات کے سانے میں پتھروں کے لڑھکنے کی آواز پیدا ہوئی تو بائیں جانب ایک فائر ہوا اور ساتھ ہی سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ کسی مورچے سے روشنی راولڈ فائر کیا گیا تھا۔ ہم جہاں بیٹھے تھے وہیں زمین کے ساتھ لگ گئے۔ خدا جانے مشین گن پوسٹوں سے کسی نے ہمیں دیکھا تھا یا نہیں مگر روشنی راولڈ کے فائر ہونے کے کوئی دو سیکنڈ بعد ہم پر مشین گنوں کا فائر آنا

نارنجی اور سفید شعلے بھڑک بھڑک کر اٹھتے اور رات کی تاریکی کو روشن کر رہے تھے۔ خدا جانے وہاں گن پوسٹ کے نیچے کوئی گولہ بارود کا ذخیرہ تھا جو پھٹ رہا تھا۔ میں پہاڑی کے دامن کی طرف ہو گیا۔ میں اس طرف سے نکل کر شر کے ویران حصے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اچانک سامنے سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور پھر کسی فوجی ٹرک کی اگلی روشنیوں اور نیچے ہوتی ہوئی میری طرف بڑھنے لگیں۔ جگہ کھنڈروں والی تھی جس کی وجہ سے فوجی ٹرک اوپر نیچے ہو رہا تھا مگر یہ گڑگڑاہٹ کسی ٹرک کی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں بھاگ کر ایک طرف پتھروں کی آڑ میں چھپ گیا۔

یہ ایک چھوٹا ٹینک تھا جس کی گن کی ٹالی پختے ایونٹین کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو اور ٹینک تیز رفتاری سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ جب یہ تینوں ٹینک گزر گئے تو میں اٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک اور ٹینک کی گڑگڑاہٹ بلند ہوئی۔ میرے لیے اس طرف جانا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ میں سیدھا سمندر کی طرف دوڑ پڑا۔ دوڑتے دوڑتے میں چھوٹے سے سمندری ٹاپو کے درختوں کی چھند میں آ گیا۔ یہاں تین چار چھوٹی بڑیاں تھیں جن کے باہر خستہ حال تین چار آدمی اور عورتیں کڑی دہشت زدہ چہروں سے دور اوپر گن پوسٹ کی پہاڑی کو پھٹتے اور وہاں سے نکلنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں ان سے ذرا پرے ہو کر آگے نکل گیا۔ اب مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کس جگہ پر آ گیا ہوں اور وہاں سے شیر خان کے مکان کو کون سا راستہ جانا تھا۔ کیونکہ مجھے ہر حالت میں شیر خان کے مکان پر پہنچنا تھا۔ میں سمندری ٹاپو کے ساتھ ساتھ شمال مشرق کی سمت کا اندازہ کر کے چلنے لگا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ یہاں انڈین نیوی کے کوشل گارڈز ایمرجنسی کی اس حالت میں ضرور آچکے ہوں گے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تو میری جیب سے پتھول اور کمانڈو چاقو برآمد ہو سکتا ہے۔ میں ان دونوں ہتھیاروں کو اپنے سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک جگہ ناریل کے درختوں کے پاس رک گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

اور ان کا مائیکرو پوسٹم بے حد مکمل اور اعلیٰ تھا۔ جیسے ہی میں نے سرخ بٹن کو دبایا۔ زمین اوپر نیچے کو ایک بار زور سے ہلی۔ پھر ایک ایسا خوفناک دھماکا ہوا جیسے دس آتش فشاں پہاڑ بیک وقت پھٹ گئے ہوں۔ میں نے اونٹ سے ہو کر اپنا چہرہ زمین کے ساتھ لگا دیا تھا۔ میں نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ پہاڑی کی جس چوٹی پر لیزر گن کا ٹکڑا تھا وہ پہاڑی آدمی سے زیادہ اڑ چکی تھی اور وہاں سے اس طرح آگ کے شعلے اور دھواں اٹھ رہا تھا جیسے کراٹھا کا آتش فشاں ایک بار پھر پھٹ گیا ہو۔

چھوٹے چھوٹے دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ پہاڑی کے دہانے میں سے بجلی کی طرح شعلے نکل کر آسمان کی طرف اٹھتے۔ کبھی زرد شعلے، کبھی نیلے اور کبھی سرخ۔ جو بجلی کا پھر گن پوسٹ کی طرف گرجتا ہوا گیا تھا اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ آسمان شعلوں سے دن کی طرح روشن ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس طرف دوڑا جہاں میں نے مجاہد قاسم اور کمانڈو ہارون کو گرتے دیکھا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں وہ دونوں مجھے صاف نظر آ گئے۔ دونوں زمین پر اونٹ سے پڑے تھے ان کے جسم کا پتلا دھڑ خون سے لتھرا ہوا تھا۔ میں قریب جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہارون اور پھر قاسم کو سیدھا کیا۔ دونوں کے پیٹ پھٹ چکے تھے اور چہروں پر موت کا سکوت تھا۔ دونوں شہید ہو چکے تھے۔ سمندر میں کوئی انڈین نیوی کا جنگی جہاز ہو گا جس نے تیز تیز وسل دینے شروع کر دیے۔ یہ خطرے کے الارم تھے۔ اتنے میں سمندر ہی کی طرف سے دو بجلی کا پھر گرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ ان کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں اور روشنی گول دائروں کی شکل میں اوجر اوجر پڑ رہی تھی۔ میں وہیں اپنے شہید کمانڈوز کی لاشوں کے پاس ہی لیٹ گیا۔

بجلی کا پھر میرے اوپر سے نکل گئے۔ پہاڑی کی دوسری جانب سے مٹین گنوں کی فائرنگ کے دھماکے سنائے دے رہے تھے۔ میں وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں دونوں شہیدوں کی لاشوں کو نہ ساتھ لے جا سکتا تھا، نہ وہاں زمین کھود کر دفن کر سکتا تھا۔ میں اٹھا اور بے تحاشا دوڑ پڑا۔ پہاڑی کے اوپر ابھی تک دھماکے ہو رہے تھے اور نیلے

میں زندگی میں پہلی بار سبکدوش صوبے کے دوار کا شہر میں وارد ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس شہر کا سونمات کے حوالے سے نام ہی سنا ہوا تھا کہ یہاں سونمات کا ایک بت ہوا کرتا تھا جس کو مجاہد اسلام محمود غزنوی نے پاش پاش کر دیا تھا۔ دور سے ایک سینئر کی آواز آنے لگی۔ میں سمندری ٹاپو کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ دور سے کچھ روشنی آگے بڑھ رہی تھی۔ ان کی روشنیوں کا عکس ٹاپو کے پانی میں پڑ رہی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ یہ کوئی فوجی سینئر یعنی مگن بوٹ ہی ہو سکتی تھی کیونکہ وہ بڑی تیزی سے آگے سمندر کی جانب نکل گئی تھی۔ لیزر گن پوسٹ کی تباہی کی اطلاع اس دوران یقینی طور پر علاقے کی ساری آرمی اور نیوی کو مل چکی تھی اور ساری فوج اور فوج کی سیکورٹی الٹ ہو چکی تھی۔ اگرچہ مجھے کانڈو ہارون اور مجاہد قاسم کی موت کا ختہ صدمہ ہوا تھا مگر مجھے اس بات کی خوشی بھی تھی کہ ہم نے اپنا ٹارگٹ مار لیا تھا اور ہمارا مشن کامیاب ہو گیا تھا۔ ہارون اور قاسم نے شہادت پائی تھی اور شہید کی موت پر افسوس نہیں کیا کرتے۔ جنگی گن بوٹ کے گزر جانے کے بعد میں اٹھ کر شمال مشرق کی طرف ہی چل پڑا۔

پہاڑی میرے پیچھے درختوں کے جھنڈوں کی اوٹ میں چھپ چکی تھی اور جہاں سے میں گزرتا رہا تھا وہاں رات کا اندھیرا تھا۔ دور کہیں کوئی روشنی عثمانی نظر آ جاتی تھی۔ میں اب سمندر سے ہٹ کر شہر کی سمت چلنے لگا تھا۔ میں ایک سڑک پر نکل آیا۔ چھوٹی سڑک تھی اور رات کے سائے میں ویران پڑی تھی۔ سڑک پر آتے ہی کسی طرف سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور سڑک پر چلتا رہا۔ میرے پاس پستول بھی تھا اور چاقو بھی تھا۔ اگر کسی کتے نے مجھ پر حملہ کیا تو میں اسے آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا۔ سڑک ختم ہو گئی۔ سامنے ایک میدان سا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا یہ میدان دلدلی تھا یہاں سمندر کا پانی چاندنی راتوں میں بھر جاتا ہوگا۔ میں نے پاؤں کو دبایا۔ میرا پاؤں دلدل میں دھسنے لگا میں نے پاؤں جلدی سے باہر نکالا اور دوسری طرف چلنے لگا۔

تباہ شدہ مگن پوسٹ کی جانب سے دھماکوں کی آوازیں اب دھیمی پڑ گئی تھیں مگر اس طرف کا آسمان اب شعلوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ شیر خان کے مکان کے پاس جس طرف سمندر تھا اس طرف رات کے وقت ایک میٹارے پر روشنی ہوا کرتی تھی۔ شاید یہ کسی ایڈورٹائزنگ کی روشنی یعنی نیون سائز کی روشنی تھی۔ یہ روشنی جلتی بجھتی رہتی تھی۔ میری نگاہیں دور شہر کی اکا دکا روشنیوں میں سے اسی روشنی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں دوار کا کے ساحلی کو بہتلی علاقے سے نکل کر اب دوار کا شہر کے مضافات میں داخل ہو چکا تھا۔ اونچی نیچی جگہوں پر مکانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ آخر مجھے ایک جگہ وہ نیون سائز کی جلتی بجھتی روشنی نظر آ گئی جو میرے انداز کے مطابق شیر خان کے مکان کے پاس والی روشنی ہی تھی۔ میں نے اسی طرف چلنا شروع کر دیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی چٹریلی اور کچی سڑکوں پر سے گزرتا ہوا میں رات کی خاموشی اور اندھیرے میں ایک مندر کے قریب سے گزرتا ہوا میں نے اس کو پہچان لیا۔ ہم شیر خان کے مکان سے نکل کر اس مندر سے ہٹ کر اپنے ٹارگٹ کی رہی کرنے گئے تھے۔

جب ایک تلاب کا چوڑا دکھائی دیا تو میری جان میں جان آ گئی۔ میں شیر خان کے مکان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے شیر خان کا مکان قریب ہی تھا۔ تاریک درختوں میں سے ہو کر گزرتا تو سامنے شیر خان کے مکان کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ اندر کوئی روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ کانڈو خالد کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ہم سے بہت پہلے اور دوسری طرف نکلا تھا وہ ضرور خنجر لیا ہوگا۔ میں نے خاص انداز میں دروازے پر تین بار دستک دی تو تھوڑی دیر بعد شیر خان نے دروازہ کھول دیا اور میرے کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہارون اور قاسم بھائی کہاں ہیں؟“

میں بیٹھک میں داخل ہو گیا اور اس سے سوال کیا۔

”کانڈو خالد پہنچ گیا ہے؟“

پوسٹ پر سے روشنی راکنڈ فائز ہوا اور ساتھ ہی مشین گمن کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں تو قاسم اور ہارون کو میں نے پہاڑی کی ڈھلان پر سمندر کی طرف دوڑتے دیکھا تھا۔
”پھر کیا ہوا؟“

پھر جو کچھ ہوا تھا وہ میں نے غم زدہ آواز کے ساتھ مکائنڈ خالد کو بیان کر دیا۔ مکائنڈ خالد کا سر جھک گیا۔ وہ کچھ دیر بالکل ساکت ہو کر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”شہیدوں کے درجات کی بلندی کے لیے فاتحہ شریف پڑھو۔“
ہم نے دعائے فاتحہ پڑھ کر چروں پر ہاتھ پھیرے۔ شیر خان عین اس وقت چائے کی پیالیاں لیے اندر داخل ہوا۔ ہمیں اس نے چروں پر ہاتھ پھیرتے دیکھا تو پوچھا۔
”خیر تو ہے۔ کیا ہوا ہے؟“

ہم نے اسے بھی بتا دیا کہ ہارون اور قاسم اس صبح کے میں شہید ہو گئے ہیں۔ اس نے چائے کی پیالیاں دہن بٹائی پر رکھ دیں اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔
”وہ خوش قسمت تھے۔ شہادت کا رتبہ کسی خوش نصیب کو ہی ملتا ہے۔ میری

طرف سے بھی دعائے فاتحہ پڑھی جائے۔“
ہم نے ایک بار پھر مکائنڈ ہارون اور مجاہد قاسم کی ارواح کو ثواب پہنچایا اور خاموشی سے چائے پینے لگے۔ رات باتیں کرنے اور کچھ دیر سونے میں گزر گئی۔ شیر خان صبح ہمیں ناشتہ کرا کے اپنی دکان پر چلا گیا۔ میں اور مکائنڈ خالد بیٹھک میں چٹائی پر بیٹھ گئے اور واپسی کا پروگرام بنانے لگے۔ اب ہمارا دو کار میں کوئی کام نہیں تھا۔ ہم نے اپنا مشن مکمل کر لیا تھا۔ اب ہمیں بھوپال واپس جانا تھا۔ شیر خان کو دکان پر گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ والپس آگیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ آتے ہی بولا۔

”فوج نے سارے شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ جگہ جگہ فوجی ٹرک آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ گھر گھر تلاشیں شروع ہو گئی ہیں۔ کسی کو شہر سے باہر نکلنے اور شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔“

”ہاں وہ دوسرے کمرے میں ہے۔“

اسنے میں مکائنڈ خالد بھی دوسرے کمرے کے دروازے میں سے اندر آگیا۔
”خدا کا شکر ہے تم آ گئے۔ گمن پوسٹ کے دھماکوں نے سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ قاسم اور ہارون کہاں ہیں؟“
میں نے کہا۔

”کیا وہ ابھی تک نہیں پہنچے؟ وہ تو میرے آگے نکل گئے تھے۔“

یہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس لیے کہ میں ابھی انہیں ان دونوں کی شہادت کی خبر نہیں سنا چاہتا تھا۔ مکائنڈ خالد نے شیر خان سے کہا۔
”شیر خان جلدی سے چائے لے آؤ۔“

پھر وہ میرے پاس ہی بٹائی پر بیٹھ گیا۔ اور بڑے پر جوش لہجے میں بولا۔
”یہ ہماری ہی نہیں بھارت کے اور پاکستان کے سارے مسلمانوں کی، بلکہ سارے عالم اسلام کی کامیابی ہے۔ پاکستان ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے اسلام کا قلعہ ہے اور بھارت کی برہمنی حکومت نے یہ لیزر گمن پاکستان کو تباہ کرنے کے ناپاک ارادے سے نصب کی ہوئی تھی جس کے ہم نے پرچے اڑا دیے ہیں۔ تم نے ضرور دیکھا ہوگا کہ پہاڑی ساری کی ساری اڑ گئی تھی اور دھماکے تو تھوڑی دیر پہلے تک سنائی دے رہے تھے۔ میں جب تم سے الگ ہو کر دوڑا تو مجھے بار بار خیال آیا کہ کہیں تم ریخوت کنٹرول دہانے میں دیر نہ کر دو۔ کیونکہ اس وقت گمن پوسٹ کی ساری سیکورٹی بیادار ہو چکی تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ سیکورٹی والے ہمارے لگائے ہوئے بموں کو ناکارہ نہ کر دیں۔ لیکن جب خوفناک دھماکوں کے ساتھ زمین میں بھونچل آگیا تو میں وہیں بیٹھ گیا اور پہاڑی کے اوپر سے جوالا کبھی ایسے شعلے نکلے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ یہ بتاؤ ہارون اور قاسم تم سے کہاں جدا ہوئے تھے؟“

میں نے کہا۔

”جس وقت قاسم کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اس کے ساتھ ہی کسی

یہ خبر ہمارے لیے بڑی تشویش ناک تھی۔ کیونکہ ہم دوار کا کہہ رہے والے نہیں تھے۔ کمائڈ خالد بھوپال کا تھا اور بڑی عمدہ اردو بولتا تھا میں پنجابی تھا اور میرا اردو بولنے کا لہجہ پنجابی تھا۔ ہم سے پوچھ کچھ ہو سکتی تھی۔ کمائڈ خالد کہنے لگا۔

”یہ تو قدرتی بات تھی۔ ایسا تو ہوتا ہی تھا۔ بھارتی آرمی کے بہت بڑے دفاعی پوسٹ کو چاہ کیا گیا ہے۔“

شیر خان بولا۔

”شہر میں جگہ جگہ بھارتی فوج پر تنقید ہو رہی ہے کہ وہ دوار کا کا دفاع کرنے کے قاتل نہیں ہے۔ کشمیری کمائڈ کھلے بندوں آکر ان کی دھنسنے کے پرچھے اڑا رہے ہیں۔ لوگوں میں گھبراہٹ بھی ہے۔ رات کو جب دھماکہ ہوا تو لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر کوئی یہی سمجھ رہا تھا کہ پاکستان نے حملہ کر دیا ہے۔“

میں نے شیر خان سے کہا۔

”بھائی تم نہیں یہ بتاؤ کہ کوئی ایسا خفیہ رستہ ہے جس سے ہم شہر سے نکل سکیں۔“

شیر خان کہنے لگا۔

”ہمارے راستے تمہارے سامنے ہیں۔ کوئی ایسا خفیہ رستہ نہیں ہے۔“

کمائڈ خالد نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی جگہ چھپے رہنا چاہیے۔ جب ذرا حالات نارمل ہو جائیں تو ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

شیر خان کہنے لگا۔

”خالد بھائی! میں شہر کی سڑکوں پر جس طرح فوج کو گشت کر کے دیکھ کر آیا ہوں مجھے نہیں امید کہ حالات اتنی جلدی نارمل ہوں گے۔ شہر میں تو ایسا لگتا ہے جیسے مارشل لاء لگ گیا ہے اور فوج کا پورا ڈویژن داخل ہو گیا ہے۔ ہر چوک میں فوج نے مورچے بنا کر پوزیشنیں سنبھال لی ہیں۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شیر خان! تم نہیں جانتے جب اس قسم کی کوئی واردات ہوتی ہے تو فوج ایسا ہی کرتی ہے۔ یہ ان کی سیکورٹی کا تقاضہ ہے۔“

پھر میں نے کمائڈ خالد سے کہا۔

”میرا تو خیال ہے کہ ہمیں آج ہی رات کے اندر ہی اس میں سے فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم کالھیاواڑ کی بجائے خلیج رن کچھ کی طرف جائیں گے۔“

وہ بولا۔

”رن کچھ میں تو فوجی نقل و حرکت زیادہ ہوگی۔ وہ تو سارا فوجی علاقہ ہے۔ سن ۶۵ء کی جنگ میں پاکستان سے شکست کھانے کے بعد انڈین آرمی نے اسے چھوٹی بنالیا ہوا ہے۔“

شیر خان نے کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ جس طرح اور جتنی جلدی ہو سکے جل گام والی کھاڑی کی کمین گاہ میں جا کر چھپ جائیں۔ یہاں مجھے زیادہ خطرہ لگتا ہے۔“

کمائڈ خالد کہنے لگا۔

”تمہارا مشورہ بھی درست ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے بھی ہمیں رات کا اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ جیسے ہی رات کا اندھیرا ہو ہم شیر خان کے مکان سے نکل کر جل گام کی کھاڑی والی پہاڑی کمین گاہ میں چلے جائیں گے۔ خالد نے اس خفیہ جگہ کے بارے میں بتایا کہ وہ ہمارے بچپن میں نے ہنگامی صورت حال کے لیے بنائی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ خفیہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ چاروں طرف ویران ٹیلے ہیں اور اوپر کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔

”لیکن ہم وہاں کب تک چھپے رہیں گے۔ یہ بتاؤ کہ وہاں سے بھوپال جانے کا کیا سلسلہ ہو سکے گا؟“

مکناڈو خالد بولا۔

تھا۔

شیر خان بولا۔

”اب تو ہندو سرکار کا پاکستان اور اسلام کے خلاف سارا ٹپاک منصوبہ برپا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے شہید ساتھیوں کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرمائے۔ میں نے اور خالد نے بیک وقت کہا۔“

میں نے کہا۔

”شہادت کا رتبہ بڑا بلند رتبہ ہے۔ مکناڈو ہارون اور مجاہد قاسم نے شہادت کا رتبہ پایا ہے اور شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔“

ہم نے کھانا کھایا اور دوسرے کمرے میں جا کر آرام کرنے لگے۔ دن گزرتا جا رہا تھا۔ پھر سورج غروب ہو گیا۔ شیر خان دوسرے کے بعد دکان پر نہیں گیا تھا۔ وہ ہمارے پاس ہی رہا۔ جب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو شیر خان نے کھانا گرم کیا۔ ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ چائے پی اور بل گام کی خفیہ کمین گاہ کی طرف جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ شیر خان کہنے لگا۔

”میں رات کو روزانہ تمہارے لیے کھانا وغیرہ لے کر آ جایا کروں گا۔ پانی کی بڑی قحطی تم اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔“

وہ مکناڈو خالد سے مخاطب تھا۔ بولا۔

”مکناڈو! تم تو اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہو۔ کوشش یہی کرنا کہ دن کے وقت تم زیادہ تر کمین گاہ کے اندر ہی رہو۔ جیسے ہی فوج شرے سے نکل گئی اور حالات نارمل ہوئے میں تمہیں خبردار کر دوں گا۔ اس کے بعد تم جس طرف بھی جانا چاہو جا سکو گے۔“

ہم نے اپنا لباس وہی جیکٹ اور پتلون ہی رکھا۔ احتیاطاً ہم نے اپنے پتھول اور

”جس قسم کے شر کے حالات شیر خان نے بتائے ہیں ان کو دیکھا جائے تو ہم ایک ہفتے سے پہلے تو وہاں سے نہیں نکل سکتے۔ کیونکہ ان ٹیلوں سے ایک میل آگے ٹاریلوں کا ایک ذخیرہ ہے جس سے ایک راستہ کھلیاواڑ جانے والی بڑی سڑک کو جا لکتا ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم مناسب موقع دیکھ کر وہاں سے بڑی سڑک پر پہنچیں اور وہاں سے الگ الگ ہو کر کسی لاری یا بس میں بیٹھ کر کھلیاواڑ پہنچ جائیں۔ وہاں سے ہمیں بھوپال جانے والی گاڑی مل سکتی ہے۔“

شیر خان چلا گیا۔ اس نے احتیاط کے طور پر جاتے ہوئے مکان کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ ہمیں بھی ہدایت کی تھی کہ ہم کھڑکیوں کو نہ کھولیں اور اندر ہی بیٹھے رہیں۔ ہمارے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔ صرف دو آؤٹریک پستول اور دو فالتو میگزین تھے۔ دو مکناڈو جاتے تھے۔ ان کو ہم نے مکان کے ایک کونے میں محفوظ جگہ پر چھپا دیا تھا۔ دوسرے وقت شیر خان آیا تو اس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ کہنے لگا۔

”میں کھانا ہوٹل سے ہی لے آیا ہوں۔“

مکناڈو خالد نے باہر کے حالات کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

”فوج کی تقری زیادہ ہو گئی ہے۔ ہر چوک میں چیک پوسٹ ہے جس فوجی جس پر ذرا شک پڑے اس کو چیک کرتے ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہے۔ یہ افواہ بھی ہے کہ پاکستان ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے اور پاکستان نیوی کے جنگی جہاز دوار کا سے کچھ دور گشت کر رہے ہیں۔“

مکناڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس قسم کی افواہیں ان حالات میں پھیلا ہی کرتی ہیں۔ پاکستان کو حملہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سن ۷۵ء میں بھی بھارت نے ہی پاکستان پر حملہ کیا تھا۔ اب بھی بھارت ہی کراچی کی طرف سے پاکستان پر حملہ کرنے کا پلان بنا چکا تھا۔ اگر ہم لیڈر مرن پوسٹ کو جان کی قربانیاں دے کر تباہ نہ کرتے تو انڈین فوجی ہائی مکان نے پاکستان پر حملہ کر دیتا

یہ رات کے وقت ویران ہوتا ہے۔ دن کے وقت بھی کبھی کبھی کوئی دیمائی ادھر سے گزرتا ہے۔“

پھر اس نے خالد سے کہا۔

”کمٹار! تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو اس طرف سے ہوشیار ہو کر رہنا ہوگا۔“

خالد نے کہا۔

”تم بالکل فکر نہ کرو شیر خان۔ میں ان ساری باتوں کو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔“

میل ٹیلوں کے درمیان ایک قدرتی غار بنا ہوا تھا۔ غار کا دہانہ دو ساتھ ساتھ کھڑی سیاہ چٹانوں کے درمیان تھا جو سمندری سرنگٹوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہم غار میں داخل ہو گئے۔ غار میں جاتے ہی شیر خان نے موم بنی جلا کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ موم بنی کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ان ٹیلوں کے نیچے قدرت نے عجیب قسم کا عجائب خانہ بنایا ہوا تھا۔ کہیں چھوٹے ولان تھے، کہیں قدرتی چٹانوں کے ستون تھے۔ فرش تک آئے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پتھریلی دیوار کے آگے چٹائی بھی ہوئی تھی۔ خالد نے کہا۔

”کرم دادا! یہ ہماری دوار کا کی پہاڑی خفیہ کمین گاہ ہے۔ یہاں ہم کبھی آکر چھپ جاتے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب گجرات میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے اور جن سنگتی اور راشٹرہ سبک کے انتہا پسند ہندو یہاں کے مسلمانوں پر وحشیانہ ظلم و ستم کر رہے تھے۔ یہاں ہم نے کچھ اسلحہ چھپایا ہوا تھا جو ہم دوار کا کے گنتی کے مسلمانوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ اپنی جان اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کر سکیں۔ کیونکہ یہاں کے ہندو غنڈہ عناصر کو گجرات پر انت کی حکومت باقاعدہ اسلحہ سپلائی کرتی تھی۔“

شیر خان نے موم بنی پتھر کے ایک طاق میں رکھ دی۔ وہ موم بیٹوں کا ایک فالتو

کمانڈو چاقو ساتھ لے لیے۔ جب رات ذرا گہری ہو گئی اور باہر خاموشی چھا گئی تو ہم مکان سے نکل کر خفیہ کمین گاہ کی طرف چل پڑے۔ شیر خان کے ہاتھ میں تھیلا تھا جس میں کچھوی کی ایک چٹائی تھی۔ یہ ہمیں صبح کے وقت اور دوپہر کے وقت کام آ سکتی تھی۔ میں نے پانی سے بھری ہوئی تھرمس اٹھا رکھی تھی۔

شیر خان کے مکان سے کچھ دور نکل آنے کے بعد ہم جھٹلا ہو کر چلنے لگے تھے۔ کیونکہ دور بڑی سڑک پر سے ہمیں فوجی ٹرکوں کے گزرنے کی آوازیں اور ان کی ہیڈ لائٹس کی روشنیوں نظر آ رہی تھیں۔ شیر خان بولا۔

”میرا خیال ہے شہر میں اور ملٹری آگئی ہے۔“

خالد نے کہا۔

”ہم بڑی سڑک سے دور رو کر جائیں گے۔“

شیر خان اور کمانڈو خالد نے وہیں سے راستہ تبدیل کر لیا اور ہم بڑی سڑک سے ہٹ کر اس کی مخالف سمت کو چل پڑے۔ اس علاقے کی طرف میں پہلے نہیں آیا تھا۔ زمین نامعلوم تھی۔ کہیں کہیں راستے میں ٹارپل کا یا کوئی دوسرا درخت آ جاتا تھا۔ ہم ایک جوہڑ کے قریب سے بھی گزرے۔ اس کے بعد بالکل ہی ویران اور غیر آباد علاقہ شروع ہو گیا۔ شیر خان اور خالد کو چونکہ راستے کی شناخت تھی اس لیے انہیں راستہ تلاش کرنے اور ست برقرار رکھنے میں وقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ راستہ تبدیل کرنے کی وجہ سے زیادہ دیر لگ گئی۔ اندھیرے میں کچھ فاصلے پر جنوب کی جانب اونچے نیچے ٹیلوں کے خاکے ابھرنے لگے۔ خالد نے مجھے بتایا۔

”ہمیں ان پہاڑیوں میں جانا ہے۔“

یہ پہاڑیاں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جہاں کسی طرف بھی آبادی کی کوئی روشنی ٹھٹکی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم ان ٹیلوں میں داخل ہو گئے۔ شیر خان نے ایک جانب اشارہ کیا اور مجھے کہنے لگا۔

”صرف اس طرف تاؤ کے درختوں کے درمیان ایک کچا راستہ شہر کو جاتا ہے۔ مگر

ہم بھوپال کی باتیں کرنے لگے۔ اس نے جیلہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگا۔
 ”کرم داد بھائی! کسی کسی وقت مجھے خیال آتا ہے کہ ہماری بھانجی جیلہ بھی دلیری
 اور بہادری میں تم سے کم نہیں ہے۔ یہ جواں ہمت خاتون کس بہادری اور صبر و
 استقامت سے نہ صرف اپنے خاندان کی جدائی بلکہ دشمن ملک میں طرح طرح کی مصیبتیں
 برداشت کر رہی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔“
 میں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

”یہ صرف اس لیے ہے کہ جیلہ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بڑا بھروسہ ہے۔ اس کا
 ایمان بے حد چلتا ہے۔ وہ اللہ کی رضا میں راضی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مجھ
 سے بے حد محبت کرتی ہے۔ میں بیوی اگر ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہوں تو
 پھر پیش آنے والی کوئی مصیبت مصیبت نہیں لگتی، ایک آزمائش لگتی ہے۔ اور محبت تو
 آزمائشوں کی بجائی میں تپ کر ہی کندہ بنتی ہے۔“

مکھنڈو خالد نے کہا۔

”کرم داد! تم واقعی خوش نصیب ہو کہ تمہیں بھانجی جیلہ ایسی بیوی مل گئی۔“
 کچھ دیر تک ہم یہی باتیں کرتے رہے۔ پھر خالد نے درگاہاگن کا ذکر چھیڑ دیا اور
 کہنے لگا۔

”مجھے اس ہندو عورت ناگن درگا پر بھی ترس آتا ہے۔ وہ بے چاری بھی کس
 مشکل میں پھنس گئی ہے۔ اب جبکہ تم اسے سانپ سے انسانی روپ میں واپس لا سکتے
 تھے مگر وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ حالات نے اسے تم سے سینکڑوں میل دور کر دیا
 ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ بھوپال میں ہی ہے یا وہاں سے کسی اور طرف نکل گئی
 ہے۔“

مجھے بجلی ناگن درگاہاگن آنے لگی۔ میں نے کہا۔

”بھوپال جا کر میں جیلہ سے ملنے کے فوراً بعد ناگن درگا کی تلاش میں بھروسہ جی
 کے مندر جاؤں گا۔ خدا کرے کہ وہ مجھے وہاں مل جائے۔“

پکٹ اور ماہی کی ڈبی بھی لایا تھا۔ تھیلے میں سے کھجور کی پتی اور دو تھالیاں دو جج
 اور گلاس نکل کر چٹائی کی ایک طرف رکھ دیے اور بولا۔

”یہ کھانا کل شام تک تمہارے لیے کافی ہوگا۔ میں رات ہوتے ہی مزید کھانا لے
 کر آ جاؤں گا۔“

ہم چٹائی پر بیٹھ گئے۔ خالد بس کر کہنے لگا۔

”میل شیر خان کے گھر والا آرام تو نہیں ہے مگر تم یہی سمجھنا کہ ہم اپنے کسی
 مکھنڈو مشن پر آئے ہوئے ہیں۔“

شیر خان بولا۔

”یہ مکھنڈو مشن ہی ہے۔ شہر میں ملٹی آپ لوگوں کی تلاش میں چھاپے مار رہی
 ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کل تک میرے گھر کی تلاشی کی باری بھی آجائے گی۔ دوا رکھی
 آبادی ہی کتنی ہے۔ فوج تو ایک ایک گھر کی تلاشی لے سکتی ہے۔“

شیر خان کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اگلے دن رات کو آنے کا کہہ کر چلا
 گیا۔ مکھنڈو خالد نے حرم میں سے پانی نکل کر پیا اور پھر ہم اپنے اپنے آٹومٹک
 پستول نکل کر انہیں چیک کرنے اور باتیں کرنے لگے۔ یہ ہتھیار ہم اپنے ساتھ ہی
 لائے تھے۔ مکھنڈو خالد نے کہا۔

”میل کسی فوجی کے آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ گناہم جگہ ہے اور
 اس قسم کے غار میل کے ٹیلوں کے نیچے عام پائے جاتے ہیں۔“

غار کی فضا میں عجیب سی مندر بو تھی۔ کسی جانب سے تازہ ہوا اندر ضرور آرہی
 تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ غار کافی کشادہ تھا اور اس کی چھت بھی بہت
 اونچی تھی۔ یہ غار نہیں تھا بلکہ ٹیلے کے اندر قدرتی طور پر بنے ہوئے اور ساتھ ساتھ
 جڑے ہوئے دو دالان تھے جن کو چٹائی ستونوں نے الگ کیا ہوا تھا۔ ہم نے اپنی اپنی
 گھڑیوں پر وقت دیکھا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ کھانا اور چائے ہم شیر خان کے
 مکان پر ہی کھاپی کر آئے تھے۔ طاق میں موم بج رہی تھی۔

ہے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“

اس کے بعد ہم ایک آدھ منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ پھر ہمیں نیند آگئی۔ جس وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ موم بجی جل جلا کر موم بن چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر نئی موم بجی روشن کی۔ کمانڈو خالد گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے وقت دیکھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم کافی دیر تک سوئے تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کو جگانا چاہا۔ پھر میں نے اسے نہ جگایا اور غار سے باہر نکل آیا۔ باہر دن کی روشنی تھی مگر دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کمانڈو خالد نے مجھے بتا دیا تھا کہ نیلے کے پیچھے ایک جگہ ندی بہتی ہے۔ میں نیلے کے پیچھے آگیا۔ یہاں خشب میں ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی تھی جس کا پانی کدلا کدلا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی کو چکھا تو وہ کدوا تھا۔ یہ سمندر کا پانی تھا اور کسی کھاڑی سے ندی کی شکل میں نکل کر ان نیلوں میں بہہ رہا تھا۔

میں واپس غار میں آگیا۔ خالد جاگ چکا تھا۔ اس نے بھی ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس آگیا۔ ہم نے رات کی کچھڑی تھوڑی سی کھائی۔ چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی مگر چائے کا قہرس ہم جلدی میں ساتھ لانا بھول گئے تھے۔ شام تک ہم غار کے اندر ہی کبھی سو کر اور کبھی باتیں کر کے وقت گزار دیا۔ اندھیرا ہوتے ہی شیر خان ہمارے لیے کھانا لے کر آگیا۔ اس کے تیلے میں ایک اور قہرس تھی۔ کئے لگے۔

”میں تمہارے لیے چائے بھی لایا ہوں۔“

ہم بڑے خوش ہوئے۔ کھانا کھاتے ہوئے خالد نے شہر کے حالات پوچھے۔ شیر خان بولا۔

”دور کا کاشمیری چھوٹی بن گیا ہے۔ ہر طرف فوج کے سپاہی اور گاڑیاں پھر رہی ہیں۔ کئی لوگوں کو فوج شک کی بنا پر پکڑ کر لے گئی ہے۔ شہر کے تین حصوں کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ میرا خیال ہے کل ہمارے علاقے کے مکانوں کی فوج تلاشی لے گی۔“

کمانڈو خالد نے ایک دم گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”کرم دوا! تم جو یہ سانپ سے انسان اور انسان سے سانپ بننے کی مشکل میں پھنس گئے ہو تو اللہ نے چاہا کہ بہت جلد تمہیں اس سے نجات مل جائے گی۔ لیکن میرے دوست تمہیں اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ تم پر سانپ کے ڈسنے کا بالکل اثر نہیں ہوتا یہ بہت بڑی بات ہے۔“

میں نے کہا۔

”ہاں خالد بھائی مجھے خود یقین نہیں آ رہا۔ جب پہلی بار مجھے شیر خان کے مکان کے باہر چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ایک مادہ سانپ نے ڈسا تھا تو میں واقعی گھبرا گیا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ سانپ کا زہر بے اثر ہو گیا ہے تو پھر اچانک میرے ذہن میں یہ پلان آیا کہ اگر میں اس مادہ سانپ کے زکوہی کسی طرح پکڑ لوں تو یہ ہمارے کمانڈو مشن میں بڑا اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”اور ان سانپوں نے ہمارے کمانڈو ایکشن کو ہمارے لیے واقعی آسان بنا دیا تھا ورنہ بڑی ہیڑو گن کے اندر جو گارڈ موجود تھے وہ مسلح تھے اور پوری طرح ہوشیار تھے۔ ہم اگر اپنے پستولوں سے ایک ایک کو الگ الگ نشانہ بناتے اور ہمارا نشانہ بھی ٹھیک ٹارگٹ پر بیٹھا پھر بھی اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ تیرا سپاہی فائر کر کے دوسرے فوجیوں کو خبردار کر دے اور کچھ نہیں تو اندھا دھند فائرنگ ہی شروع کر سکتا تھا جس سے ہمارے مشن کی کامیابی ناممکن ہو جاتی۔“

میں نے چٹائی پر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

”ابھی تک تو مجھ پر سانپ کا دورہ پڑنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ آگے اللہ مالک

ہے۔“

کمانڈو خالد بھی ایک طرف ہو کر لیٹ گیا اور بولا۔

”انشاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ نے تمہیں اس بیماری سے شفا عطا کر دی

اچانک ہمیں گھر گھر کی آواز سنائی دی۔ میں بولتے بولتے رک گیا۔ میں نے کمانڈو خالد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

”یہ کیسی آواز ہے؟“

آواز غار کے باہر سے آ رہی تھی۔ آواز رک گئی۔ میں نے کہا۔

”یہ فوجی ٹرک کی آواز تھی۔“

کمانڈو خالد جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جلدی سے یہ ساری چیزیں سمیٹ کر کسی دوسری جگہ چھپا دو۔“

ہم نے جلدی جلدی برتن قہرس اور چٹائی، موم بتیوں کا پیکٹ وہاں سے اٹھایا اور غار کے دوسرے دالان میں لے جا کر ایک ستون کے پیچھے چھپا دیا۔ اس کے بعد اپنے اپنے پستول نکال لیے۔ موم بتی بجھا دی اور غار کی دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر اس مقام پر آ گئے جہاں غار کا دہانہ تھا اور جس کے آگے سمندری سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹایا اور سامنے کی جانب نگاہ ڈالی۔ وہاں ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔ اچانک گھر گھر کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

میں آری کا کمانڈو تھا فوراً پہچان گیا کہ یہ بڑے فوجی ٹرک کے انجن کی آواز ہے جسے شارٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں نے خالد کو اشارہ کیا اور ہم غار کے منہ سے نکل کر دائیں جانب ٹیلے کی تھوڑی سی چڑھائی کے اوپر آ کر اندھیرے میں بیٹھ گئے اور دیکھا کہ ٹیلے سے کچھ فاصلے پر جہاں کچی سڑک تھی اور ٹیلے کے دائیں بائیں اور عقب میں بھی فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ گاڑیوں کی لائٹیں روشن تھیں اور فوجیوں کے اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

”فوج ان ٹیلوں کی تلاش لینے آئی ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ندی کی طرف سے ایک فوجی ٹرک پتھروں پر اچھلتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ہم نے نیچے چھلانگیں لگا

میری دکان پر تو گورکھا فوجی آ گئے تھے۔ چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے پھر دکان کی پوری تلاش لی۔ مجھ سے پوچھ گچھ بھی کی۔ میں گجراتی ہی بولتا رہا۔ میں نے اپنے آپ کو ہندو ہی ظاہر کیا۔ تم لوگ بتاؤ۔ ادھر تو کوئی نہیں آیا؟“

”نہیں ابھی تک تو یہاں خیریت ہے۔“

شیر خان بولا۔

”میں آتی دفعہ اس سڑک پر سے ہوتا ہوا آیا ہوں جو دوار کا سے آگے کاٹھیاواڑ کو جاتی ہے۔ ادھر بھی فوج گشت کر رہی تھی۔ تم لوگ ابھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکو گے۔ لیکن یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔“

جب شیر خان چلا گیا تو کمانڈو خالد کہنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے کہ فوج نے مارے مارے شر کو اپنے محاصرے میں لے رکھا ہے اور ہم بڑی سڑک کی جانب سے بھی کاٹھیاواڑ کی طرف فرار نہیں ہو سکیں گے۔“

میں غار میں بیٹھے بیٹھے ایک ہی دن میں ننگ آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔

”خالد بھائی۔ شیر خان ہمیں کچھ زیادہ ہی ڈرا رہا ہے۔ وہ بہت زیادہ مبالغے سے کام لے رہا ہے۔ اندھین آری کی رہنمائی شہر میں ضرور آگئی ہیں اور انہیں آنا بھی چاہیے تھا۔ دوار کا میں ہمارتی حکومت کو جو شدید نقصان پہنچا ہے اس کا تقاضا بھی یہی تھا لیکن اس کے باوجود ہم تربیت یافتہ کمانڈو ہیں۔ ہمیں فرار کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔“

کمانڈو خالد پہلے تو خاموش رہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”شیر خان نے جو کچھ بتایا ہے وہ سو فیصد درست ہوگا۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔“

طاق میں موم بتی روشن تھی۔ غار کے اندر بھی خاموشی تھی اور باہر سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہم قہرس میں سے تھوڑی تھوڑی چائے پیالیوں میں ڈال کر پی رہے تھے۔ کل سارا دن بھی ہمیں یہی چاہئے پڑی تھی۔ میں کوئی بات کرنے لگا تھا کہ

ہم اندھیرے میں پتھروں کے پیچھے چھپ کر بیٹھے تھے۔ بلیسروں والے پتھروں ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ کھن باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندھیرے میں غار کے پہلے کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم اندر بھی محفوظ نہیں تھے اور باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ نہ جانے اسی طرح کتنا وقت گزر گیا۔ ٹیلے کے اوپر فوجی سپاہیوں کے چلنے بھرنے کی آوازیں اب نہیں آ رہی تھیں۔ باہر کی آوازیں بھی کچھ رک گئی تھیں۔ میں نے خالد سے کہا۔

”میرا خیال ہے فوجی یونٹ چلے گئے ہیں۔“

”چل کر دیکھتے ہیں۔“

ہم غار کے سرکنڈوں میں آ گئے۔ سرکنڈوں میں اندھیرا نہیں تھا۔ ان پر دوسری جانب سے روشنی پڑ رہی تھی۔ ہم نے بڑی احتیاط سے سرکنڈوں کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا کہ ہم سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر جو ٹرک کھڑا تھا وہ اسی طرح کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دو اور فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ گاڑیوں کے اوپر عارضی بلب لگا کر انہیں روشن کر دیا گیا تھا۔ اس روشنی میں ہمیں پندرہ بیس فوجی سپاہی ادھر ادھر چلنے پھرتے دکھائی دیے۔ ہم وہیں بے لاشے اور دبے پاؤں غار میں آ کر واپس پتھروں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

خالد بولا۔

”ان فوجیوں نے تو یہاں چھانڈی ڈال لی ہے۔“

میں نے کہا۔

”جب تک وہ اس سارے علاقے کا سروے نہیں کر لیتے واپس نہیں جائیں گے۔“

خالد نے کہا۔

”یہ پہاڑی ٹیلے تو کئی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔“

”فوج کے آگے دوری نزدیکی کچھ نہیں ہوتی۔ ہمیں لا محالہ اسی جگہ چھپے رہنا

ہیں اور غار کے آگے سرکنڈوں میں چھپ کر ٹرک کی روشنیوں کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک کے بعد ایک دو روشنی کے راؤنڈ فلز ہوئے۔ روشنی کے یہ گولے پیراشوٹوں والے تھے جو اوپر جا کر روشن ہو جاتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے آتے ہیں۔ سارے علاقے میں جیسے دن چڑھ گیا۔ ہر طرف ٹیلوں میں روشنی ہو گئی۔ اس روشنی میں ہمیں غار والے ٹیلوں کے سامنے کتنی ہی فوجی گاڑیاں نظر آئیں جن میں سے آری کے جوان کود رہے تھے۔ جو ٹرک ہماری طرف آ رہا تھا وہ ہمارے ٹیلے کے قریب آ کر رک گیا۔ میں نے خالد کا بازو کھینچ کر کہا۔

”اندر آ جاؤ۔“

اور ہم دوڑ کر غار میں واپس آ گئے اور اندھیرے میں ہی جلدی جلدی دیواروں اور ستونوں کو ٹٹول ٹٹول کر غار کے آخری سرے پر جو پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے ان کے پیچھے چھپ گئے۔ خالد نے کہا۔

”اگر فوجی اندر آ گئے تو ان کے پاس ٹارچیں ہوں گی وہ ہمیں تلاش کر لیں گے۔“

میں نے کہا۔

”ہم باہر بھی نہیں جاسکتے کمائڈر۔ اس غار میں چھپنے کی یہی ایک جگہ ہے۔ اب سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

باہر سے فوجی گاڑیوں کے رکنے اور فوجی سپاہیوں کے بولنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ پھر ایسے لگا جیسے فوجی ٹیلوں پر چل پھر رہے ہیں۔ وہ دھماکہ کرنے والے مجاہدین کو ان ٹیلوں میں تلاش کرنے آئے تھے۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ شیرخان مبالغہ نہیں کر رہا تھا۔ انڈین آرمی دوار کا شہر اور اس کے آس پاس کے سارے علاقے کی چھان بین کر رہی تھی۔ اتنی بڑی اور قیمتی لیزر گن کی جہاز کوئی معمولی نقصان نہیں تھا۔ یہ آری ہائی کمائڈ اور انڈین بحریہ کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ تھا۔ چنانچہ

بات تھی کہ ابھی تک انہیں اس غار کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔
 ”اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ گور کھا اور جٹ فوجی یونٹیں ہیں۔ ان پہاڑی
 علاقوں کے خفیہ و فراز سے مذاقات ہیں۔“

جب ہماری گزروں پر شام کے سات بج گئے تو ہماری تشویش میں اضافہ ہونے
 لگا۔ کیونکہ شیرخان کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید اس طرف
 روشنی میں فوجی ٹکڑوں اور فوجی یونٹ کی نقل و حرکت کو دیکھ کر وہ واپس چلا جائے۔
 کچھ نہیں کہا جا سکا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ہم نے رات کا بچا ہوا کھانا کھا کر
 اور تھوڑا پانی پی کر گزارا کر لیا تھا۔ ہم نے پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ کر ہی سارا
 دن نکل دیا تھا۔ جب رات کے دس بج کر پانچ منٹ ہوئے تو ہمیں غار میں کسی کے
 قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اندھیرا تھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے پتھروں
 سیدھے کر کے پوزیشن لی۔ یہی سوچا کہ اگر بھارتی فوجی ہوں گے تو آخری گولی
 تک مقابلہ کریں گے پھر مجھے خیال آیا کہ اگر یہ بھارتی سپاہی ہوتے تو ضرور نارنج
 روشن کرتے۔ اتنے میں کسی نے آہستہ سے میرا نام لے کر آواز دی۔

یہ آواز شیرخان کی تھی۔ کمناؤ خالد نے دھیمی آواز میں کہا۔
 ”شیرخان ہو؟“

”ہاں۔ تم لوگ کدھر ہو؟“

”دوبار کے ساتھ بالکل سیدھے میں آ جاؤ۔“

شیرخان ٹوٹل ٹوٹل کر ہمارے پاس آ گیا۔ اس کا سامں پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔
 ”خدا کا شکر ہے تم مل گئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کو فوج نے گرفتار کر لیا
 ہو گا۔ باہر تو ہر طرف فوج ہی فوج ہے۔“

میں نے کہا۔

”یہ بتاؤ کہ میں سے نکلنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔“

شیرخان بولا۔

اس طرح ساری رات گزر گئی۔ رات کے چار بج گئے۔ اس دوران کبھی تھوڑی
 دیر کے لیے میں آنکھ چمپک لیتا اور کبھی کمناؤ خالد آنکھ چمپک لیتا تھا۔ جب دن کے
 پانچ بج گئے تو خالد نے کہا۔
 ”باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔ میرا خیال ہے فوجی چلے گئے ہیں۔ آؤ چل کر
 دیکھتے ہیں۔“

غار میں اندھیرا تھا مگر رات والی تاریکی نہیں تھی۔ غار کے دہانے کی جانب سے
 دن کی بہت ہی کمزور سی چمپکی چمپکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم نے سر کندوں کو ہٹا کر
 دیکھا کہ دن نکل آیا تھا مگر سارے علاقے میں فوجی گاڑیاں اسی طرح کھڑی تھیں۔ ایک
 طرف دو چار فوجی ٹیپ بھی لگے ہوئے تھے اور دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ
 سے کہا۔

”میں فوج نے ٹیپ لگا رکھا ہے۔ لنگر پر چائے ناشتہ تیار ہو رہا ہے۔“

رات والا فوجی ٹکڑے پر ستور غار سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ہم واپس غار کے
 اندر آ گئے۔ خالد کہنے لگا۔

”میں سے نکلنا تو خطرے والی بات ہے۔ یہ سارا علاقہ فوج کی زد میں ہے۔ ہم
 فوراً پکڑ لیے جائیں گے۔“

اتنے میں ٹیلے کے اوپر ایک بار پھر فوجیوں کے چلتے پھرنے کی آوازیں سنائی دینے
 لگیں۔ خالد غار کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں سوچتا ہوں شیرخان رات کو آنے والا ہے، کہیں وہ پکڑا نہ جائے۔“

خالد کی یہ تشویش حق بجانب تھی۔ کیونکہ اگر فوج نے واقعی اس سارے علاقے
 کو گھیرے میں لے لیا تھا تو پھر ادھر سے کوئی بھی سولین گزرتا ہوا پکڑا جا سکتا تھا۔ یہ
 میں اور خالد ہی جانتے ہیں کہ ہم نے سارا دن اس غار میں کیسے گزارا۔ ہر وقت دھڑکا
 لگا تھا کہ ابھی کوئی فوجی دستہ اندر آ کر ہمیں پکڑ لے گا۔ حیرانی کی اور خوش قسمتی کی

”اب وہ ہمارے علاقے میں نہیں آئیں گے۔ تم لوگ اطمینان سے وہاں چھپ سکتے ہو۔ جب فوج شرے سے نکل چائے گی تو یہاں سے بھوپال کی طرف چلے جائیں۔“

شیر خان کی یہ دلیل وزنی تھی کیونکہ فوج جس علاقے کی ایک بار تلاشی لے لیتی ہے دوبارہ اس طرف نہیں جاتی۔ شیر خان ہمیں اپنے مکان میں لے آیا۔ اندھیرے میں اس کا مکان بھوت کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے ڈر کے مارے باہر کا بلب بھی روشن نہیں کیا تھا۔ بیٹھک میں آکر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شیر خان نے بیٹھک کی بتی روشن کرنے کی بجائے صرف موم بتی روشن کر دی اور کہا۔

”اوپنی آواز میں بات بھی نہ کرنا۔ احتیاط لازمی ہے۔ میں تمہارے لیے کھانے کو لاتا ہوں۔ وہ کھانے کا تھیلا تو ان پہاڑیوں میں ہی رہ گیا ہے۔“

وہ ہمارے لیے تھوڑے سے نیچے ہوئے پہاڑ اور چائے لے آیا۔ ہم نے چاولوں پر چینی ڈال کر انیس کھایا۔ پھر چائے پی تو جسم کو کچھ سکون نصیب ہوا۔ ہم وہیں چٹائی پر لیٹ گئے۔ اپنے اپنے پتوں اور کمانڈو چاقو ہم نے چٹائی کے نیچے چھپا دیے تھے۔ کافی دیر تک ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے پھر موم بتی بجھا کر سو گئے۔ میں گہری نیند میں تھا کہ کسی نے میرے بازو کو زور زور سے ہلایا۔

”جلدی اٹھو۔“

یہ شیر خان تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کمانڈو خالد کو بھی جگا دیا۔ وہ بھی ہڑبوا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کیا ہوا شیر خان؟“

شیر خان بند کھڑکی کی درز میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ خوف سے خشک آواز میں بولا۔

”مارے گئے خالد بھائی۔ فوجی ہمارے مکان کی طرف آرہے ہیں۔“

ہم اٹھ کر جلدی سے کھڑکی کے پاس آ گئے۔ کھڑکی کی درز میں سے میں نے باہر دیکھا کہ دو روشنی میں شیر خان کے مکان کے بالکل سامنے ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا اور چھ سات گوردھ فوجی شین گئیں سیدھی کیے بالکل اٹیک کرنے کی پوزیشن میں شیر خان

”میں تمہیں یہاں سے نکلنے ہی آیا ہوں۔ کھانا ساتھ لایا تھا مگر فوجی گاڑیوں کو دیکھ کر میں نے تھیلا ایک جگہ چھپا دیا اور خود خفیہ راستے سے ریگتا ہوا غار تک پہنچا ہوں۔“

خالد نے پوچھا۔

”کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہے؟“

شیر خان نے آہستہ سے کہا۔

”ایک راستہ ہے۔ میرے پیچھے چلے آؤ۔ جلدی کرو۔“

ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے غار کے دہانے سے باہر نکل گئے۔ باہر نکلنے ہی ہم زمین پر شیر خان کی ہدایت کے مطابق اونٹن سے لیٹ گئے اور ٹیلے کے پہلو والی دیوار کے ساتھ ساتھ ریگتے لگے۔ خدا جانے ہم کہاں تک ریگتے چلے گئے تھے۔ شیر خان آگے آگے ریگ رہا تھا۔ ہماری کھینیاں پتھروں پر ریگنے کی وجہ سے چھل گئی تھیں۔ کوئی گہرائی آجاتی تو ہم بیٹھ کر آگے بڑھنے لگتے۔ زمین اونچی ہو جاتی تو پھر ریگتا شروع کر دیتے۔ اسی طرح سے ہم نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔ تب شیر خان نے کہا۔

”اب ہم خطرے سے باہر ہو گئے ہیں۔ اٹھ کر چل سکتے ہیں۔“

ہم کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ شیر خان ہمیں پہاڑیوں کا ایک لمبا پتھر کاٹ کر لایا تھا۔ ہم دیران علاقے سے گزر رہے تھے جہاں سوائے کھمبے ہوئے پتھروں اور سوکھی جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دور سے رات کے اندھیرے میں روشنیوں نظر آنے لگیں۔ شیر خان نے کہا۔

”ہم مکان کے قریب آ گئے ہیں۔“

خالد نے کہا۔

”تمہارے مکان میں بھی خطرہ ہو گا۔ شیر خان ہمیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔“

تب شیر خان نے بتایا کہ آج صبح اس کے مکان پر فوجی آئے تھے اور اس کے مکان کی اور علاقے کے دوسرے مکانوں کی تلاشی لے کر چلے گئے تھے۔

کے مکان کی طرف دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا اس کے سنسنی خیز واقعات آپ ”بت شکن مجاہد“

کے حصہ چہارم

میں پڑھیے



Famous Urdu Novels

Free pdf Library

